میں نے کیا دیکھا؟
آپ بیتی
حاجی محبت علی
شفیلڈ۔ یو کے
INDIAN OCEAN
INDONESIA
AUSTRALIA

میں نے کیا دیکھا؟

آپ بیتی حاجی محبت علی

شفیلڈ یو کے

ناشر---------------------------محبت علی

تعداد---------------------------500

قیمت---------------------------£10.00

محبت علی اپنی پوتی کے بیٹے ایان عادل کے ساتھ

فہرست

پیش لفظ

(مولانا) محمد موسیٰ شاکر غفر اللہ لہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ:

آج سے اکیس سال قبل جب میں نے اپنے محسن حاجی عدالت خان صاحب آف پرسٹن کی دعوت پر انگلینڈ کی سرزمین پر قدم رکھا تو مانچسٹر ائیر پورٹ پر حاجی عدالت خان صاحب اور ان کی اہلیہ کے ساتھ ساتھ حاجی بوستان صاحب اور حاجی محبت علی صاحب بھی موجود تھے، اور اس طرح حاجی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی انہیں کی گاڑی میں شفیلڈ آنا ہوا اور مکی مسجد میں ان کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا، اور انہوں نے مجھ سے پڑھا بھی۔ حاجی صاحب نفیس طبیعت کے مالک انسان ہیں، اللہ ربّ العزت نے بے پناہ خوبیوں سے نوازا ہے، ملنسار، خوش اخلاق، اور دنیا داری کے ساتھ دینداری کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔

جس طرح آپ اس کتاب میں مطالعہ فرمائیں گے کہ حاجی صاحب نے انگلینڈ میں آنے کے بعد فیکٹری کی ملازمت اور ٹیکسی کی جاب کرنے کے بعد جب بزنس کی فیلڈ میں قدم رکھا تو اپنی اور اپنے صاحبزادوں امجد علی اور ماجد علی کی محنت کے بل بوتے اپنے بزنس کو خوب پھیلایا اور ایک کامیاب بزنس مین کے طور پر اپنا نام کمایا۔ ساتھ ہی ساتھ دینی، سماجی اور رفاہی کاموں میں بھی حاجی بوستان صاحب کے ساتھ مل کر بھرپور حصّہ لیتے رہے، اس طرح شفیلڈ کی مسلم کمیونٹی کے لئے آپ کی بھرپور خدمات ہیں۔

حاجی صاحب نے جب اپنا بزنس اپنے صاحبزادوں کے حوالہ کیا تو انہوں نے

اپنی سوانح اورآپ بیتی لکھنے کا ارادہ کیا، جس کے لئے ڈائیری کی شکل میں مواداُن کے پاس پہلے سے موجود تھا، اس لئے کہ ان کی شروع ہی سے ڈائیری لکھنے کی عادت تھی، جس کی وجہ سے بہت ساری معلومات درست طریقے سے محفوظ رہیں، انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے، ہر بات ذہن میں محفوظ نہیں رہتی بہت کچھ بھول جاتا ہے، لیکن جو چیز تحریر کے اندر آجائے تو وہ محفوظ ہوجاتی ہے، ان کا یہ عمل بھی نوجوان نسل کے لئے ایک عمدہ مثال ہے کہ اپنے روزمرّہ کے معمولات کو ڈائیری کی شکل میں محفوظ کرلیا جائے، حاجی صاحب کے مختلف ممالک کے سفروں میں یہ بات آپ کو نظر آئے گی کہ وہاں جن جن افراد سے ان کی ملاقاتیں رہیں ان کے نام تک محفوظ ہیں۔

حاجی صاحب نے اپنی آپ بیتی، سادگی اور بے ساختگی، جذبات واحساسات کی ترجمانی، واقعات ومناظر کی سادہ تصویر کشی، کہیں غلطیوں اور کوتاہیوں کا اظہار واقرار، بھولی ہوئی یادیں تازہ کرنے، مٹے ہوئے نقوش اجاگر کرنے، خود اپنی مسرّت، حسرت، عبرت افراد خاندان اور نیاز مندوں کو اپنے سے واقف کرنے اور اپنی زندگی کی داستان سنانے کے لئے لکھی ہے۔ ایک سلیم الفطرت انسان میں کبھی کبھی یہ جذبہ خود پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں اور چھوٹوں کو اپنی زندگی کے واردات، حوادث اور تجربے خود سنائے، اب یہ اپنا اپنا سلیقہ سنانے والے کی توفیق اور سننے والے کی قسمت ہے کہ یہ داستان اپنی صداقت اور دیانت کے ساتھ بامزا، سبق آموز اور مفید ہو۔

حاجی صاحب کے قلم نے گزرے ہوئے زمانہ کے مناظر کو آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کردیا ہے، اپنے بچپن، سکول کے داخلے، جوانی، زمین داری، سفروں کے تاثرات اور مشاہدات، بڑی تفصیل اور دل چسپی کے ساتھ قلم بند کئے ہیں، اپنے قریبوں، دوستوں اور مخالفین، ناقدین سب کا ذکر فراخ دلی اور صاف گوئی کے ساتھ کیا ہے اور کسی کی رو

ورعایت نہیں کی ،اس کتاب کے بعض جملے سادگی اور پُرکاری کا نمونہ ہیں ۔غرض یہ کتاب ان کی زندگی کا مرقع ہے جس سے قارئین بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔

حاجی صاحب نے کتاب لکھنے کا جب ارادہ کیا تو اس کا ذکر مجھ سے کیا اور ساتھ ہی اس کی تیاری میں معاونت کی خواہش کا اظہار کیا۔ اگر چہ میں خود اپنی کتابوں البدعۃ ، السنّۃ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور سوانح حیات حکیم ملّت حضرت مولانا عبدالحکیمؒ کے بعد تصوّف کے اندر سلاسل اربعہ میں ذکر کا طریقہ شروع کر چکا تھا اور اس کے پچاس صفحات لکھ چکا تھا مگر میں نے اُسے موقوف کر کے حاجی صاحب کی کتاب کی تیاری میں مدد دینے کو ترجیح دی، اور اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق اس کتاب کی تیاری تحریر کی شستگی، ہیڈنگ ،سب ہیڈنگ ،عنوانات ،ترتیب اور کمپوزنگ میں جو معاونت میں فراہم کر سکا اسے میں اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں ۔دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ حاجی صاحب کی اس کتاب کو نافع اور مقبولیت عامہ عطا فرمائے۔آمین

محتاجِ دعاء

(مولانا) محمد موسیٰ شاکر غفراللہ لہ

شفیلڈ یو کے

21 اکتوبر 2021ء

اظہار تشکّر

میرے دل میں کافی عرصہ سے یہ خیال آتا تھا کہ میں کس طرح اپنے خیالات لوگوں تک پہنچاؤں اس لئے کہ بعض چیزیں میری نظر میں حقیقت اور تاریخ کے قریب نہ ہونے کے باوجود دنیا میں مشہور ہو گئی تھیں اور میں چاہتے ہوئے بھی لوگوں کو نہیں بتا سکتا تھا۔ پھر میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں ایک کتاب لکھ کر حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کروں ۔ میں نے اپنا یہ خیال جب اپنے دوستوں کے ساتھ شیئر کیا تو زیادہ تر لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ یہ بڑے پڑھے لکھے لوگوں کا کام ہے تم جیسے آدمی کا کام نہیں ہے۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ روز قیامت ہر آدمی کو اپنا حساب دینا ہوگا صرف علماء یا ڈگری ہولڈر کو نہیں ۔ پھر میں نے سوچا کہ کس طرح میں یہ کام نہیں کر سکتا جبکہ گذشتہ ادوار میں باوجود سکول، کالج اور یونیورسٹیاں نہ ہونے کے لوگ کام کرتے رہے ہیں ۔ اور جس چیز پر انسان کی جان، مال اور ٹائم لگتا ہے اسے اُس میں کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے ۔ اس لئے میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔

بھائی رضوان اللہ اور مولانا ارشاد صاحب رادھرم والوں نے بھی میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے پاس جب کافی مواد جمع ہو گیا تو میں نے پڑھے لکھے لوگوں سے مدد کی درخواست کی مگر اکثریت نے انکار کیا اور بعض نے تو مذاق بھی اڑایا۔ مگر میں نے اپنی جدو جہد جاری رکھی، اور مجھے اپنے موبائیل میں ایک نام مولانا عمران الحق صاحب کا نظر آیا، میں نے انہیں فون کیا اور پوچھا کہ برائے مہربانی آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ حاجی صاحب کیوں مذاق کرتے ہیں میں قاری تصورالحق صاحب کا

بھائی ہوں میں نے معذرت کی کہ میرے ذہن میں نہیں رہا اور پھر میں نے ان سے وقت لے کر بر منگھم ان کے پاس گیا اور ان کے سامنے اپنا مدعا رکھا اور اپنا لکھا ہوا مواد ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے دیکھنے کے بعد مدد کرنے کی حامی بھری اور کہا کہ جو مواد آپ ساتھ لائے ہیں اس کو میرے پاس چھوڑ دیں میں اسے ٹھیک کر دوں گا، آپ لکھتے رہیں میں ٹھیک کرتا رہوں گا۔ اس طرح ہم ہر مہینے ملتے رہے اور میں اپنا لکھا ہوا ان کو دیتا اور وہ اسے ٹھیک کر کے مجھے دیتے رہے اور یوں سالوں کا کام ہفتوں میں ہونا شروع ہو گیا۔

مولانا عمران الحق صاحب نے مجھے بڑے بھائی کا رتبہ دیا ہے میں ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ قاری تصور الحق میرے چھوٹے بھائی کی طرح تھے، ان کا پورا خاندان میری عزت کرتا ہے۔ قاری عمران الحق نے میری مشکل حل کر دی، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ آگے چل کر قاری تصور الحق صاحب کی طرح پاکستانی لوگوں کی خدمت کے لئے قائدانہ کردار ادا کریں گے۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ جو مجھے درپیش تھا وہ یہ تھا کہ اب اس مواد کو کتابی شکل کس طرح دوں؟ اللہ تعالیٰ نے یہ مرحلہ بھی میرے لئے اس طرح آسان کر دیا کہ مجھے کچھ کرنا ہی نہیں پڑا، کیونکہ میں نے ایک دفعہ مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب سے ذکر کیا تھا کہ میں کتاب لکھ رہا ہوں۔ پھر وہ پاکستان چلے گئے اور پاکستان سے واپسی پر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی کتاب کا کیا بنا؟ میں نے بتایا کہ مولانا عمران الحق صاحب نے یہ کام کر دیا ہے۔ اب اس کو کتابی شکل دینی ہے اور کمپوزنگ کرنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ اپنے کاغذات مجھے دے دیں۔ میرے پاس جو مواد تھا میں نے ان کو دے دیا، اور انہوں نے کمپیوٹر پر لکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح جو کاغذات آتے میں انہیں دیتا جاتا تھا اور وہ کمپیوٹر پر لکھتے جاتے تھے۔ پھر ایک دن مولانا صاحب نے میری کتاب کا تعارف وٹس اپ پر

ڈال دیا جس سے مذاق اڑانے والے کافی دوستوں کو بھی تسلی ہوگئی کہ واقعی کتاب تیار ہو رہی ہے۔ کتاب کی ترتیب اور کمپوزنگ کے بعد مولانا صاحب نے اُسے "PDF" میں تبدیل کر کے مجھے بھیج دیا، میں اس پر مولانا کا بے حد مشکور ہوں۔

میں نے تبصرہ اور کچھ لکھنے کے لئے جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب، لارڈ نذیر احمد صاحب، ڈاکٹر شاہ نواز صاحب، مولانا عمران الحق صاحب، مرتضیٰ اعوان صاحب اور مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب سے درخواست کی۔ ان سب حضرات کے تبصرے کے بعد کافی لوگ مطمئن ہو گئے ہیں۔

اب میں نے سب دوستوں سے کہا ہے کہ یہ کتاب آپ کو مفت نہیں ملے گی جس پر وہ پریشان ہو گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب تو لوگوں نے کتابیں پڑھنی ہی چھوڑ دی ہیں تمہاری کتاب کون پڑھے گا، مگر مجھے اللہ کی ذات پر پورا یقین ہے کہ وہ مجھے میری محنت کا صلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔ میں ان دونوں حضرات کا شکریہ کس طرح ادا کر سکتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں میری مدد کی۔ میری دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے خزانۂ غیب سے نوازے۔ آمین

حاجی محبت علی

تبصرہ: لارڈ نذیر احمد صاحب

میرے لئے یہ اعزاز کی بات ہے کہ حاجی محبت صاحب نے مجھے سرورق لکھنے کے لئے چنا، کلیال سے ہونے کی وجہ سے میں حاجی صاحب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں، لیکن میری پہلی ملاقات اُن سے تب ہوئی جب انہوں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا تھا۔ یہ بہت سال پہلے کی بات ہے مجھے یہ تو معلوم تھا کہ حاجی صاحب ایک کامیاب بزنس مین اور دل کے اچھے انسان ہیں، لیکن ان کی کتاب نویسی کی صلاحیت کے بارے میں مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کتاب پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ ڈائری لکھنے کا شوق رکھتے ہیں جو کہ بہت اچھی بات ہے۔ کتاب میں انہوں نے اپنی جوانی کے ایام اور جو محنت انہوں نے اس مقام پر پہنچنے کے لئے کی وہ بہت تفصیل سے لکھی گئی ہے، جو نوجوان نسل کے لئے مشعل راہ ہے۔ حاجی محبت صاحب ایک بڑے منجھے ہوئے لکھاری تو نہیں ہیں، لیکن پھر بھی اس مشکل کام کو بخوبی انجام دیا ہے۔ حاجی صاحب نے اپنی کتاب میں جو یہ ذکر کیا ہے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی یہاں نمایندگی کرنے کے بجائے یہاں کے رہنے والوں کو یہاں کی سیاست میں حصہ لینا چاہیۓ میں اُن کی اس رائے کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں، یہاں کے باسیوں کو پاکستانی سیاسی جماعتوں کی نمایندگی کرنے کے بجائے یہاں کی پولیٹیکل پارٹیز میں شامل ہونا چاہیۓ یہاں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور پی، ٹی آئی کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس میں سوائے آپس کے اختلافات اور ریسورسز کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں۔ اور اسی طرح گورنمنٹ پاکستان کے بیرون ملک ووٹنگ کے حق دینے سے بھی یہاں پر اختلافات مزید بڑھیں گے۔ اس کے ساتھ اس بات کی بھی اکاؤنٹی بیلٹی

ہونی چاہئے کہ پچھلے تیس چالیس سالوں میں یہاں سے لوگ جو اربوں کے حساب سے پونڈ بھیجتے رہے ہیں وہ کہاں خرچ ہوئے ہیں؟ وہ کس طرح ضائع ہوئے ہیں؟ لوگوں کی پراپرٹیز پر قبضے کیوں کرائے گئے ہیں؟

کتاب میں تاریخی حقائق ہیں اور ساتھ میں حاجی صاحب کے دیکھنے کا اپنا زاویہ اس زاویئے سے یقیناً لوگوں کو اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ میری دعاء ہے کہ اللہ حاجی صاحب کو اس امتحان میں کامیابی دے۔

میری بہت سی دعائیں۔

لارڈ نذیر احمد

تبصرہ: پروفیسر ڈاکٹر شاہنواز صاحب

یہ میرے لئے اعزاز کی بات ہے کہ میں اپنے ایک اچھے دوست کی سوانح عمری کے لئے پیش لفظ لکھوں۔ یہ کتاب نہ صرف قیمتی تجربات اور اسباق کا مجموعہ ہے بلکہ واقعات کا ریکارڈ بھی ہے، جسے آیندہ نسلوں کے لئے محفوظ رکھنا چاہیئے، مصنف نے اپنے وسیع تر تجربے کی بنیاد پر زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

عاجزانہ آغاز سے ہی اس کی کامیابیاں ناقابل یقین رہی ہیں۔ اچھے اور بااثر روابط کو جوڑتے ہوئے وہ کئی مذہبی، تعلیمی اور فلاحی تنظیموں کو قائم کرنے اور چلانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جن میں سے چند ایک نام یہ ہیں۔ پاکستان مسلم سنٹر، مکی مسجد و تعلیمی مرکز، جمعیت علماء برطانیہ اور آٹرکلف کا بزنس فیڈریشن ۔

حاجی محبت نے اپنے دم پر اپنا کاروبار قائم کیا اور بین الاقوامی سطح پر روابط قائم کئے، جو اب اُن کے بیٹے کے ہاتھوں میں پنپ رہا ہے۔ میں انہیں کئی سالوں سے جانتا ہوں اور ان کے ساتھ اندرون ملک اور بیرون ملک میں ایک ساتھ سفر کیا ہے اور انہیں ہمیشہ ایک انتہائی خوشگوار ساتھی، شائستہ، اور باوقار پایا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اس کتاب کے قصّے، زندگی کے قیمتی اسباق اور کچھ تاریخی واقعات کو پڑھنے میں اُتنا ہی لطف اندوز ہوں گے جتنا کہ میں ہوا ہوں۔

پروفیسر شاہنواز

MB CHB PGCERT MED MBA MD FRCS

(GS)FHEA SFE

تبصرہ: جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب

یہ صرف ایک فرد کی کہانی یا آپ بیتی نہیں بلکہ ایک دور ایک عہد کی سرگذشت ہے جس کو ایک ادنیٰ سے شخص نے کیا اعلیٰ ظرفی سے بیتایا ہے اور زمانے کے نشیب وفراز کی سختیوں سے کندن بن کر نکلا ہے۔

حضرات یہ کتاب میرے لئے اس لیے اہم ہے کہ اس کا مصنف کوئی مادرزاد ولی نہیں لیکن اس نے پھر بھی نیکی کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ کوئی پیدائشی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک نہیں تھا لیکن اس نے پھر بھی کارنامے سرانجام دیئے۔ حاجی محبت صاحب کی جو ادا مجھے سب سے زیادہ بھائی وہ ان کا پراعتماد ہونا ہے۔ وہ کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتے۔ انہیں یہ چیز بالکل مرعوب نہیں کرتی کہ وہ بہت پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹھے ہیں انہیں جو چیز حق سجھائی دیتی ہے وہ برملا اور بے خوف اس کا اظہار پورے اعتماد کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ انکی تصنیف عام انسان کے لیے اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے مجھ جیسے عام انسان کو کامیابی کا مژدہ جانفزا ملتا ہے کیونکہ اگر محبت صاحب ایک عام انسان ہو کر سرخرو ہو سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں۔ یہ پہلو مجھے یاس اور ڈپریشن سے نکال کر راہ عمل میں گامزن ہونے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور اس وقت ہمارے معاشرے کو اس کی بڑی اشد ضرورت ہے۔

حضرات ہمارے ہاں کا سب سے بڑا المیہ حقائق کا مسخ کرنا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں جان بوجھ کر جھوٹ بولا گیا فریڈم آف انفارمیشن جیسے بنیادی حق سے ہمیں محروم رکھا گیا۔ ہمیں تاریخ اور دینیات جیسے اہم مضامین بچپن سے جھوٹ کی آمیزش کے

ساتھ پڑھائے گئے۔حاجی صاحب نے چند مسخ شدہ حقائق کو درست کرنے کی جسارت کی ہے جو کہ قابل ستائش ہے۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

آخر میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ہم سب کو حق گوئی کی توفیق عطا فرمائے اور حاجی محبت صاحب کیلیئے یہ کتاب صدقہ جاریہ کا باعث بنے۔آمین ثم آمین

بس کر میاں محمد بخشا،موڑ قلم دا گھوڑا ساری عمر دکھ نئیں مکنے،ورقہ رہ گیا تھوڑا

خاکسار عبدالرحمٰن

درس نظامی۔جامعہ رضویہ سراج العلوم گوجرانوالہ

ڈاکٹر آف ویٹرنری میڈیسن۔جامعہ زرعیہ فیصل آباد

گریجوئیٹ ڈپلومہ ان لاء،ماسٹر آف لاء

PRESTON LPC, UCLAN

UNI OF LAW LEEDS, LLM

تبصرہ: مولانا عمران الحق صاحب

جنرل سیکرٹری جمیعت علماء برطانیہ

برطانیہ ایک کثیر النسلی ملک ہے جس میں ہر رنگ، نسل اور زبان کے لوگ آباد ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں اور ممالک سے بے شمار تارکین یہاں آکر آباد ہوئے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ان تارکین کی کثیر تعداد پاکستان اور کشمیری کمیونٹی پر مشتمل ہے۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں یہاں ہجرت کرنے والوں نے بڑے نا مساعد حالات کا سامنا کیا، اوران کی محنتوں اور کاوشوں کا پھل آج ہم کھا رہے ہیں۔ایسی ہی ایک نابغۂ روزگار شخصیت حاجی محبت علی آف شفیلڈ کی ہے۔جو شفیلڈ میں اپنی مذہبی، سیاسی، سماجی خدمات کے حوالے سے ایک ممتاز حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔حاجی محبت علی ایک جہد مسلسل کا نام ہے، جنہوں نے ایک فیکٹری ورکر اور ٹیکسی ڈرائیور سے ایک کامیاب بزنس مین کی حیثیت سے اپنا نام منوایا ہے۔

دوسری طرف مکی مسجد میں مذہبی اور سماجی خدمات کے ذریعے کمیونٹی کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔لیکن ان تمام خدمات سے بہت بڑھ کر وہ کارنامہ ہے جو آپ کی زیر نظر کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔یوں تو یہ کتاب حاجی محبت علی صاحب کی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کی یادداشتوں کو قارئین کی نظر کیا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ہر اس فرد کی داستان ہے جو 1960ء کے بعد آکر یہاں آباد ہوا، اور جن حالات سے ان کا سامنا ہوا، اس کتاب کے ایک ایک صفحے پر اس کا نقش ہے۔ حاجی صاحب نے اپنی اس کتاب میں اپنے بہت سے اسفار کا تذکرہ کیا ہے جو دنیا کے مختلف

ممالک میں ان کو درپیش آئے اور پھر بڑی خوبصورتی سے ایک گہرائی میں جا کر وہاں کے حالات وواقعات اور ماحول کا موازنہ اپنے آبائی وطن پاکستان سے کیا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے برطانیہ اور پاکستان کے تعلیمی، سیاسی، سماجی اور انتظامی معاملات کا موازنہ پیش کرنے کے بعد ناصرف پاکستان کے نظام کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے بلکہ اس کا حل بھی پیش کیا ہے۔ ایسا شخص جس کی روایتی تعلیم بہت زیادہ نہیں لیکن اتنی گہرائی میں جا کر واقعات کو بیان کرنا اور پھر اس کا تجزیہ کر کے اس کا حل پیش کرنا واقعی میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس بہترین کاوش پر میں حاجی محبت علی صاحب کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

حاجی محبت علی اور برادر محترم حضرت مولانا قاری تصور الحق مدنیؒ کا تعلق دوستی سے بڑھ کر بھائیوں والا تھا اور اسی رشتے کو نبھاتے ہوئے حاجی صاحب نے اس ناچیز کو اس قابل سمجھا کہ اس کتاب کی تیاری میں اپنی معاونت کے لئے منتخب کیا۔ اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق اس کتاب کی تیاری میں جو معاونت میں فراہم کر سکا اسے میں اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ حاجی صاحب کو صحت وتندرستی عطا فرمائے اور جو خدمات انہوں نے مسلم کمیونٹی کے لئے سرانجام دی ہیں اُس کا بہترین اجر اس دنیا اور آخرت میں ان کو عطا فرمائے۔ میں تمام قارئین سے ملتمس ہوں کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں، آپ کو بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔

(مولانا) عمران الحق

چیئرمین مسجد طیبہ اینڈ واش ووڈ ہیتھ مسلم سنٹر، جنرل سیکرٹری جمعیت علمائے برطانیہ

تبصرہ: جناب مرتضیٰ اعوان صاحب

میرا حاجی صاحب سے تعارف کچھ یوں ہوا کہ مسجد میں نماز کے بعد کچھ ساتھیوں نے مجھے کہا کہ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے، کیونکہ محبت صاحب نے مسجد پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میں اُس وقت CID میں تعینات تھا۔ میں نے ان بھائیوں کی بات تسلی سے سنی اور ان سے گزارش کی کہ میں حاجی صاحب کو نہیں جانتا لہٰذا آپ اُن کا ٹیلی فون نمبر مجھے دے دیں تاکہ میں ان کی بات بھی سُن سکوں۔ کچھ روز بعد میں نے حاجی صاحب کو ٹیلی فون کیا تو حاجی صاحب نے مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔

جب میں حاجی صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں حاجی صاحب اور حاجی ممتاز صاحب موجود تھے جن سے میرا پہلے بھی تعارف تھا کیونکہ وہ میرے گاؤں سے ہیں۔ کھانے کے دوران اندازہ ہوا کہ حاجی صاحب انتہائی نفیس، مخلص اور بے ضرر آدمی ہیں۔ قصہّ بیان کیا تو حاجی صاحب نے فرمایا کہ جو فیصلہ آپ مناسب سمجھیں کر دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اِس ملاقات کو تقریباً 30 سال بیت چکے ہیں، اور الحمدللہ آج بھی ہماری دوستی راہ ورسم قائم دائم ہیں۔

حاجی صاحب نے کمال کر دکھایا ہے کہ جو زندگی اللہ نے انہیں عطا کی ہے انہوں نے اس کے سفر میں بیتے روز وشب کو اور ان میں آنے والے افراد، حالات اور واقعات کو بڑی خوبصورتی سے قلم بند کر دیا ہے۔ حاجی صاحب نے آنے والی نسلوں کے لئے اپنے نقش پا چھوڑ دیئے ہیں جو کہ ماضی کی یاد تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ اور اگر آج ہم برطانیہ کے مختلف شہروں اور علاقوں میں آباد ہیں اور کھلے عام گھوم پھر سکتے ہیں تو یہ

حاجی صاحب اور ان کے ہم عمر بزرگوں کی قربانی کا نتیجہ ہے، مگر آج بھی نسل پرستی اور اسلاموفوبیا کے خلاف جدو جہد جاری ہے اور جاری رہے گی۔

ہمارے بھائی اور بزرگ حاجی صاحب نے اپنی داستانِ حیات بیان کردی ہے، اور اب ہمارے اوپر فرض ہے کہ ہم اُن کی یادوں اور آپ بیتی کو فراخ دلی سے پڑھیں۔

میں خود تاریخ کا طالب علم ہوں اور مجھے انتہائی خوشی ہے کہ یہ کتاب برطانیہ میں آنے والے ہمارے آباؤ اجداد کی مشکل اور کٹھن زندگی پہ مزید روشنی ڈالے گی۔

حاجی صاحب کا شکریہ

دعا گو ہوں کہ یہ کتاب حاجی صاحب کے لئے صدقہ جاریہ کا سبب بنے۔ آمین

مرتضیٰ اعوان

صاحب کتاب کا تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرا نام محبت علی ہے اور میں نے ضلع میرپور کے ایک قصبہ گوڑا ڈومال کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ گوڑا ڈومال کے نام سے مشہور اس چھوٹے سے قصبے میں دس گھرانے آباد تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی 15 سال اسی بستی میں گزارے۔ 1961ء میں برطانیہ کے شہر شفیلڈ میں آکر آباد ہوا اور تاحال یہاں ہی قیام پزیر ہوں۔ میں کوئی ڈگری ہولڈر شخص نہیں ہوں، سکول میں صرف مڈل تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کام میں ایسا لگا کہ مزید تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ اپنی زندگی میں بہت سی ایسی چیزیں دیکھیں اور ایسے تجربات سے گزرا جو میرے نزدیک آئندہ نسل تک پہنچنے چاہئیں اسی لئے اپنی سوانح حیات یا آپ بیتی لکھنے کا خیال دل میں پیدا ہوا۔

برطانیہ منتقل ہونے کے بعد اخبار بینی، سوشل ورک، علماء، سیاست دانوں، سماجی افراد، بزنس مین طبقہ اور دیگر پڑھے لکھے طبقات کے ساتھ مجلسیں کرنے سے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی کہ میں نے جو دیکھا اُسے کتابی شکل میں پیش کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت مشکل کام ہے اس لئے کہ میں ڈگری ہولڈر نہیں، لیکن پھر میرے دل میں خیال آیا کہ کل قیامت کو اپنا حساب کتاب خود ہی دینا ہے، وہاں تو تعلیم کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، میں نے تو بس اپنا مافی الضمیر بیان کرنا ہے، اس لئے قارئین کو پہلے ہی سے بتادوں کہ اگر کوئی چیز آپ کے علمی معیار پر پوری نہ اترے تو درگزر سے کام لیں، اور اسے میری علمی کمزوری سمجھ کر معاف کردیں۔

اس کتاب میں میں نے اپنے بچپن سے لے کر اب تک کہ حالات وواقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ان سے جو میں نے سبق سیکھا ہے اور اس کے نتیجے میں جو تجاویز میرے ذہن میں آئی ہیں انہیں آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب کئی لوگوں کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع دے گی ، اور بالخصوص وہ لوگ جو شروع شروع میں برطانیہ آ کر آباد ہوئے ان کی زندگیوں کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوگی۔ کتاب پڑھ کر اپنی آرا اور خیالات سے ضرور مستفید فرمائیں۔

احقر: محبت علی

پیدائیش، بچپن، خاندانی پس منظر

میری پیدائیش 6، اکتوبر 1946ء کو گوڑا ڈومال میں ہوئی یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے ہم ڈھوک کہتے تھے، اور یہ منگلا ڈیم بننے سے پہلے پرانے میرپور میں واقع تھا، اس میں کُل دس گھرانے آباد تھے جن میں ہمارا گھرانہ نمایاں تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک زمیندار کی جو ضروریات ہوتی ہیں مثلاً کھیتوں کے لئے بیل، دودھ کے لئے بھینس، بکریاں، اناج اگانے کے لئے زمین سب کچھ موجود تھا۔ میرے والد صاحب کا نام حیدر علی اور دادا کا نام بارُو علی تھا۔ ہمارا گھرانہ کل دس افراد پر مشتمل تھا، میرے والد حیدر علی، والدہ فاطمہ بی، دادا بارو علی، دادی لال بی بی، میں خود، میرے بھائی برکت علی، سلطان محمود، میری بہنیں زینت بی، اور فضیلت بی۔
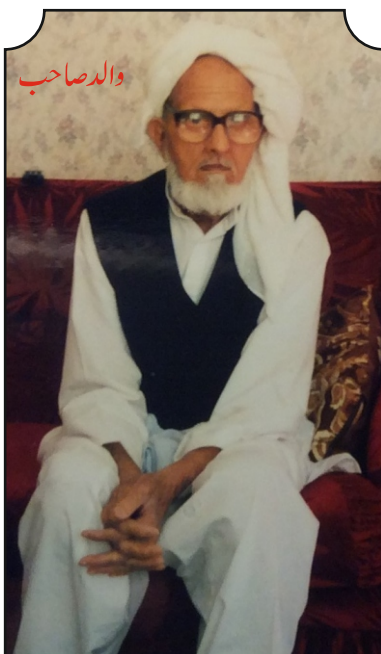
میرے دادا جان بارو علی

میرے دادا بارو علی ایک زمیندار تھے، وہ نہایت شریف آدمی تھے جو صرف اپنی زمین اور مویشیوں سے کام رکھتے تھے، جتنی زمین سے کمائی ہوتی تھی سب گھر والے کھاتے تھے، وہ زمینداری کا سارا کام خود کرتے تھے، خاص کر بیلوں کی خوب دیکھ بھال کرتے تھے۔ اگر ہمارے بیلوں سے کوئی اور کام لینا چاہتا تھا تو میرے دادا کی مدد کے بغیر ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ان کی محنت کی وجہ سے ہماری زمین کی فصل اچھی ہوتی تھی، فصل کی کٹائی کا وقت شروع ہوتا تو بسم اللہ کر کے شروع کرتے۔ کٹائی کے بعد فصل ایک جگہ جمع کرتے، بھوسہ اور دانے الگ کرتے جو ایک محنت طلب کام تھا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ بہت سے غریب لوگ آجاتے دادا جان سب سے خندہ پیشانی سے پیش آتے چاہے مرد ہوں یا عورتیں، ہر ایک کو ایک مقدار میں اس کا حصہ دیتے، اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہتا تھا لیکن کبھی انہوں نے کسی کو خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجا۔ وہ بیلوں کے متعلق خوب جان کاری رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی آدمی نیا بیل خریدتا تو اس کی نس بندی کے لئے میرے دادا جان کی خدمات حاصل کرتا۔ وہ دور دور جا کر یہ خدمت مفت انجام دیتے، حالانکہ اس کی وجہ سے ایک مرتبہ ان کی ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی لیکن پھر بھی وہ لوگوں کی خدمت کرتے تھے۔ اسی لئے میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنی استعداد کے مطابق میں بھی لوگوں کی خدمت کروں۔

دادا جان نے ایک دفعہ بتایا کہ وہ تین بھائی تھے۔ دوسرے دونوں بھائی بمبئی جاتے تھے مگر میں یہاں ہی رہا، وہ جو کچھ کماتے یہاں گھر آ کر خرچ کر دیتے اور پھر چلے جاتے تھے، مگر میں نے اللہ کے فضل اور اپنی محنت سے اُن سے زیادہ زمین بنائی، اور آج گاؤں میں سب سے زیادہ خوشحال میں ہوں۔ اپنی محنت کا ایک قصہ سنایا کہ ایک دفعہ میں

اپنی زمین کوٹھیک کر رہا تھا ساون کی بہت زیادہ بارش ہوئی ، میرے کام کے دوران زمین میں ایک جگہ شگاف پڑ گیا، مجھے اور تو کچھ سمجھ نہ آیا، اُس وقت میرے پاس ایک کمبل تھا میں نے اسے ہی تہہ لگا کر شگاف کی جگہ پر رکھ دیا اور خود اُس کے اوپر بیٹھ گیا مگر پانی کا زور اتنا تھا کہ میں کئی گز دور تک اس پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ گیا لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا۔اب میں سوچتا ہوں ہوں کہ رزق حلال کے لئے ہمارے بزرگوں نے کتنی محنت کی ۔اللہ تعالیٰ میرے دادا جان کی مغفرت فرمائے ،اورانہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

والدہ اور بہن زینت بی

برکت علی، محبت علی اور سلطان

میرے والد حیدر علی

میرے والد حیدر علی ایک چھوٹی سی تجارت کرتے تھے، پڑھے لکھے نہیں تھے، اس لئے سارا حساب و کتاب زبانی ہوتا تھا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا وہ مجھے اپنے ساتھ شہر لیجاتے، وہاں سے سامان خریدتے، کچھ رقم نقد ادا کر دیتے اور کچھ اُدھار کر لیتے تھے۔ گھر پر جو تجارت کرتے تھے ان کے پاس اگر دس گاہگ آتے تو ان میں سے پانچ نقد ادائیگی کر دیتے اور پانچ ادھار لیجاتے۔ والد صاحب زبانی حساب و کتاب رکھتے تھے اس لئے کچھ یاد رہتا اور کچھ بھول جاتا جس کی وجہ سے شہر کے دوکاندار کا اُن پر بہت قرض چڑھ گیا۔ اس وقت میری عمر سات آٹھ سال کی تھی جب میرے والد صاحب نے گھر والوں کو بتایا کہ شہر والا دوکاندار قرض کی ساری رقم مانگ رہا ہے، اس لئے انہوں نے اُدھار رقم لے کر

اس کا قرض اتارا اور پھر محنت مزدوری کرنے لگے۔میرے والد صاحب کے کاروبار بند ہونے کی وجہ اُدھار دینا تھا جس کی وجہ سے ان کا بزنس گیا اور بہت سے لوگوں کا ایمان ۔ بہت سے لوگوں نے رقم واپس نہ کی ،اور کچھ تو بالکل ہی مُکر گئے کہ ہم نے تو ادھار لیا ہی نہیں بہرحال والد صاحب اس کے بعد جلد ہی انگلینڈ آ گئے۔اُس وقت میرپور کے لوگوں میں انگلینڈ کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ جب انگریزوں کی حکومت تھی تو اس وقت جو لوگ بحری جہازوں میں کام کرتے تھے وہ جب انگلینڈ اُترتے تھے تو وہیں پہ رہ جاتے تھے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب سارا کام بمبئی میں ہوتا تھا۔لوگ جب انگلینڈ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد واپس آتے تو لوگوں کو بتاتے تھے کہ وہاں بہت کام ہے،اور ہم خوب پونڈ بناتے ہیں ۔اس لئے پاکستان بننے سے پہلے ہمارے بہت سارے لوگ انگلینڈ جا چکے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارے لوگ انگلینڈ جانا چاہتے تھے لیکن حکومت پاکستان جانے نہیں دیتی تھی،اس لئے لوگ اس وقت ایران و عراق سے ہوتے ہوئے انگلینڈ جاتے تھے اور یہ سلسلہ 1955ء تک یوں ہی رہا۔ اس کے بعد حکومت پاکستان نے گیارہ سو روپے زرِ ضمانت رکھنے کی شرط پر برطانیہ جانے کی اجازت دے دی،اور بڑی تعداد میں لوگ برطانیہ جانا شروع ہو گئے۔

میری تعلیم

ہمارا علاقہ پانچ ڈھوک پر مشتمل تھا جو میرپور شہر سے تین میل کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف واقع تھا،کل آبادی پچاس ،ساٹھ کنبوں پر مشتمل تھی ،جس میں تقریباً چار سو نفوس ہوں گے۔ساٹھ سال سے اوپر کے افراد میں مشکل سے کوئی لکھ پڑھ سکتا تھا،تیس چالیس سال کے افراد میں بھی مشکل سے چار پانچ آدمی میٹرک یا مڈل پاس تھے ۔ پھر پاکستان بن گیا تو تعلیم کا رجحان شروع ہوا۔ اور جب میں برطانیہ آیا تو اُس وقت تک

درجنوں لڑکے مڈل اور میٹرک پاس ہو چکے تھے۔ میرے سکول کا نام مڈل سکول لرڑ تھا جو ہمارے گھر سے تین میل کی مسافت پر واقع تھا۔ جب میں نے سکول شروع کیا تو ہمارے ڈھوک سے چار پانچ لڑکے سکول جاتے تھے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ پہلے دن میں سکول نہیں جانا چاہتا تھا لیکن آہستہ آہستہ میں عادی ہو گیا۔ مجھے قاعدہ میں بٹھایا گیا جس میں تقریباً چالیس بچے تھے اور ایک استاد۔ پہلی جماعت میں ان میں سے تقریباً 25، 30 رہ گئے تھے۔ ان بچوں کی تعلیم چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ استاد مارتے بہت ہیں تو وہ بھاگ گئے۔

جب میں چوتھی کلاس میں تھا تو اس وقت جو ٹیچر ہمیں پڑھانے آتے تھے تو وہ ایک ماہ کا سبق دے کر چلے جاتے تھے، اس طرح وہ بچہ کیسے تعلیم حاصل کر سکتا تھا جس کے گھر میں کوئی پڑھا لکھا فرد موجود نہ ہو۔ بہر حال جیسے کیسے کر کے میں مڈل تک پہنچ گیا۔ میں ایک استاد کو کبھی نہیں بھول سکتا جو میر پور سے پیدل آتے تھے، پورا ٹائم دیتے تھے، محنت سے پڑھاتے تھے، ان کا نام احمد دین صاحب تھا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ پھر میرے ایک اور استاد تھے جن کا نام مولوی محمد نبی تھا جو گورسیاں سے آتے تھے۔ وہ چھوٹی کلاس سے لے کر مڈل تک سب کو عربی، فارسی اور دینیات پڑھاتے تھے۔ اور صبح کی اسمبلی بھی وہی کرایا کرتے تھے، اُن سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا، آج بھی ان کی دی ہوئی دینی معلومات ذہن میں تازہ رہتی ہیں۔

بچوں کے سکول چھوڑنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ استاد اتنا مارتے تھے کہ اتنا تو مویشیوں کو بھی نہیں مارا جاتا۔ بچے خوف سے سکول سے بھاگ جاتے، دوسری وجہ امتحان میں فیل ہو جانا تھا، جب ایک لڑکا سکول میں فیل ہو جاتا تو اس کے غریب والدین کہتے کہ لڑکا فیل ہو گیا ہے یہ پڑھنے کے قابل نہیں لہٰذا اُسے گھر کے کام کاج میں لگا دیتے، وہ بھی

خوش ہو جاتا کہ استادوں کی مار سے بچ جاؤں گا۔ تیسری وجہ استادوں کا سکول سے غیر حاضر رہنا تھا، جو سکول ماسٹر پڑھانے کے لئے نہیں آتے تھے ان کے تعلقات بڑے لوگوں سے ہوتے تھے، یا ان کے گھرانے کا کوئی آدمی حکومت میں ہوتا تھا۔ مثلاً ایک ماسٹر صاحب ضلع مفتی کے سیکرٹری تھے، وہ ہر جلسہ اور پروگرام میں اُنہی کے ساتھ رہتے، اور دو تین ماہ کے بعد سکول آتے اور کہتے کہ یہ صفحات ہیں ان کو یاد کر لینا۔ ایک ماسٹر صاحب ایک پیر صاحب کے مرید تھے وہ بھی کبھی کبھی آجاتے اور کسی لڑکے کی ذمہ داری لگا دیتے کہ ان کو سبق یاد کر وا دینا۔ ایک استاد ایسے بھی تھے جن کو شائد آٹھ دس سال کے عرصہ میں ایک آدھ دفعہ ہی کلاس میں دیکھا ہوگا اور اس پر مزید یہ کہ جب وہ آتے تھے تو ان کا کام پٹائی کرنا ہوتا تھا۔ برطانیہ آکر اور یہاں کے تعلیمی نظام کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں جہالت کیوں ہے۔ اور کیوں لوگ تعلیم سے بھاگ جاتے ہیں، ہمارے لوگ لکیر کے فقیر ہیں، جو چیز ایک دفعہ شروع کی ساری زندگی اسی کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ برطانیہ میں شروع کے سالوں میں فیل کرنے کا کوئی تصور نہیں، آخری تین سالوں میں جو کم نمبر لیتا ہے اس کو فیل کرتے ہیں ،لیکن اس کے باوجود وہ بچہ کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ جاتا ہے، اور اپنی روزمرّہ کی زندگی میں اسے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جو اچھے نمبر لیتے ہیں وہ آگے کالج، یونیورسٹی میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان کا شمار بھی تعلیم یافتہ ممالک میں ہو سکتا ہے اگر وہاں پر مندرجہ ذیل کام کئے جائیں:

(1) بچوں کو مارنا چھوڑ دیں، اور پیار سے استاد اپنے بچوں کی طرح پڑھائیں۔

(2) کم از کم مڈل تک فیل کرنے والے نظام کو ختم کر دیا جائے۔

(3) سکولوں میں تعلیم کے ساتھ ہنر بھی سکھائے جائیں۔

(4) بچوں کو کھیل کود کے مواقع دیئے جائیں۔

(5) والدین کو بھی سکول کمیٹیوں کے اندر رکھا جائے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ سکول میں کیا ہو رہا ہے۔

اگر ان چند تجاویز پر عمل کر لیا جائے تو بہت بڑی تبدیلی آ سکتی ہے۔

علاقے کی دیگر برادریاں

جیسا کہ میں نے پہلا لکھا کہ ہمارا علاقہ پانچ ڈھوک پر مشتمل تھا، اور اس میں مختلف برادریوں کے افراد شامل تھے۔ بڑی برادریوں میں جاٹ، گوجر، وینس، آرائیں، اور راجہ برادریاں زیادہ مشہور تھیں۔ اوران کے اکثر افراد کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ کچھ سید برادری کے لوگ بھی تھے ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

میاں جی کے گھر بھی تھے، بچوں کو قرآن پڑھانا اور مسجد کی امامت ان کے ذمّہ تھا۔ اس کے علاوہ میت کے غسل سے لے کر کفن ودفن اور جنازہ کی ساری ذمہ داریاں بھی ان کے پاس تھیں۔ آج بھی جو دینی کام ہو رہا ہے وہ اسی طبقہ کے ذمّہ ہے یعنی میاں جی کا نام جسے آج کی اصطلاح میں مولوی یا مولانا کہا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ لوگ جو رات دن اسلام کی خدمت میں لگے رہتے ہیں ان کو عزت تو دی جاتی ہے، ادب سے بلایا جاتا ہے، لیکن ان کی ضروریات کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔ نہ اُس وقت میاں جی کی کوئی معقول تنخواہ ہوتی تھی اور نہ آج علماء کی ہے۔ یہاں تک کہ یہاں برطانیہ میں بھی امام مسجد کی تنخواہ اتنی کم ہے کہ اس کو امامت کے ساتھ کوئی نہ کوئی کام مزید کرنا پڑتا ہے، تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ اس بات کی بہت اشد ضرورت ہے کہ وہ لوگ جو دین کا علم سیکھنے سکھانے میں لگے ہوئے ہیں ان کی معاشی ضروریات وافر مقدار میں پوری کی جائیں، تاکہ وہ یکسو ہو کر تندہی سے اپنی ذمّہ داری پوری کر سکیں۔ اور مزید یہ کہ ہماری مساجد کمیٹیاں ان کو اپنا غلام اور ملازم نہ سمجھیں، بلکہ واقعی میں اپنا امام اور پیشوا جان کر اُن کی عزت کریں۔

کچھ مزید برادریوں (یعنی ہنرمندوں، اور پیشہ وروں) کا تذکرہ میں بالخصوص کرنا چاہتا ہوں۔

(1) کاسبی: جو کپاس زمیندار تیار کرتے اس سے کپڑے بنانا ان کا پیشہ تھا۔

(2) لوہار: زمینداری کے لئے نئے اوزار بنانا، اور پرانوں کی مرمت کرنا ان کے ذمّہ تھا۔

(3) مستری: مکانات وغیرہ بنانے کا کام کرتے تھے، اس کے علاوہ لکڑی کے کام کے لئے اور چکی وغیرہ کی مرمت کے لئے بھی ان لوگوں کی خدمات لی جاتی تھیں۔

(4) کمہار: برتن بنانے کا کام ان کے ذمّہ تھا۔

(5) بازی گر: شادی بیاہ میں لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ڈھول باجے کا کام کرتے تھے۔

(6) درزی: کپڑے کی سلائی کے لئے ان کی خدمات لی جاتی تھیں۔ خصوصاً شادی بیاہ کے موقع پر شادی والے گھر میں ان کو بٹھا دیا جاتا تھا اور وہ سارے گھر والوں کے کپڑے سلائی کرتے تھے۔

(7) جوگی: لوگوں کے لئے فال وغیرہ نکالا کرتے تھے۔

ان پیشہ ور لوگوں کو (جن کا میں نے اوپر خاص طور پر ذکر کیا ہے) عام طور پر عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، اور یہ اس وقت کے معاشرے کا پسّہ ہوا نچلا طبقہ سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ سب بڑے عقلمند لوگ تھے۔ اب آپ خود موازنہ کریں کہ یہاں برطانیہ میں ان لوگوں کو کیا مقام حاصل ہے۔ اور کوئی بھی ان کو بری نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ یہاں ان تمام شعبوں کو با قاعدہ یونیورسٹیاں ڈگریاں جاری کرتی ہیں۔

وہ جنہیں ہم کاسبی کہتے یہاں کپڑے کے بڑے کارخانے ان کی وجہ سے آباد

ہیں ،اور پوری دنیا کا سب سے بڑا کاروبار ہے۔ سٹیل کا کاروبار برطانیہ کا بہت بڑا ذریعہ معاش ہے، اور ہم سب جو یہاں برطانیہ آئے انہی سٹیل فیکٹریوں میں کام کرتے تھے، حالانکہ یہ لوہاروں والا کام تھا لیکن اس کو کوئی برا نہیں سمجھتا تھا۔

اب کمہار کو لے لیں یہاں برطانیہ میں ان کو پوٹری کہتے ہیں، سٹوک آن ٹرینٹ (Stoke-on-Trent) میں بہت بڑی انڈسٹری ہے اور پورے ملک میں اس کا چرچہ ہے، ہمارے سب لوگ اس میں فخر سے کام کرتے ہیں۔

بازی گر: کا جدید نام فلمی اداکار، ڈرامہ اداکار یا پھر شوبز آرٹسٹ ہو گیا ہے، اور آج وہ صاحب عزت ہیں۔ میں نے دیکھا کہ درزیوں کو یہاں ڈریس ڈیزائنز (Drais designer) کا نام دیا گیا ہے۔ درزی کے نام کی عزت نہیں، لیکن ڈریس ڈیزائنز (Drais designer) پاؤں زمین پر نہیں رکھتا۔ جوگی کا نام پامسٹر (Palmistr) ہو گیا، اس بیچارے کو جاہل کہا جاتا تھا لیکن پامسٹری (Palmistry) کارڈ سے ستاروں کا علم بتانے والوں کا چرچا ہے جبکہ نام اور کام وہی ہے۔

یہاں آج برطانیہ میں تمام برادریوں کے لوگ بلا امتیاز حجام کا کام کر رہے ہیں، اس میں کوئی عار نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اب ان کا نام بار بر یا ہیئر ڈریسر (Hair dressers) ہو گیا ہے۔ میں نے یہ ساری تفصیل اس لئے بیان کی ہے کہ تاکہ آپ موازنہ کر سکیں کہ ہنرمند افراد کا ہمارے معاشرے میں کیا مقام ہے، اور یہاں برطانیہ میں ان کو کس طرح قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ حکومتی سطح پر ان تمام ہنر مند پیشہ افراد کو عزت دی جاتی، ان کے لئے مراکز تیار کئے جاتے جہاں پر اس طرح کے ہنرمند افراد تیار ہوتے، تاکہ ملک بھی ترقی کرتا اور ان کو بھی عزت ملتی۔ یہ لوگ بیرون ملک جا کر ملک کے لئے قیمتی زرمبادلہ لانے کا سبب بن سکتے ہیں۔

تذکرۂ سادات

سیّدوں کو اُس وقت بھی عزت حاصل تھی اور آج بھی ہے۔ پاکستان میں جتنی بڑی پوسٹیں ہیں ان میں بہت بڑی تعداد سیّدوں کی ہے۔ پولیس ہو، یا عدالت، سول سروسز، فوج یا سیاست، پیری مریدی، ہر جگہ سیّد ہیں۔ اس وقت خوشحال طبقات میں ان کا نمبر پہلا ہے۔ سادات ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ میری شادی کے دو دوست تھے اور وہ دونوں سیّد تھے، جو بچپن سے میرے دوست تھے، ان میں سے ایک سیّد کرامت حسین تھے، جن کا اب انتقال ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ہم نے اکھٹے سکول میں پڑھا، پھر جب میں انگلینڈ آ گیا اور میر پور میں ڈیم بن گیا تو وہ گوجرانوالہ چلے گئے۔ پھر اللہ کی کرنی یہ ہوئی کہ ہم نے بھی زمین گوجرانوالہ میں لے لی، سیّد کرامت حسین نے میری زمین آباد کرنے میں بہت مدد کی اور خوب دوستی نبھائی۔

دوسرے دوست الطاف حسین شاہ تھے، وہ میاں موڑہ کے رہنے والے تھے مگر اُن کے بزرگ "میاں مت" کی قبر مبارک ہمارے گاؤں میں تھی اس لئے وہ ہمارے گاؤں منتقل ہو گئے۔ ہمارے گاؤں والوں نے مل کر ان کا مکان بنا دیا، ڈیم بننے تک ہم وہیں رہے ڈیم بننے پر ان کے والد "میاں مت" کی قبر انہوں نے چک سواری منتقل کر دی۔ الطاف حسین انگلینڈ آ گئے، کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے اور پھر اپنا مکان لے لیا، اور اب وہ شفیلڈ میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں، اور ہمارا یارانہ اب بھی باقی ہے۔

گاؤں کی زندگی کی مزید یادیں

کیونکہ میں خود زمیندار گھرانے سے ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گھر کا زیادہ خرچ زمین کی آمدن سے ہی پورا ہوتا تھا، جو بھی زراعت پیشہ افراد تھے وہ خوب دل لگا کر محنت کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو معلوم تھا کہ جو بھی فصل حاصل ہو گی، ہماری ہی

ہوگی۔اس وقت شادیاں بھی اسی آمدن سے ہوتی تھیں۔کام صبح سویرے سے دوپہر تک ہو تا تھا۔پھر دوپہر کو آرام کے بعد اکثر لوگ کہیں اکھٹے ہو جاتے،حقّہ کا دور چلتا،اور گپ شپ کی محفل سج جاتی۔نومبر سے فروری تک زیادہ کام نہیں ہوتا تھا اس لئے ان دنوں میں یہ محفلیں صبح ہی سے شروع ہو جاتی تھیں۔

زمین کی تیاری کے لئے اکثر لوگوں کے پاس اپنے بیل ہوتے تھے۔لیکن اگر کسی کے پاس بیل نہ ہوتے تو ایک دوسرے سے مانگ لیتے تھے،جس سے ایک دوسرے کی مدد ہو جاتی تھی۔سواری کا اہم ترین ذریعہ اس وقت ٹانگہ تھا۔گدھے کو بھی استعمال کیا جاتا تھا،اور کچھ لوگوں کے پاس گھوڑے بھی ہوتے تھے لیکن بہت ہی کم۔اونٹ کو اُس وقت آج کے ٹرک کے برابر مقام حاصل تھا،اور زیادہ تر مال برداری کا کام اس سے لیا جاتا تھا۔مال مویشیوں میں زیادہ تر لوگ بھینس اور بکریاں رکھتے تھے۔گائے رکھنے کا رواج ہمارے علاقے میں کم ہی رہا ہے۔جس کے ہاں کوئی بھینس وغیرہ نہیں ہوتی تھی تو اسے دودھ تو قیمتاً خریدنا پڑتا تھا،لیکن لسّی ہمیشہ مفت ہی میں ملتی تھی،اور دوپہر کے وقت چٹنی اور تندور کی روٹی کے ساتھ لسّی ایسی مرغوب غذا تھی جس کے لئے آج بھی منہ میں پانی آجاتا ہے۔

قربانی کے لئے لوگ گھروں پر جانور پالتے تھے،لیکن آج جیسا ماحول نہیں تھا۔بہت تھوڑے لوگوں کو اس کی استطاعت حاصل ہوتی تھی کہ وہ قربانی کرسکیں،اور اس کی وجہ غربت تھی۔کام کاج بہت کم تھے۔کچھ لوگ کھانے پر کام کرجاتے تھے،اور کچھ چار آنے یا آٹھ آنے پر مزدوری کرتے تھے۔البتہ سرکاری ملازم کی اپنی ہی شان ہوتی تھی۔پولیس کا ایک سپاہی بھی گاؤں میں آجاتا تو لوگ اس سے ڈرتے تھے۔پاکستان بننے سے پہلے پولیس والا آجاتا تو لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کی جمع پونجی لے جاتا تھا اور بے عزتی الگ

سے کرتا تھا۔ گاؤں کا نمبر دار اس وقت حکومت کا بڑا اہلکار ہوتا تھا اور اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ کوئی اس کے سامنے کھڑا ہونے نہ پائے۔

چوھدری نور حسین

جب سکھوں کی حکومت ختم ہوئی اور آزاد کشمیر کی حکومت قائم ہوئی تو حکومتی عملہ وہی تھا اور لوگوں کو خوب لوٹ رہا تھا اور انہیں ہر طرح سے تنگ کیا جاتا۔ اس وقت میری عمر تقریباً 12 سال ہوگی جب چوہدری نور حسین نامی ایک آدمی ہمارے گاؤں آیا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے غریبوں کی آواز بن کر ان کے حقوق کی جنگ لڑی۔ انہوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ ہم نے سکھ حکومت سے آزادی اس لئے حاصل کی تھی کہ سُکھ کا سانس لے سکیں، لیکن آج بھی وہی حال ہے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ایک ایسی فورس یا ملیشیا بناؤں گا جس کی وردی بھی میں خود ہی دوں گا، پھر اس نے ایک فورس بنائی اور ان کو پولیس کی وردی سے ملتی جلتی وردیاں دیں، اور لوگوں سے کہا کہ جب میں آپ کو بلاؤں تو آپ میری مدد کریں۔ اُس نے میر پور شہر میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا جس میں ہر غریب آدمی موجود تھا، لوگ ڈھول لے کر جلسہ میں گئے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار لوگوں کا اتنا مجمع دیکھا۔ اس جلسہ میں اس نے اعلان کیا کہ اب کوئی آدمی کسی حکومتی اہلکار کا کام مفت میں نہیں کرے گا، اور ان کے ظلم کے خلاف ڈٹ جائے گا۔ اس اعلان کے بعد نمبر دار، پولیس، پٹواری، سب ڈر گئے اور غریبوں نے سُکھ کا سانس لیا۔

آج میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ لیڈر وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ غریب عوام ہو۔ اس کی صرف چند مثالیں دوں گا: سب سے بڑی مثال ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہے کہ جب انہوں نے نبوت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان کی دعوت پر لبیک کہنے والے غرباء اور مساکین ہی تھے۔

قائداعظم نے پاکستان بنایا تو ساتھ دینے والے غریب تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو ہوں یا نواز شریف ان کا ساتھ دینے والے غریب ہی تھے۔ اس لئے میں ان کو لیڈر مانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص ایک دفعہ غریب کا دل جیت لے تو پھر وہ زندگی بھر اس کی عزت کرتا ہے، وہ رہے یا نہ رہے، اس کی قدر اور اس کا نام ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ جب کہ امیروں کا جو لیڈر ہوتا ہے وہ تو دوستوں کو بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس میں اخلاص نہیں ہوتا، ایک دفعہ چلا جائے تو دوبارہ اس کا نام بھی کوئی نہیں لیتا۔

میرے بچپن کا ایک واقعہ

میرے بچپن کی یادوں میں ایک واقعہ مجھے بہت یاد آتا ہے اور وہ ہے میری زندگی کی آنکھوں دیکھی پہلی لڑائی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ پڑھنے لکھنے کا رواج ہمارے علاقے میں بہت کم تھا، لیکن دوسری طرف اگر کوئی میٹرک پاس کر کے کہیں نوکری کرنے لگتا تو وہ بھی اپنے آپ کو سب کچھ سمجھنے لگتا تھا۔ ایک دفعہ امریکہ نے ”دیہات سنوارو“ پروگرام کے تحت کچھ ایڈ، دی۔ اس پروگرام میں میٹرک پاس لوگوں کو نوکری دی جاتی تھی۔ ہمارے گاؤں کا ایک آدمی جو ہمارا رشتہ دار بھی تھا، اُس کو بھی اس میں نوکری مل گئی، اس نے سب سے پہلے ایک مائیکروفون جس کو ہم باجا کہتے ہیں خریدا اور دن رات اس کو بجاتا تھا، پھر کچھ اوباش قسم کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور ایک گینگ بنا لیا۔

ہوا یوں کہ ہمارے محلے کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جس میں عام طور پر چار پانچ نمازی ہوتے تھے، اور رمضان میں دس بارہ۔ مسجد میں پانی کا انتظام بڑا مشکل ہوتا تھا، ایک آدمی مسافر نامی اس کا انتظام کیا کرتا تھا۔ یہ آدمی جو دس جماعتیں پاس کر گیا تھا مسجد کا نمازی نہیں تھا، لیکن اس نے روزانہ صبح سویرے آکر مسجد میں غسل کرنے کا معمول بنا لیا۔ اب بیچارے مسافر نے کہا کہ میں بڑی مشکل سے نمازیوں کے لئے پانی کا بندوبست کرتا

ہوں اور یہ سارا پانی غسل میں استعمال کر لیتا ہے۔ جب یہ بات میرے والد صاحب تک پہنچی تو انہوں نے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے اپنے بدمعاشوں کو جمع کر کے اچھی خاصی لڑائی کی، اور جو سمجھدار لوگ سمجھے جاتے تھے انہوں نے بھی اسی کی طرف داری کی کہ اگر اس نے مسجد کا پانی استعمال کر لیا ہے تو اس میں کیا ہو گیا۔ اس واقعہ سے میں یہ سمجھا ہوں کہ دنیا دار لوگ اپنی دھاک بٹھانے کے لئے ہمیشہ شریفوں کو ہی مجرم بناتے ہیں، اس لئے دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی ضروری ہے تا کہ دنیا اور آخرت دونوں کا بھلا ہو۔

سفر برطانیہ

محبت علی جب انگلینڈ آئے
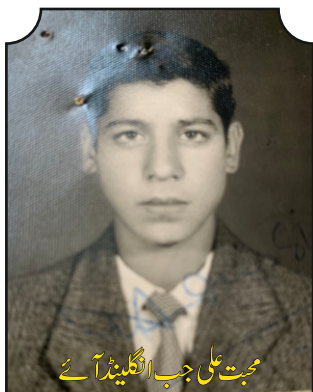
میں آٹھویں کلاس میں تھا کہ والد صاحب نے گھر والوں کو خط لکھا کہ محبت کو انگلینڈ بھیج دو، جب میں نے سنا تو بہت خوش ہوا۔ سوچا اب پڑھنے کا کیا فائدہ؟ انگلینڈ جو جا رہا ہوں، دوستوں کو بتایا وہ بھی بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے بڑے خوش قسمت ہو۔ یہ غالباً مئی کا مہینہ تھا، میرے ماموں جو انگلینڈ سے آئے تھے مجھے اپنے ساتھ لے کر کراچی کے لئے روانہ ہوئے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت پاسپورٹ صرف کراچی سے بنتا تھا۔ میں زندگی میں پہلی بار بس پر سوار ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ بس نہر کے ساتھ ساتھ جہلم کے لئے رواں دواں تھی۔ یہ میرے لئے بالکل نیا تجربہ تھا، بس جہلم پہنچی، ہم ریلوے سٹیشن پہنچے، یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا۔ بڑے صاف ستھرے بڑے بڑے پلیٹ فارم تھے، سامان اٹھانے والی ٹرالی کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ دوپہر کے وقت ریل گاڑی بھی پہنچ

آئی۔لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔لوگ اُتر بھی رہے تھے،اور سوار بھی۔ہم بھی اس دھکم پیل میں کوشش کرتے ہوئے گاڑی میں سوار ہوئے، بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی،سیٹ لکڑی کی بنی ہوئی تھی اوراس کے اوپر ایک بیڈ تھا، لمبے سفر والے اس بیڈ پر سوتے تھے۔لاہور تک اسی طرح سفر کیا، جب گاڑی لاہور پہنچی تو کافی مسافر وہاں پر اتر گئے اور گاڑی میں کافی جگہ بن گئی۔ گاڑی کراچی کی طرف رواں دواں تھی، دونوں طرف کی زمین سرسبز اور بالکل ہموار تھی،کوئی پہاڑ کا نام ونشان نہیں تھا، مال مویشی کھیتوں میں کھڑے تھے،کہیں نہریں، پانی، درخت اور فصلیں شروع ہو جاتیں ۔جس سٹیشن پر گاڑی کھڑی ہوتی تو کوئی آواز بلند کرتا انڈے لے لو،کوئی کہتا روٹی لے لو اور اس طرح ہمارا یہ سفر گجرات، لاہور، ملتان،سکھر اور میر پور خاص سے ہوتا ہوا حیدر آباد تک چلتا رہا۔حیدر آباد سے کافی پہلے سرسبز زمین ختم ہو چکی تھی، اور ریتلی زمین اور کھجور کے بڑے بڑے درختوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔جب حیدر آباد آیا تو ماموں نے کہا کہ اب تیار ہو جاؤ ہمارا آخری سٹیشن کراچی آنے والا ہے۔

ہم صبح سویرے کراچی پہنچے، یہ سٹیشن بہت بڑا تھا، بڑے بڑے ہال والے بر آمدے تھے۔جدھر دیکھو آدمی ہی آدمی تھے، مجھے یہ سب بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ماموں مجھے ساتھ لے کر ایک جاننے والے کے پاس چلے گئے،ہم نے ایک رات وہاں گزاری اور دوسری رات ہم نے ایک ہوٹل میں گزاری۔ماموں کھٹملوں کی وجہ سے چار پائی پر نہ سو سکے اور دو چار کرسیوں کو ملا کر ان پر ہی لیٹ گئے، جب کہ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔اگلے روز ہم پاسپورٹ آفس گئے،آفس والوں نے مجھ سے پوچھا کہ انگلینڈ کس کے پاس جا رہے ہو تو میں نے کہا کہ والد صاحب کے پاس۔ پاسپورٹ بن گیا،اوراس طرح یہ مرحلہ اختتام پذیر ہوا۔

اس کے بعد ہم کراچی کی سیر کے لئے نکلے،اُس وقت کراچی بہت ہی خوبصورت

شہر تھا، کشادہ اور خوبصورت سڑکیں، ہر طرف بڑے بڑے خوبصورت باغ، مردوں کا لباس سفید پتلون اور شرٹ تھی، عورتیں عموماً مکمل لباس میں تھیں، مگر بعض کا لباس مکمل نہیں تھا، میرے ماموں نے کہا کہ انگلینڈ میں عورتیں ایسا ہی لباس پہنتی ہیں۔ ہر کوئی اردو بول رہا تھا، مجھے تو اردو آتی نہیں تھی اس لئے کسی سے بات چیت کا موقع نہیں ملا۔ سمندر دیکھنے گئے تو دیکھا کہ اس کے کنارے ایک بہت بڑی دیوار ہے جس پر کھڑے ہو کر لوگ سمندر کا نظارہ کر رہے ہیں، کچھ لوگ سمندر میں نہا رہے تھے، میں کراچی کی سیر سے خوب لطف اندوز ہوا۔ انسانوں کا ہجوم، بڑے بڑے مکانات، کشادہ سڑکیں، گاڑیاں میرے لئے ایک مختلف دنیا تھی۔ پاسپورٹ ملنے کے بعد ہم لوگ واپس میرپور آ گئے۔

اگست 1961ء میں میرے انگلینڈ جانے کی تاریخ طے ہوگئی، گھر سے روانگی کے وقت میری والدہ اور دادی صاحبہ جو مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں رو رہی تھیں۔ میری دادی مرحومہ میرا بہت خیال کرتی تھیں، جب کبھی بیمار ہو جاتا میری چار پائی پر بیٹھ جاتیں، کبھی سر دَباتیں، کبھی پانی دیتیں اور کبھی پیار کرتیں۔ سب گھر والے ان کی بہت عزت کرتے تھے، اگر کسی بات پر ناراض ہو جاتیں تو سب انہیں منانے کی کوشش کرتے تھے۔ مجھے الوداع کرنے کے لئے پورا گاؤں باہر آیا، اور یہ اس وقت کا رواج تھا۔ جب میں کراچی پہنچا تو لنڈا بازار سے اپنے لئے ایک کوٹ اور پتلون خریدا، اور ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہو گیا، جہاں سے "KLM" ائیر لائن کی ذریعے لندن کے لئے روانگی ہوئی۔ میرے ساتھ تین لڑکے اور ایک بڑی عمر والا آدمی بھی تھا، ان سے دعا سلام ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ریٹائیرڈ فوجی افسر ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے انگلش کا مسئلہ ہے آپ میری مدد کر دیں گے۔ اس نے کہا کہ مجھے انگلش آتی ہے تمہارے لئے ٹیکسی کا انتظام کر دوں گا۔

جب جہاز لندن ائیر پورٹ پر اترا تو ایک عجیب نظارہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ

ایک بہت بڑی دومنزلہ بلڈنگ ہے، نیچے اوپر جانے کے لئے ایک زینہ ہے جو خود چلتا ہے، لوگ اس پر کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر چلے اوپر پہنچ جاتے ہیں، جب میں اس کے قریب گیا تو ڈر گیا، ایک اور پاکستانی نے کہا کہ ڈرو نہیں اس پر کھڑے ہو جاؤ یہ تمہیں اوپر لے جائے گا۔ باہر نکلے تو اس فوجی افسر نے برمنگھم کے لئے مجھے ٹیکسی کر کے دی۔ باہر بادل چھائے ہوئے تھے، سردی تھی اور وہ بھی اگست کے مہینے میں، لوگ بالکل مختلف، زبان بھی، لباس بھی، رنگ بھی، لیکن اس کے باوجود سب کچھ اچھا لگ رہا تھا، خوبصورت سڑکیں، ہر طرف سبزہ۔ راستے میں قضائے حاجت کی ضرورت پیش آئی تو بڑی مشکل سے ڈرائیور کو سمجھایا کہ ٹوائلٹ جانا ہے۔ دس منٹ کے بعد اس نے ایک سروس سٹیشن پر گاڑی روکی تو شاندار قسم کا باتھ روم موجود تھا، جسے استعمال کرنے کا طریقہ بھی معلوم نہیں تھا، ڈرائیور نے سمجھایا۔ وہاں سے برمنگھم ماموں کے پاس گیا جہاں کافی لوگ رہائش پذیر تھے، ایک ہفتہ تک وہاں قیام رہا اس دوران پہلی مرتبہ "کوڈے شاہ" نامی فلم بھی دیکھی۔ اگلے ہفتے والد صاحب کے پاس شفیلڈ آ گیا۔

جس گھر میں والد صاحب رہائش پذیر تھے وہ تقریباً بارہ (12) افراد پر مشتمل تھا، گھر کے پچھلے گارڈن میں ساٹھ (60) گز کے فاصلے پر ایک ٹوائلٹ تھی۔ کچن بیسمنٹ میں واقع تھا، ہر ایک کو اپنا کھانا خود بنانا پڑتا تھا اس لئے کہ کاموں کے اوقات ہر ایک کے جدا جدا تھے، دن اور رات کی مختلف شفٹیں ہوا کرتی تھیں۔ والد صاحب مجھے بیسمنٹ میں لے گئے اور بڑے پیار سے سمجھایا کہ بیٹا یہ گیس کوکر ہے، اس کو اس طرح استعمال کرتے ہیں، یہاں کھانا خود پکانا پڑتا ہے۔ انہوں نے مجھے روٹی اور سالن بنانے کا طریقہ بھی سکھایا، جس کے بعد آہستہ آہستہ میں خود کھانا بنانے کا ماہر ہو گیا۔

کام کی تلاش

یہاں انگلینڈ میں ہفتے کا آغاز پیر سے ہوتا ہے، ہفتہ اوراتوار چھٹی کے دن تھے، جب بھی کوئی نیا شخص ملک میں آتا تو سب سے پہلے جاب سینٹر میں اسے لیجاتے، مجھے بھی لے جایا گیا، آفیسر نے کہا کہ تمہارے لئے کام بہت ہیں۔ اُس نے ایک گارڈ کمپنی کا نام دیا وہاں گیا تو مالک نے انگلش میں سوال کیا جو میرے سر کے اوپر سے گزر گیا، اس نے کہا کہ آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ یہاں کام نہ ملنے کے بعد پھر جاب سنٹر گیا،تو انہوں نے مجھے ایک رولنگ مل میں بھیج دیا، خیر یہاں کام مل گیا، والد صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ کئی لوگ سال بھر سے نکمّے بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے پہلے ہفتے ہی میں کام مل گیا۔کام شروع کیا تو پہلے ہفتے کی تنخواہ تین پونڈ اور کچھ شلنگ تھی،اور کام اتنا سخت تھا کہ لوہے کا ایک بڑا ڈیلا، جومن بھر کا ہوتا تھا اس کو آگ میں سے گزارا جاتا،اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اس سے ایک انچ موٹی بار بن جاتی جو سانپ کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ میں بہت گھبرایا، زخمی بھی ہوا۔ وہاں انگریز تھے اور کچھ عرب اور بنگالی بھائی،میرا ہم زبان کوئی نہیں تھا، میں اپنے آپ کو ملامت کرتا کہ کیوں انگلینڈ آیا۔گھر جا کر والد صاحب سے کہا کہ میں کام پہ نہیں جاؤں گا۔انہوں نے کہا فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، والد صاحب کو بھی انگلش نہیں آتی تھی،لیکن اشاروں کنایوں سے انھیں سمجھایا کہ ذرا ہاتھ ہلکا رکھیں، جو وہ سمجھ گئے اور کہا کہ آپ فکر نہ کریں ہم اس کی مدد کریں گے۔ پھر حالات بہتر ہوتے گئے، میں کام میں ماہر ہو گیا، یہاں پر میں نے ساڑھے چار سال تک کام کیا۔

یہاں میں ایک بات آپ کے گوش گزار کروں کہ ہمارے لوگ جو پاکستان سے آئے ان میں سے 75 فیصد لوگ میرپور سے تھے، باقی راولپنڈی اور چھچھ سے تھے اور کچھ بنگال کے شہر سلہٹ سے۔ان میں سے اکثریت اَن پڑھوں کی تھی، چند ایک میٹرک

سے بی،اے تک پڑھے ہوئے تھے۔کچھ ریٹائیرڈ فوجی بھی تھے۔ان میں سے ہر ایک کو یہ یقین تھا کہ دو چار سال یہاں کام کریں گے اور پھر واپس ملک چلے جائیں گے اس لئے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔لیکن آہستہ آہستہ قیام بڑھتا گیا،لوگوں نے مکانات خریدنے شروع کردیئے،اپنا بزنس کھولنا شروع کردیا۔

شفیلڈ کی پہلی مسجد

مذہبی رجحان رکھنے والوں نے مسجدیں بنانے کی طرف توجہ دینی شروع کردی، سیاسی ذہن رکھنے والوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا۔شفیلڈ میں سب سے پہلے مسجد قائم کرنے والے دو حضرات تھے،چوہدری کرم داد،اور چوہدری علی حیدر۔ یہ دونوں حضرات بحری جہازوں کے ذریعے یہاں آئے،انگریز عورتوں سے شادی کی،انگریزی سے واقفیت تھی،یہاں کے معاملات سے خوب واقف تھے،انہوں نے لوگوں کی بہت مدد کی۔یہ مسجد (یعنی انڈسٹری روڈ مسجد) 1962ء میں ان دونوں حضرات نے بنائی جو سب مسلمانوں کے لئے تھی،اُس میں کوئی بھی نماز پڑھ سکتا تھا۔جب 1968ء میں پاکستان سے میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ اب مسجد انڈسٹری روڈ کے بجائے بورڈمن سٹریٹ میں ہے۔میں نے پوچھا کیا وجہ ہے کہ وہ مسجد بند کردی ہے اور یہ لے لی ہے تو مجھے بتایا گیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں آبادی زیادہ ہے اور یہاں پر ایک چرچ سیل پر لگا تھا،ان بزرگوں نے علماء کرام سے پوچھا کہ کیا ہم اس پرانی جگہ کو فروخت کرکے اور اس کے ساتھ کچھ اور رقم ملا کر اس چرچ کو مسجد کے لئے خرید سکتے ہیں؟ اس وقت علماء نے فتویٰ دیا کہ چونکہ یہ مسجد بنیادی نہیں بنائی گئی اس لئے آپ اس کی جگہ نئی مسجد لے سکتے ہیں۔وہ کوئی عالم نہیں تھے انہوں نے ایسا ہی کیا۔پھر کچھ عرصہ کے بعد کچھ لوگوں نے شور شروع کردیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ مسجد بند کردیں۔پھر کافی لڑائی ہوئی اور ان بزرگوں نے کافی جگہوں

سے اپنے حق میں فتوے بھی لئےلیکن اس کے باوجود کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا کیا اور کیس عدالت میں لے گئے اور عدالت نے عوام کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ان بزرگوں کو برا بھلا کہا جاتا ہے حالانکہ اُن دونوں نے سب سے پہلے مسجد لی اور اس کے لئے رقم کا بندوبست بھی کیا۔رقم بھی ان کی ، ٹائم بھی انہوں نے دیا۔ یہ واقعہ صرف تاریخ کی درستگی کے لئے میں نے تحریر کردیا ہے۔

☆ علماء کرام جو شروع میں یہاں آئے ان میں زیادہ تر پٹھان اور انڈین تھے،سب لوگ ایک ہی مسجد میں نمازیں پڑھنے آتے تھے،تبلیغی جماعتیں بھی آنا شروع ہو گئیں اور مسجدیں آباد ہونے لگیں۔

☆ پاکستان کی طرح یہاں پر بھی ہمیں پاسپورٹ اور دوسرے معاملات کے بہت سے مسائل تھے۔ان کے حل کے لئے یہ سوچا گیا کہ کوئی تنظیم بنائی جائے جو لوگوں کی مدد کرے،شفیلڈ میں اس وقت تقریباً 500 افراد ہو چکے تھے، چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک ہال بک کروایا گیا اس میں سو کے قریب افراد جمع ہوئے ، وہاں پاکستان ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے تنظیم بنائی گئی ،جس کا چیئرمین چوہدری کرم داد صاحب کو بنایا گیا۔ چوہدری صاحب کی اہلیہ انگریز تھی،اور ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا،اس خاندان نے لوگوں کی بہت خدمت کی۔

☆ ایک مسئلہ جو پیدا ہوا وہ میّت کی پاکستان منتقلی کا تھا،شروع میں فوت ہونے والے ایک دو افراد کی میّتوں کو چندہ اکھٹا کر کے پاکستان بھیجا گیا۔پھر ہم نے سوچا کہ ڈیتھ کمیٹی بنائی جائے ،اور آہستہ آہستہ علاقائی اور برادری کی بنیاد پر مختلف ڈیتھ کمیٹیاں بن گئیں ،جس کا فائدہ یہ ہوا کہ کسی کی وفات کی صورت میں انتظامات کی پریشانی ختم ہوگئی۔

میرپوریوں میں ہمدردی کا جذبہ

یوں تو ہم سب مسلمانوں میں ایک دوسرے سے ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے، لیکن میر پور کے لوگوں میں باقیوں کی بنسبت یہ جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے، شروع میں ایک دوسرے سے ادھار لے کر نقد مکان لیتے تھے، مکانات کی قیمت دو تین سو پونڈ ہوا کرتی تھی، لیکن اس وقت یہ رقم بھی بہت زیادہ تھی۔

ایک مکان میں بیس تیس تک افراد رہتے تھے، کوئی نیا آدمی آتا تو جب تک اس کا کام نہ لگتا، اس سے کرایہ بھی نہ لیتے، اور کھانا بھی مفت دیتے تھے۔ جب وہ کمانے لگتا تو کرایہ وصول کیا جاتا، اور اپنے کھانے کا انتظام بھی وہ خود کرتا۔ لوگوں کو انگلینڈ منگوانے میں بھی ایک دوسرے کی بہت مدد کی، اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو یہاں سے پیسے بھیجے اور ان کو منگوا کر یہاں آباد کروایا، اس وقت ویزہ کا تو نظام نہیں تھا، بس تین چار ہزار میں پاسپورٹ بنوا کر یہاں آسکتے تھے، اور ائیر پورٹ پر انٹری ہوتی تھی۔

جب بہت زیادہ لوگ آنا شروع ہوئے تو گورنمنٹ نے کہا کہ اب صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ یا ہنرمند افراد ہی آسکتے ہیں جیسے ڈاکٹر، ڈگری ہولڈر، یا سابق فوجی۔ اس کے بعد 18 سال سے کم عمر کے بچے بلانے کی اجازت تھی، اس میں بھی لوگوں نے جہاں اپنے بچوں کو بلایا وہاں دوسروں کے بچوں کو بھی اپنے بچوں کے ساتھ نام لکھوا کر یہاں بلایا۔ شروع میں والدہ کے بغیر صرف بچے آرہے تھے، پھر گورنمنٹ نے دیکھا کہ اس سے معاشرے میں بگاڑ آسکتا ہے تو انہوں نے والدہ کے بغیر بچوں کے آنے پر پابندی لگا دی جس سے یہاں فیملی لائف شروع ہوئی، بچے سکول جانے شروع ہوئے، انگلش تعلیم اور بول چال ہماری نسل میں بھی آنا شروع ہوئی، اور ان لوگوں کے ساتھ میل جول سے ہماری ادائیں بھی اُن جیسی ہونے لگیں۔

اُس وقت کا برطانوی کلچر

یہاں میں پھر آپ کو تھوڑی دیر کے لئے پیچھے لیجانا چاہتا ہوں اور یہاں کے کلچر اور رہن سہن، اور اُس وقت کے حالات سے تفصیلاً آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں جب میں یہاں پر آیا۔ یہاں کی مقامی آبادی تو انگریزوں پر مشتمل تھی، ان کی رنگت سفید اور خوبصورت تھی، صحت بھی ہم سے اچھی تھی، خوراک اچھی تھی، گوشت، انڈے، مرغی، دودھ کا استعمال خوب کرتے تھے۔ شراب بھی خوب پیتے تھے، شراب خانے بہت تھے جن کو پب کہتے تھے، نوجوانوں کی عیاشی اور موج مستی کے لئے نائٹ کلب تھے، جہاں سے لڑکیوں سے دوستیاں، اور پھر شادیاں ہوتی تھیں۔ یہاں کچھ لوگ تو ساری ساری زندگی بغیر شادی کے بھی اکھٹے رہتے ہیں۔ کئی کئی بچے ہوجاتے ہیں اور پھر جا کر شادی کرتے ہیں۔ لباس ان کا کوٹ اور پتلون تھا، اور عورتیں کوٹ نکر پہنتی تھیں، اکثر دونوں کام کرتے تھے۔ لیکن بچوں والی عورتیں گھروں پر بھی رہتی تھیں۔ جوان بچے بچیاں ایک دوسرے کو دوست بناتے اور والدین اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے، اگر کوئی لڑکا لڑکی کسی جگہ کھڑے ہو کر پیار کی پینگیں ڈالتے تو کوئی بھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

اُس وقت مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تنخواہ آدھی ہوتی تھی۔ اگر سفر کی بات کروں تو ریل کا سفر عام تھا، صاف ستھری گاڑیاں مقرّرہ ٹائم پر آتیں، بہت کم دیکھا کہ ریل گاڑی لیٹ ہوئی ہو۔ سڑکوں میں اس وقت سب سے بڑی اور مشہور موٹر وے ایم، ون (M,1) تھی، جولندن سے نوٹنگھم تھی، اور پھر اے، ون (A,1) جولندن سے گلاسکو تھی۔ ہر شہر میں بس سروس جو بہت زیادہ استعمال ہوتی تھی، کرایہ بہت کم اور گورنمنٹ اس

پر سبسڈی دیتی تھی۔فون کے لئے ہر گلی کے کونے پر فون بکس تھے،جس میں سکّے ڈال کر بات کر سکتے تھے۔ڈاک کا نظام بہت اچھا تھا،کوئی بھی خط ایک سے دو دن میں مل جاتا تھا،تعلیم کے بارے میں میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سولہ سال تک بچوں کو ایک کلاس سے دوسری کلاس کی طرف منتقل کیا جاتا ،اس میں بچوں کو فیل نہیں کیا جاتا تھا۔آخری سال جو امتحان پاس کرتا پھر آگے کالج اور یونیورسٹی میں چلا جاتا ، یا کوئی ٹیکنیکل کورس کر کے کوئی ہنر سیکھ لیتا ، اور اپنا کام شروع کر دیتا ، اور دوسرے پڑھے لوگوں کی طرح اچھی خاصی آمدن حاصل کر لیتا تھا۔جو بچے جی ،سی ،ایس ،سی (GCSC) کا امتحان پاس نہ کر سکتے وہ بھی ان پڑھ نہیں رہتے تھے،ان میں سے بھی اکثر فیکٹریوں میں ملازم ہو جاتے ، اور ہمارے جیسے غیر ملکیوں کے باس بن جاتے ،ان کو فور مین اور چارج ہینڈ کہتے تھے۔اگر کسی کے پاس کام نہ ہوتا تو گورنمنٹ ہفتہ کا خرچ دیتی تھی ،اور یہ اُس ٹیکس میں سے حاصل کیا جاتا جو لوگ کام کر کے گورنمنٹ کو دیتے تھے۔بزنس مینوں کو اپنی کمائی کا حساب دینا پڑتا،اور اُس کے مطابق ان سے بھی ٹیکس لیا جاتا۔نچلہ طبقہ اکثر ٹیرس (Terrac) مکانوں میں رہتا، یہ وہ مکان ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں ۔اور کچھ لوگ سیمی ٹیرس (Semi-Terrac) مکانوں میں رہتے ۔یہ دو مکان اکھٹے ہوتے ہیں۔اور جو ذرا تگڑے ہوتے ان کے ڈی ٹیچ (Detached) مکان ہوتے ،یعنی صرف اکیلا گھر۔بہر حال مکانوں کی بناوٹ اکثر ایک جیسی ہوتی ہے،جس سے بظاہر امیر وغریب کا امتیاز بہت کم محسوس ہوتا ہے ۔ہر گلی کے کونے پر ایک دوکان ہوتی تھی ،سب محلے دار اُسی سے اشیاءِ ضرورت خریدتے تھے۔ایک دوسرے کو جانتے تھے،ادھار بھی چلتا تھا۔

جب میں یہاں آیا تو میرے والد صاحب نے ہمارے محلے کے دوکاندار کو کہا کہ محبت کو کوئی چیز ضرورت ہو تو اس کو دے دینا اور لکھ لینا، میں ہفتہ بھر میں بل ادا

کر دوں گا۔ وہ بڑی خوشی سے دے دیتے تھے، پندرہ، بیس، گلیوں کے بعد کوئی پانچ ، چھے دوکانیں اکھٹی ہوتی تھیں جن میں سے ایک آدھ آف لائسنس ہوتی تھی جس میں شراب ملتی تھی، اور دیر تک کھلی رہتی تھی۔ جبکہ دیگر دوکانیں چھے بجے بند ہو جاتی تھیں۔ سٹی سنٹر میں بڑی دوکانیں تھیں۔ اس کے علاوہ بینک، سٹی ہال، ٹاؤن ہال، دفاتر اور دیگر حکومتی ادارے شامل تھے، جو پانچ بجے تک کھلے رہتے تھے۔ رات کو نائٹ کلب اور پَب چلتے، لوگ دن بھر کی تھکن کو دور کرنے کے لئے ان جگہوں کا رخ کرتے تھے۔

شروع میں یہاں کے لوگ نہ ہمارے کھانوں کو پسند کرتے تھے اور نہ ہم ان کے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم لوگ تھوم والے تڑکے کی ہانڈیاں بناتے تو اس کی خوشبو ان کو سخت ناپسند ہوتی تھی، لیکن ہمارے منہ پر کچھ نہیں کہتے تھے۔ اُن کی مشہور خوراک فش اینڈ چپس سے ہمیں بھی بہت بو آتی تھی۔ کئی سالوں تک بریڈ نہیں کھاتے تھے کہ اس میں حرام چربی شامل ہے۔ لیکن اب وہ بھی بڑے مزے سے تھوم والی ہانڈیاں کھاتے ہیں، اور ہم بھی فش اینڈ چپس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

انگریز قوم کی ایک خوبی میں نے دیکھی کہ اگر کسی سے کوئی پتہ پوچھیں تو جب تک آپ اچھی طرح سمجھ نہ لیں آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ راستے میں کہیں غلطی سے ٹکر ہو جائے تو فوراً معذرت کریں گے۔ گاڑی چلاتے ہوئے دوسرے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کو سیکھنے کے لئے پہلے با قاعدہ ایک مکمل کتاب پڑھ کر امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ پھر ڈرائیونگ سکول سے با قاعدہ سیکھ کر پریکٹیکل امتحان پاس کر کے ہی آپ ڈرائیور بن سکتے ہیں۔ فیل ہو گئے تو پھر دوبارہ امتحان دینا پڑتا ہے، بعض لوگ دس دس دفعہ تک فیل ہونے کے بعد پاس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حادثات کی شرح بہت کم ہے۔

اردو اخبار

ہم جب پاکستان سے آئے تھے تو صرف اردو پڑھ سکتے تھے، اردو کا کوئی اخبار یہاں نہیں ہوتا تھا، سب سے پہلے مرحوم محمود ہاشمی نے جو پڑھے لکھے اور فن صحافت کے ماہر تھے ہفت روزہ اردو اخبار نکالنا شروع کیا، میں اس اخبار کا قاری بن گیا۔ پاکستان کی خبریں پڑھتا جو اس وقت ایک نعمت سے کم نہیں تھا، آج تو وہاں کے لوگوں سے زیادہ ہمیں پاکستان کی خبروں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ اُس اخبار سے مجھے بہت شعور ملا۔ اس وقت پاکستان میں جنرل ایوب خان کا مارشل لاء تھا، لوگ یہاں سے اکثر پیسہ ہی پاکستان بھیجتے تھے۔ کچھ لوگوں نے گاڑیاں بھیجنا شروع کیں، گاڑیوں میں اس وقت بہت مشہور بیڈفورڈ (Bed ford) ٹرک تھا جس کو بھیجنے کے لئے پاکستانی گورنمنٹ سے منظوری لینی پڑتی تھی، اور اس کی وصولی گندھارا انڈسٹری سے ہوتی تھی جو جنرل ایوب کے لڑکوں کی ملکیت تھی۔ اور اخبارات میں ان دنوں یہ خبر مشہور تھی کہ وہ بڑا مال بنا رہے ہیں۔ اس وقت ایک بہت بڑا مسئلہ ختم نبوت کے حوالے سے بھی تھا جس کی وجہ سے پاکستان کے حالات کافی خراب تھے، یہ ساری معلومات ہمیں اخبارات کے ذریعے ملتی تھیں۔

لوگوں نے صدر ایوب کے صدارتی نظام کی مخالفت شروع کی اور پارلیمانی نظام کا مطالبہ کر دیا، حکومت مقامی حکومتوں کا نظام لائی جس میں صدر لوگوں کے ووٹوں سے نہیں بلکہ مقامی ممبروں کے ووٹوں سے بنتا۔ اب صدر ایوب کے مقابلے میں قائداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو آگے لایا گیا۔ لیکن چونکہ اختیارات جنرل ایوب کے پاس تھے، اس نے میڈیا اور دوسرے ذرائع کو استعمال کر کے ان کو غدّار کہلوایا، اور خوب گالم گلوچ کی۔ صدارتی الیکشن میں محترمہ فاطمہ جناح کو ہروایا گیا، لیکن یہ ہتھکنڈے جنرل ایوب کو کامیاب نہ کرا سکے اور لوگوں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے، جلاؤ گھیراؤ

کیا گیا، جنرل ایوب کو خوب گالیاں دیں اور بالآخر اس کو حکومت چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ یہ ساری معلومات مجھے اس وقت کے اخبارات سے حاصل ہوئیں۔

پاکستان کا سفر اور پہلی شادی

انگلینڈ میں رہتے ہوئے مجھے پانچ سال ہو گئے تھے کہ گھر والوں نے پیغام بھیجا کہ پاکستان آ جاؤ، اس وقت منگلا ڈیم بن رہا تھا۔ 1965ء میں میں پاکستان گیا، وہاں پہنچا تو والدین نے کہا کہ تمہارے لئے لڑکی پسند کر لی ہے، تمہاری شادی کرنی ہے، یہ خبر میرے اوپر بجلی بن کر گری، اس کی وجہ یہ تھی کہ انگلینڈ میں رہتے ہوئے یہاں کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ ہمارے لوگوں کی کوشش ہوتی تھی کہ شادیاں اپنے ملکوں سے کی جائیں ،لیکن ہم یہ دیکھتے تھے کہ یہاں تو ایک دوسرے کی پسند کے بغیر شادی نہیں ہوتی، کچھ انڈین فلموں کا بھی اثر تھا، وہی ہیرو، اور ہیروئن والی سوچ تھی۔ ہر لڑکا یہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی ہو، شہر کی رہنی والی ہو۔ میرے کئی دوستوں کی شادیاں جہلم، راولپنڈی، گجرات اور لاہور سے ہوئی تھیں، اس لئے میں نے انکار کر دیا، والد صاحب نے کہا کہ ہم زبان دے چکے ہیں، شادی تو تم کو کرنی ہی پڑے گی، جس لڑکی سے میری شادی طے ہوئی وہ چودہ سال کی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی والدین کی بات ماننا پڑی اور شادی کر لی۔ خیر شادی تو کر لی لیکن مجھے حکم ہوا کہ تم اس سے بات بھی نہیں کر سکتے۔ اگر اس وقت ہمیں ساتھ رہنے کی اجازت مل جاتی تو شائد میری بیوی کے ساتھ کوئی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی لیکن ایسا نہ ہو سکا، اور بالآخر اس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میں دو سال وہاں رہا، اس دوران میر پور میں اپنا گھر بنایا، اور پھر واپس انگلینڈ آ گیا۔

قلعہ دیدار سنگھ کی زمین

1969ء میں دوبارہ پاکستان گیا یہ وہ وقت تھا جب منگلا ڈیم بن چکا تھا، اور ہم نے گوجرانوالہ کے علاقہ قلعہ دیدار سنگھ میں 21، ایکڑ زمین خریدی۔ یوں تو زمین کی خریداری ایک معمول کی کاروائی ہے لیکن مجھے یہاں ایک پورا باب باندھنا پڑ رہا ہے جو صرف اس زمین کے حوالے سے ہے، اور اس کی وجہ وہ جعل سازی ہے جو ہمارے ساتھ کی گئی۔ جنرل ایوب خان کے دور میں جہاں بہت سے اچھے کام ہوئے وہاں بہت سے برے کام بھی ہوئے، اور ان میں سے ایک یہ جعل سازی کا کام بھی تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جو غیر مسلم زمین چھوڑ کر گئے تھے انہیں ان لوگوں کو الاٹ کیا جاتا تھا جو انڈیا سے ہجرت کر کے آئے تھے، اس الائمنٹ میں بڑے پیمانے پر کرپشن کی گئی۔ اس وقت کچھ پٹواری، تحصیلدار، ڈپٹی کمشنر اور فوجی مل کر جعل سازی سے زمین ایک آدمی کے نام کر کے فروخت کر دیتے تھے۔

ہم نے جس آدمی سے زمین خریدی وہ ایک ریٹائرڈ کرنل تھا، اور وہ گجرات کا رہنے والا تھا، انہوں نے ایک فرضی نام سے مختار نامہ اپنے نام کر دیا جب کہ اس زمین کا اصل مالک کوئی اور تھا۔ کرنل صاحب نے جعلی کاغذات بنوا کر زمین ہمیں بیچ دی۔ میرے والد صاحب میر پور سے جس پٹواری کو اپنے ساتھ لے کر گئے تھے اس نے کاغذات دیکھنے کے بعد کہا کہ مجھے تو ٹھیک لگتے ہیں اس لئے ہم نے زمین لے لی۔ لیکن زمین لینے کے بعد دو مقدمے ہو گئے۔ اب میرے ذمّہ دو کام ہو گئے ایک زمین کو آباد کرنا جو بالکل بنجر تھی، اور دوسرا مقدموں کی پیروی کرنا۔ ہمارے گاؤں سے ایک اور آدمی بھی ہماری زمین کے قریب

آباد ہوا تھا، انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رہنے کی آفر کی جو میں نے قبول کر لی۔ مقدمہ کا ایک فریق کشمیر سے آئے ہوئے مہاجر تھے جس نے ہماری ایک ایکٹر زمین پر قبضہ کیا ہوا تھا، اور دوسرا مقدمہ ایک راجپوت شخص سے تھا جس کا دعویٰ تھا کہ میں انڈیا کا مہاجر ہوں، میں حق دار ہوں یہ زمین مجھے الاٹ کی جائے جب کہ ہمارا مؤقف یہ تھا کہ ہم منگلا ڈیم کے متاثرہ ہیں اور یہ زمین ہم نے خریدی ہے۔

جب کچہری جاتے تو آواز لگتی عطا محمد بنام ۔۔۔ دوسری پارٹی۔ کرنل صاحب تو جعلی کام کر کے پیسے لے کر اپنے گھر چلے گئے اور مصیبت ہمارے گلے ڈال گئے۔ دوسرے صاحب کے ساتھ دس بارہ سال مقدمہ کرنے کے باوجود ہم ایک ایکڑ زمین کا قبضہ حاصل نہ کر سکے۔

آزادی کے بعد مہاجرین کے لئے قانون بنایا گیا تھا کہ جو آدمی انڈیا سے مہاجر ہو کر آیا ہے وہ جتنی زمین کا دعویدار ہوگا اتنی اسے ملے گی، جو غریب زمیندار تھے ان کو کچھ نہ کچھ تو مل گیا جس سے ان کی مشکل سے گزر بسر ہونے لگی، لیکن جو لوگ ہوشیار تھے جیسے اسمبلی ممبر، فوجی، پولیس والا، جج، وکیل وغیرہ وہ یوں کرتے کہ بڑی عمر کے بوڑھوں کو کچہری بھیج دیتے اور وکیل صاحب سے کہتے یہ میرا کیس ہے، وہ ایک فائل بنا دیتا اور کیس چل پڑتا ان بزرگوں کے پاس کھلا وقت ہوتا تھا صبح آکر کچہری میں بیٹھ جاتے، اور پانچ دس مربّے الاٹ کرانے کے بعد جعلی کیسوں کے ذریعے مزید زمین لیتے رہتے۔ وکیل اُن کا، پٹواری ان کا، تحصیلدار ان کا، ان کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتیں۔ جب کہ عام آدمیوں میں سے کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا، کوئی اپنی تجارت میں تو کوئی نوکری چاکری میں مصروف، اور ہم میر پور والوں میں سے کوئی انگلینڈ میں اور کوئی میر پور میں۔ اُدھر عدالتوں میں تاریخ پر تاریخ دی جاتی، کبھی ایک فریق حاضر تو دوسرا غائب، کبھی وکیل صاحب غائب،

اگر کسی تاریخ پر سب آجاتے تو جج صاحبان اور وکلاء گپ شپ کے بعد اگلے مہینے کی تاریخ دے دیتے۔ دوسرے شہروں سے آنے والوں کے لئے یہ پیشیاں عذاب بن جاتیں، ہمارے میر پور کے پندرہ بیس خاندان قلعہ دیدار سنگھ کی ان پیشیوں سے تنگ آ کر واپس میر پور آ گئے، جب کہ دس سال تک ہم نے بھی یہ پیشیاں بھگتیں اور بالآخر ہم نے بھی واپسی کا راستہ لیا۔

جتنی زمینیں کشمیری مہاجرین نے پنجاب میں الاٹ کرائیں اتنی زمین پورے کشمیر میں نہیں۔ مہاجرین کو مفت زمین اور مکان دینے والا قانون اب ختم ہونا چاہیئے بلکہ انہیں یہ چیزیں کرایہ پر دی جائیں اور جب وہ خریدنے کے قابل ہوں تو اپنے لئے وہ زمین و مکان خرید لیں تا کہ اس سے ملک کو فائدہ ہو۔ یہ مفت بانٹنے کا سلسلہ ختم ہونا چاہیئے اس سے مقامی لوگوں کو نقصان ہوتا ہے، اور یہ کسی ملک میں نہیں ہوتا کہ 72 سال گزارنے کے بعد بھی آپ مہاجر ہی رہیں۔

جن لوگوں نے 1966ء میں زمینیں خریدی تھیں، ابھی 2020ء تک ان کی چوتھی نسل مقدمے بھگت رہی ہے۔ انگلینڈ میں محنت کر کے کماتے ہیں اور وہاں جعلی مقدمات پر خرچ کر دیتے ہیں۔ کوئی مقدمہ ہائی کورٹ میں ہے تو کوئی سپریم کورٹ میں۔ وکلاء بھاری فیسوں کے ساتھ جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں، جب کہ وہ ججز کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں، اور لوگوں کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں۔ چور دوسرے کو کہتے ہیں، اور چوری میں خود شامل ہوتے ہیں۔

ہمارے گاؤں والوں میں سے ایک شخص نے جس نے وہاں زمین خرید کر رہائیش اختیار کی تھی پچاس سال تک مقدمہ لڑا، اور اب اس کے خلاف فیصلہ آ گیا۔ انتظامیہ ٹریکٹر، بلڈوزر لے کر ان کو زمین سے بے دخل کرنے ان کے گھر پہنچ گئی، اب ان بیچاروں

نے پھر اسٹے آرڈر لیا ہوا ہے، اور نہ جانے پھر کتنی رقم ان کو خرچ کرنی پڑے گی۔ یہ سب مظالم ان مہاجرین کی وجہ سے ہیں جو ان زمینوں پر قابض ہیں لیکن مظلوموں کی کوئی شنوائی نہیں۔

یہاں انگلینڈ میں دیکھیں کہ مقدمات کا فیصلہ کتنی جلدی ہوجاتا ہے، عدالتوں میں سیاسی گپ شپ نہیں ہوتی، ججز چہرے نہیں بلکہ کاغذات میں موجود ثبوتوں کی بناء پر فیصلے سناتے ہیں۔ عدالت کا وقت ضائع کرنے پر باقاعدہ جرمانہ عائد ہوتا ہے۔ اور جعل سازی کے ذریعہ فائدہ حاصل کرنے والوں کو جرمانہ اور سزا یا قید دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان میں قلعہ دیدار سنگھ کی زمین کے حوالے سے جو زیادتی ہمارے ساتھ ہوئی وہ صرف ایک مثال ہے۔ منگلا ڈیم کے متأثرین اور پنجاب کے مقامی افراد کے ساتھ مہاجرین کے نام پر ہر جگہ یہ زیادتی روا رکھی گئی۔ جنرل یحیٰ حکومت نے تو بہت زیادتیاں کیں تھیں۔ جب بھٹو کی حکومت آئی تو ہم خوش ہوئے کہ عوامی حکومت آ گئی ہے یہ اپنے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے غریبوں میں مفت زمین تقسیم کرے گی، ان کا نعرہ تھا کہ ہر ایک کے رہنے کے لئے مکان ہوگا، کوئی بھوکا نہیں سوئے گا، ہمیں بھی امید تھی کہ ہمارا حق ہمیں مل جائے گا، مگر وہ ایک خواب ہی رہا۔

جن کرنل صاحب سے ہم نے زمین خریدی تھی میں ان کے گھر بھی گیا تو معلوم ہوا کہ وہ الیکشن لڑ رہے ہیں اور منڈی بہاؤالدین گئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات کرنے کی خاطر رات وہاں گزارنی پڑی، اس دوران ایک صحافی سے معلوم ہوا کہ کرنل صاحب الیکشن پر خوب مال لگا رہے ہیں، یہ وہی مال تھا جو اس نے ہم جیسے لوگوں سے فراڈ کے ذریعے کمایا تھا جو نہ اُن کے کام آیا اور نہ ان کے بچوں کے اور وہ الیکشن ہار گئے۔ اس دفعہ ان سے

ملاقات نہ ہوسکی۔ دوبارہ گجرات ان کے مکان پر ان سے ملنے کے لئے گیا تو انہوں نے خوب آؤ بھگت کی، میں نے جب انہیں اپنی داستان غم سنائی تو کہنے لگے کہ محبت صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں یہ گوجرانوالہ کے ڈپٹی کمشنر صاحب ہیں یہ آپ کی مدد کریں گے، بس سمجھیں کہ آپ کا کام ہوگیا، یہ راولپنڈی جارہے ہیں آپ ان کے ساتھ چلے جائیں یہ آپ کو دینہ اتار دیں گے۔اس صاحب نے دینہ اتار دیا اور پھر آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کہاں ہیں۔ بالآخر 1976ء میں دس بارہ سال کے مقدمہ بازی سے تنگ آ کر ہم نے وہ زمین فروخت کردی، اور انگلینڈ میں مستقل قیام کا فیصلہ کرلیا۔ پورے خاندان نے آئندہ پاکستان میں کاروبار یا جائیداد بنانے سے توبہ کرلی، اور انگلینڈ میں بزنس کرنے کا فیصلہ کیا۔

کسانوں کے ساتھ زیادتی

یہاں ضمناً کسانوں کے ساتھ ہونے والی ایک اور ناانصافی کا میں ذکر کروں گا جو پنجاب میں قیام کے دوران میں نے دیکھی کہ کسان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑی محنت کے بعد جب فصل تیار کر کے اسے منڈی لے کر جاتا تو مڈل مین جسے آڑھتی کہتے ہیں اسے بہت نقصان پہنچا کر خود نفع کماتا تھا۔اگر کوئی آدمی 200 من گندم لے کر منڈی پہنچتا تو اسے مختلف لوگوں (یعنی حقہ بھرنے والوں، دعا کرنے والوں، تولنے والوں) کے اندر تقسیم کر کے پندرہ، بیس من کم کر دیتے۔اور حساب کتاب کے بعد اگر اس کی رقم دس ہزار (10,000) روپے بنتی تو 2000 نقد دے دیتے اور باقی ادھار کا کہہ کر اس غریب کو روانہ کر دیتے۔کبھی بھی کسان کو اس کی محنت کا یکمشت معاوضہ نہ ملتا، اور اس کی گرمی سردی کی ساری محنت کے باوجود اس کو اس کے حق سے محروم کر دیا جاتا۔اس لئے ان مڈل مین (آڑھتیوں) کو ٹیکس سسٹم میں شامل کر کے ان کی نگرانی کرنی چاہئے تاکہ یہ زیادہ رقم نہ

بنائیں۔

منگلا ڈیم

منگلا ڈیم بننے کے وقت لوگوں کو ان کی زمینوں اور مکانوں کے معاوضے مل رہے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے آخری وقت تک نہ تو اپنے مکانات خالی کئے اور نہ ہی اپنے لئے نئے مکان بنائے اس لئے کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ پانی چھوڑا جائے گا۔لیکن بالآخر جب 1966ء میں ڈیم کی تعمیر مکمل ہوگئی اور اس میں پانی چھوڑ دیا گیا تو لوگوں کو یقین ہوگیا کہ واقعی ڈیم بن گیا ہے۔جس کی وجہ سے انہیں بہت تشویش ہوئی،کوئی رشتہ داروں کے گھر گیا،کسی نے کسی دوست کے ہاں پناہ لی،کئی لوگوں نے مکان بنانے کے لئے پلاٹ تک نہیں خریدے تھے،کچھ بیچاروں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ درخواست کیسے دیں۔دوسری مشکل یہ بھی تھی کہ معاوضے بہت کم ملے تھے،100 یا 200 روپے فی کنال کے حساب سے۔مکانات اور درختوں کو ملا کر عام لوگوں کو دس بیس ہزار تک ملے تھے،جس میں انہیں زمین بھی خریدنی تھی،مکان بھی بنانا تھا،اور روزگار بھی۔اس لئے کہ پہلے ان کی آمدنی کا سارا دارومدار زراعت پر تھا،اور وہ بالکل ختم ہوگیا۔

میر پور اور اس کے گردونواح کے اجڑنے والے لوگ تین قسم کی سوچوں میں بٹ گئے ، ایک وہ جو نئے میر پور میں آباد ہونا چاہتے تھے ، دوسرے وہ جو آس پاس کے دیہاتوں ہی میں رہنا چاہتے تھے ، اور تیسرے وہ جو پاکستان میں زمین خرید کر آباد ہونا چاہتے تھے ۔ جہاں نیا میر پور شہر آباد ہے اس کو" بلا گالا" کہا جاتا تھا جو اس وقت بالکل بیابان جنگل تھا جہاں دن کے وقت جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ عام لوگوں کا اس طرف بالکل رجحان نہیں تھا۔لیکن جو لوگ ہوشیار و چالاک تھے ، یا انتظامیہ کا حصہ تھے ، جیسے سول سروس ، جج ، وکیل وغیرہ یا مالدار تھے ان کو معلوم تھا کہ یہی جنگل ایک دن سونا بن جائے

گا۔ چنانچہ انہوں نے کئی کئی کنال کے پلاٹ خرید لئے۔ غریبوں نے پانچ اور دس مرلے پر گزارا کیا۔ اس وقت چار کنال کی قیمت 12000، دو کنال کی 6000، اور ایک کنال کی 2700، دس مرلے کی 1500، اور پانچ مرلے کی 700، روپے تھی۔ غریبوں نے چھوٹے پلاٹ لے لئے۔

دوسرے طبقے نے قریبی آبادیوں میں زمینیں خرید لیں جیسے چتر پڑی، بن خرماں یا کھڑی وغیرہ ان کے لئے بھی بہت سی مشکلات تھیں جیسے ٹرانسپورٹ، سیورج لائن، پانی وغیرہ زمینیں بھی اچھی نہیں تھیں۔

تیسرا طبقہ جنہوں نے پاکستان میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا، انہوں نے وہاں زمینیں تو خریدیں اور بڑے خوش تھے کہ ہم مربعوں کے مالک ہو گئے، کیونکہ میرپور میں جس کے پاس چند کنال زمین تھی وہ مربعوں بھی اپنے آپ کو بڑا زمیندار سمجھتا تھا، اور پاکستان میں بات ایکڑوں سے شروع ہوتی تھی اس لئے وہ آٹھ، دس ایکڑ کے مالک ہو کر بڑے خوش تھے، لیکن ان کے ساتھ جعلی الاٹمنٹ اور قبضہ نہ ملنے کے جو مسائل پیش آئے ان کا میں تفصیل سے پہلے ذکر کر چکا ہوں، بالآخر تنگ ہو کر وہ بھی واپس میرپور لوٹ آئے۔

میرپور میں جس وقت پلاٹ خریدے جا رہے تھے تو خریداروں کے لئے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ وہ اس پلاٹ پر کچھ تعمیر کرنے سے پہلے اس کو فروخت نہیں کر سکے گا، لیکن اس کے برعکس ہوا، لوگوں نے دس روپے کے اسٹام پیپرز پر بیان حلفی کے ساتھ لوگوں کو فروخت کرنا شروع کر دیئے۔ جب لوگوں نے لاکھوں کروڑوں کے اخراجات کے ساتھ ان پر دوکانیں اور مکانات تعمیر کر لئے تو پھر ان کو خیال ہوا کہ ان پلاٹوں کو اپنے نام پر رجسٹر کرانا چاہئے تو وہ جب بیان حلفی والوں کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ اب موجودہ قیمت کے مطابق کم از کم آدھی رقم اور دیں گے تو تب یہ آپ کے

نام پر منتقل ہوگا۔ پھر مقدمہ بازی کا ایسا سلسلہ شروع ہوگیا جو آج تک چل رہا ہے۔ رشوت کا بازار الگ سے گرم ہوگیا، وکیلوں کی چاندی ہوگئی۔

میر پور میں MDA کا ادارہ جب سے قائم ہوا ہے وہ اس وقت سے آج تک کرپشن اور اقرباء پروری کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، اور ہر آنے والی حکومت اُسے اپنے مفادات کے لئے دل کھول کر استعمال کرتی ہے۔ اس کا چیئرمین ہمیشہ حکومت وقت کا کارندہ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے اپنے رشتہ داروں اور تعلق داروں کو خوب نوازا جاتا ہے۔ مجھے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان کے دور میں MDA کے چیئرمین کے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے پلاٹوں میں وزیر اعظم کا کوٹہ اپنے نام کروانے کا بل پاس کروایا تھا۔ اور اپنے رشتہ داروں اور تعلق داروں کو پلاٹوں سے نوازا تھا، جنہوں نے وہ آگے فروخت کر دیئے۔ پلاٹ زیادہ تر غیر میر پوریوں کو دیئے گئے، اور انہوں نے زیادہ تر اپنی برادری اور علاقے والوں کو نوازا۔ انہوں نے وہ پلاٹ آگے بیچ دیئے، خریداروں میں اکثریت انگلینڈ والوں کی تھی۔ پلاٹوں کی قیمتیں بھی خوب بڑھائیں جو پلاٹ تیس ہزار کا تھا وہ، 1992، 93ء میں ایک لاکھ، یا ایک لاکھ بیس ہزار کا ہوگیا۔

پیپلز پارٹی کی جب حکومت آئی تو انہوں نے وہ پلاٹ کینسل کر دیئے، اس طرح خریداروں کو نہ پلاٹ ملے اور نہ رقم، متاثرین میں سب سے زیادہ تعداد انگلینڈ سے تعلق رکھنے والوں کی رہی۔ بیچنے والوں نے تو اپنا الّو سیدھا کر لیا، اور ہمارے ساتھ وہی گوجرانوالہ کا معاملہ ہوا۔ مقدمہ بازی، کچہری کے چکر، وکیلوں کی فیسیں، رشتہ داروں کی منّتیں کہ ہمارے پلاٹ کا خیال رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

ہم میر پور کے لوگوں کا بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ جو ظلم و زیادتی ہمارے ساتھ کی گئی ہم نے کبھی اس پر پرزور احتجاج نہیں کیا، جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ جب ڈیم

بنا تو معاوضوں کی ادائیگیوں میں ہمارے ساتھ زیادتیاں ہوئیں ۔ 75 فیصد متأثرین کو 15000 ہزار روپے سے بھی کم معاوضہ ملا، جس سے وہ اپنی رہائیش اور کاروباری ضروریات کو کیسے پورا کرتا ۔ جن لوگوں نے آواز اٹھائی انہیں بھی ڈرا دھمکا کر خاموش کرادیا گیا۔ منگلا ڈیم کی رائلٹی بھی ہمیں نہ مل سکی ۔ بجلی کا مفت وعدہ کیا گیا تھا، اوراصول بھی یہ ہے کہ جہاں سے گیس، یا بجلی کی پیداور ہوگی وہاں کے مکینوں کو وہ چیز مفت دی جاتی ہے، لیکن افسوس کہ مفت ملنا تو دور کی بات ہے آج سب سے مہنگی بجلی میر پوروالوں کو ملتی ہے، کیونکہ ان کے پاس پاؤنڈز ہیں۔ آج میر پور کے لوگ جتنا زرمبادلہ پاکستان بھیج رہے ہیں شائد ہی پاکستان میں کوئی اور شہر والے بھیجتے ہوں ۔ حکومت گوروں کو پاکستان کی سیر کرانے کے لئے تو مراعات دیتی ہے لیکن افسوس کہ اپنوں کی کوئی قدر نہیں کرتی ۔ آج تک میر پور میں ائیر پورٹ نہیں بنا، اسلام آباد ائیر پورٹ پر اور جی، ٹی، روڑ پر جو کچھ ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ لٹیروں کے ہاتھوں لٹ جانا آئے روز کا معمول ہے۔ اگر حکومت ہم کو تحفظ دے، اچھی ٹورسٹ سائیڈ بنائے تو خطیر زرمبادلہ حاصل کرسکتی ہے، لیکن افسوس کہ اس طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔

1966ء میں جب ڈیم بن گیا اور پھر بادل نخواستہ لوگوں نے میر پور میں اپنے مکانات اور دوکانیں بنانا شروع کردیں۔ آہستہ آہستہ شہر آباد ہونا شروع ہوگیا۔ شہر کا ماسٹر پلان 20، ہزار کے لئے تھا۔ ہم جیسے بہت سے لوگ جو مختلف دیہات سے نکلے وہ انگلینڈ آباد تھے، انہوں نے بھی جب میر پور شہر کو بنتے دیکھا تو ہم انگلینڈ والوں نے بھی وہاں پلاٹ خرید لئے ۔ پلاٹ بیچنے والے وہ لوگ تھے جنھوں نے بے شمار پلاٹ شروع میں الاٹ کرائے تھے۔ اس خرید وفروخت میں مین کردار دلاّل اور ایجنٹ کا ہوتا ہے جو اچھی خاصی کمیشن حاصل کرتا ہے ان کی بھی خوب چاندنی ہوئی۔ اس کاروبار سے کچھ لوگوں نے

فیکٹریاں لگائیں، کچھ نے پرائیویٹ بنک بنانا شروع کر دیئے۔

میری دوسری شادی

اپنی اہلیہ اور بیٹی شبانہ علی کے ہمراہ

اپنے پوتے عادل اسلام علی کے ساتھ

اپنی اہلیہ اور پوتے دانیال علی کے ساتھ

محبت علی اپنے بیٹوں اور پوتے، پوتیوں کے ساتھ

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ 1965ء میں والدین نے میری شادی کردی تھی جو مختلف وجوہات کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ 1969ء میں والدین نے دوبارہ کہا کہ میر پور میں لڑکیاں بہت پڑھ لکھ گئی ہیں، امید ہے کہ تمہاری جوڑ کی مل جائے گی، پاکستان آجاؤ اور شادی کرلو۔ خیر میں پاکستان گیا اور رضیہ علی نامی لڑکی سے میری شادی طے ہوگئی، اور الحمدللہ آج 51 سال سے وہی میری جیون ساتھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوشیاں عطا فرمائیں، اور ایک خوشحال زندگی گزر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمتوں سے بھی خوب نوازا۔ تین بیٹے ہیں: امجد علی، ماجد علی، اور واجد علی، اور ایک بیٹی شبانہ علی۔ الحمدللہ سب پڑھ لکھ کر کامیاب زندگی بسر کررہے ہیں۔

آزاد کشمیر کے الیکشن

چوہدری محمد ولائت، محبت علی، کے ایچ خورشید، محمد رفیق

آزاد کشمیر میں دو پارٹیاں تھیں، مسلم کانفرنس جس کے لیڈر سردار عبدالقیوم خان تھے اور دوسری لبریشن لیگ، جس کے لیڈر کے ایچ خورشید تھے۔ مسلم کانفرنس کا نعرہ تھا کشمیر بنے گا پاکستان ۔ کے ایچ خورشید آزاد کشمیر کو کشمیریوں کی نمائندہ حکومت بنا کر اسے بیس کیمپ بنانا چاہتے تھے تاکہ دنیا پر باور کرایا جا سکے کہ کشمیر پاکستان یا انڈیا نہیں بلکہ کشمیریوں کا مسئلہ ہے، آزادی کے بعد ہم پاکستان کے ساتھ الحاق کریں گے، اکثریت ان کے ساتھ تھی، لیکن الیکشن کے دو تین ہفتے بعد اعلان ہوا کہ مسلم کانفرنس جیت گئی ہے۔ میر پور میں چوہدری نور حسین صاحب کی آزاد مسلم کانفرنس تھی اور ان کو ماننے والے زیادہ تھے جب میر پور بلدیہ کا الیکشن ہوا تو اکثر لوگ کونسلر منتخب ہونے کے بعد انہیں چھوڑ کر مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ اُس وقت پلاٹوں کا کاروبار عروج پر تھا، پارکوں اور نالوں کو بھی پلاٹوں میں بدل دیا گیا، لوگوں نے خوب لمبے لمبے ہاتھ مارے۔ لوگوں کے مطالبے پر دو تین نئے سیکٹر بنائے گئے جس میں قابل ذکر کھمبال کا سیکٹر تھا۔ جب وہ الاٹ ہوا تو چوہدری

اشرف صاحب چیئر مین تھے، اوران کے بعد چوہدری عبدالرزاق صاحب۔

پاکستان میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی انہوں نے جب دیکھا کہ میر پور اور انگلینڈ میں چوہدری نور حسین کے چاہنے والے بہت ہیں تو انہوں نے ان کو اپنا ایڈوائیزر بنالیا۔ پھر ان کو انگلینڈ روانہ کیا گیا، یہاں انہوں نے مختلف شہروں میں جلسے کیئے۔ ہم نے شفیلڈ میں بھی ان کا ایک کامیاب جلسہ رکھا جس میں کم وبیش ایک ہزار افراد شریک ہوئے، اوراس جلسہ کا سپاس نامہ میں نے پڑھا تھا۔

چوہدری نور حسین صاحب پاکستان گئےتو بہت سے بزنس مین اپنے اپنے بینک بنا رہے تھے، جن میں کلیال ہوٹل والوں کا بینک بڑا مشہور تھا، چوہدری صاحب نے بھی اپنا بینک بنالیا، لوگوں سے کہا گیا کہ اگر آپ اپنی رقم ان بینکوں میں جمع کرائیں گےتو آپ کے بندوں کو نوکری دی جائے گی، جتنی بڑی رقم ہوگی اتنی ہی بڑی نوکری ملے گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی برانچیں کھل گئیں ۔ادھر پاکستان حکومت نے جب یہ دیکھا کہ لوگ سرکاری بینکوں سے رقم نکال کر پرائیویٹ بینکوں میں جمع کر رہے ہیں تو انہوں نے اچانک سب پرائیویٹ بینک بند کردیئے۔ جو چھوٹے بینک تھے انہوں نے گورنمنٹ سے ساز باز کر کے اپنے بینکوں کو کارپوریشن سوسائٹی بنالیا، اور کچھ عرصہ بعد ان کو بھی بند کر دیا۔ چند لوگوں کو کچھ رقم ملی اور باقیوں کو ایسے ہی فارغ کر دیا۔

چوہدری نور حسین اور چوہدری برکت علی نے حکومت پاکستان کو چیلنج کیا۔ حکومت نے ایک آفیسر کو نگران بنادیا، لیکن سارا پیسہ ان لوگوں کی تنخواہوں اور مراعات میں چلا گیا۔ چوہدری نور حسین نے بینک کا ایک پلاٹ خریدا تھا اس کو بھی نیلام کر دیا گیا، اوران سے مزید رقم بھی لے لی۔ اس میں میر پوریوں کا کروڑوں کا نقصان ہوا، اس ملی بھگت میں مظفرآباد حکومت بھی شامل تھی۔

میری والدہ صاحبہ کی بیماری اور وفات

امجد علی اپنی دادی کے ساتھ

میری والدہ صاحبہ پاکستان میں تھیں، انہیں انگلینڈ لانے کی ہم نے بہت کوشش کی لیکن وہ اس کے لئے راضی نہ ہوئیں۔ 1992ء میں اچانک بیمار ہو گئیں، میں اپنی بزنس بند کر کے اپنی فیملی سمیت پاکستان گیا، ان کو فالج کا حملہ ہوا تھا، مگر وہ بات چیت کرنے کے قابل تھیں، میں پندرہ سال کے بعد پاکستان گیا تھا اس لئے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں؟ اپنے بہنوئی چوہدری جان محمد اور پڑوسی چوہدری اکرم سے مشورہ کیا، تو انہوں نے سرکاری ہسپتال کے بجائے جناح ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا، میں والدہ کو ڈاکٹر امین صاحب کے پاس لے کر گیا جو کہ ایک اچھے ڈاکٹر تھے انہوں نے چیک کرنے کے دس منٹ بعد دس پندرہ بیماریوں کے نام بتا دیئے اور تسلی دی کہ فکر کی ضرورت نہیں آپ کی والدہ ٹھیک ہو جائیں گی۔

میں سوچ رہا تھا کہ دس منٹ کے چیک اپ سے کس طرح ڈاکٹر صاحب نے اتنی بیماریاں تشخیص کر لیں جبکہ انگلینڈ میں کافی عرصہ کے بعد بھی 100 فیصد بیماری کی تشخیص نہیں ہوتی۔ خیر ایک ہفتہ تک ان کے ہسپتال میں والدہ کو رکھا لیکن ان کی حالت بدستور بگڑتی گئی۔ ایک ہفتے کے بعد انہوں نے کہا کہ ان کے گردے خراب ہو گئے ہیں آپ ان کو کڈنی

سنٹر راولپنڈی کرنل مختار کے پاس لے کر جائیں۔ انہوں نے جو کمانا تھا کما لیا۔ والدہ اشاروں سے منع کر رہی تھی کہ مجھے مت لے کر جائیں لیکن اس کے باوجود میں ان کو راولپنڈی لے گیا، کرنل صاحب یہ ہسپتال اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر چلا رہے تھے، ان کے پاس ڈائلائیسز (Dialysis) کے لئے دو تین مشینیں تھیں، لیکن مریض بہت زیادہ تھے، عرب ممالک، پاکستان، اور کشمیر سے بھی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ گردوں کا کس طرح کاروبار ہوتا ہے، لوگ آتے اور منہ مانگے پیسے مانگتے اور سودا ہوتا۔ مریض کے ہسپتال میں داخل ہوتے ہی کرایہ شروع ہوجاتا تھا لیکن ڈائلائیسز (Dialysis) کی باری کافی دنوں کے بعد آتی تھی، والدہ صاحبہ کی صحت سنبھل نہیں رہی تھی، انہوں نے کہا کہ ان کو گھر لے جائیں، اور ہفتے کے بعد آ کر انجکشن لے جائیں، خیر والدہ صاحبہ کا وقت پورا ہوگیا تھا ایک ہفتے کے بعد وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ میری زندگی کا بہت ہی افسردہ لمحہ تھا جب میں اپنی والدہ کی شفقت بھری ممتا سے محروم ہوگیا۔ میرے پاس سب کچھ تھا لیکن ماں کی محبت نہ رہی، اللہ تعالیٰ میری والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

والدہ کی اس بیماری سے مجھے تجربہ ہوا کہ کس طرح پاکستان میں ہسپتالوں میں غریبوں کو لوٹا جاتا ہے۔ اور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ڈاکٹروں کے دلوں میں رحم اور ترس نام کی کوئی چیز نہیں، اللہ ان کو ہدایت دے۔

پلاٹ کی رجسٹری

میں نے میر پور میں ایک پلاٹ ایک جج صاحب کے کلرک سے خریدا تھا جو وہاں کا رہائیشی نہیں تھا۔ اس نے 1964ء میں یہ پلاٹ الاٹ کروایا تھا میں نے اسے اپنے نام رجسٹر کروانا چاہا تو سٹام پیپرز لے کر دفتر گیا اور ان سے کہا کہ میں یہ پلاٹ اپنے نام کروانا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے اگر وہ آدمی ہمارے سامنے بیان دے دے تو ہم

آپ کے نام پر کر دیں گے۔ دراصل یہ بہانہ تھا مال بنانے اور بلیک میل کرنے کا، کیونکہ جن لوگوں نے بیان حلفی پر پلاٹ فروخت کئے تھے ان سے وہ پلاٹ کی نصف قیمت مانگتے تھے نام کروانے کے لئے۔ بلدیہ والوں کو یہ معلوم تھا کہ جو لوگ انگلینڈ سے آتے ہیں ان کے پاس وقت اتنا نہیں ہوتا، وہاں ان کے بزنس ہیں، بچے سکول جاتے ہیں، مکانوں کی قسطیں ادا کرنی ہوتی ہیں، گیس، بجلی کے بل، کونسل ٹیکس۔ یہ کہاں یہاں ٹکنے والے ہیں کچھ دیر رہ کر چلے جائیں گے، اس لئے وہ تمام مسئلوں کا حل بھی خود ہیں۔ میں نے جب ان سے اپنے مسئلے کا حل پوچھا تو کہنے لگے کہ اگر ہم اخبار میں اشتہار دیں گے تو اسے کوئی پڑھتا نہیں ہے آپ ہماری خدمت کر دیں تو آپ کا کام ہو جائے گا۔ مجھے گوجرانوالہ کا تجربہ تھا اس لئے میں نے پوچھا کہ کتنی خدمت ہوگی؟ انہوں نے کہا کہ زیادہ نہیں بس چار ہزار، میں نے کہا ٹھیک ہے۔ آگے فائل چلی تو مجھے اسسٹنٹ آفیسر سے ملایا گیا انہوں نے کہا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے مجھے ہر مہینے اپنے سے اوپر والوں کو بھی حصہ دینا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ 35000 روپے دے کر وہ پلاٹ میں نے اپنے والد صاحب کے نام رجسٹر کروا دیا۔

انگلینڈ واپسی سے قبل میں نے فیملی کے ساتھ لاہور بادشاہی مسجد، اور شاہی قلعہ کی سیر کی جہاں ہم نے نشیؤں کے ایک گروپ کو بھی دیکھا جو دبلے پتلے تھے اور ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

پھر مینار پاکستان گئے وہاں پر میں نے ایک ٹھیلے والے کو محنت مزدوری کرتے ہوئے اور دوسری طرف ایک موٹا تازہ آدمی کو ایک بچے کے ذریعے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو سوچا کہ یہاں سے روزانہ پولیس والوں اور حکومتی کارندوں کا گزر ہوتا ہوگا لیکن وہ اس آدمی کو اس بچے پر اس طرح ظلم کرنے سے کیوں نہیں روکتے، کیا ان کے سینوں میں دل نہیں؟ اس وقت سے میں سوچتا رہتا ہوں کہ اس طرح کے بیشمار بچوں کی کس طرح مدد کی

جائے۔اور آج جب میڈیا اور سوشل میڈیا پر دیکھتا ہوں تو حالات اس سے بھی بدتر نظر آتے ہیں۔بڑے بڑے بنگلوں والوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ملازم رکھا ہوا ہے،ان پرظلم کیا جاتا ہے،جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے،ذرا ذرا سی باتوں پر انہیں مارا جاتا ہے، لیکن ان کے والدین خوش ہیں کہ وہ چار پیسے لے کر گھر آتے ہیں۔جب کہ یہ ان کے سکول جانے اور کھیل کود کی عمر ہوتی ہے۔یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ ان کی پرورش بہتر طریقے سے کریں ورنہ کل قیامت کے دن ان کو جواب دینا پڑے گا۔

2010ء میں پاکستان کا سفر

جب میں 2010ء میں پاکستان گیا تو دیکھا کہ میرپور شہر کی آبادی کافی بڑھ گئی ہے،لیکن اس کے باوجود کچھ پلاٹ خالی پڑے ہوئے تھے جن میں سے بعض پر پنجاب اور کے،پی،کے سے آئے ہوئے مزدوروں نے عارضی چھپر بنائے ہوئے تھے، جن میں انہوں نے مال مویشی بھی ساتھ ہی رکھے ہوئے تھے۔اور جو خالی تھے ان میں پورے محلے کا کچرا پڑا ہوا تھا،جس کی وجہ سے ہر طرف بدبو پھیلی ہوئی تھی،مکّھی اور مچھروں کا راج تھا،لیکن افسوس کہ کسی کو کوئی فکر نہیں۔نہ بلدیہ والے صفائی کر رہے ہیں،اور نہ ہی کمشنر اور محکمہ صحت والوں کو کوئی فکر۔جب کہ اس کی وجہ سے کئی طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ لوگوں کو خود بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں،حالانکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے،لیکن اس پر عمل نہیں ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ایک دفعہ ایک پاکستانی یہاں انگلینڈ آیا تو یہاں کی صفائی کے انتظام سے وہ بڑا متأثر ہوا،اس لئے کہ یہاں تو کونسل کی طرف سے باقاعدہ صفائی کا انتظام ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہم پاکستانیوں نے یہاں پر بھی اپنی شناخت باقی رکھی ہوئی ہے،فٹ پاتھوں اور اور گھروں کے سامنے کچرے کے ڈھیر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ

پاکستانیوں کا علاقہ ہے۔ خیر اس آدمی نے واپس جا کر میر پور میں لوگوں کو اس کام پر آمادہ کیا اور خود اس کے لئے کوشش کی تو بہت کم لوگوں نے اس کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ میں نے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے لیکن بخدا! جو گندگی میں نے اپنے ملک میں دیکھی ہے کہیں نہیں دیکھی، حالانکہ ہمارا آزاد کشمیر کا تو ترانہ ہی یہ ہے: "باغوں اور بہاروں والا"۔

اللہ کے بندو! باغ نہیں لگا سکتے اس لئے کہ اس کے لئے محنت کی ضرورت ہے، کم از کم گندگی تو مت ڈالو۔

اپنے اس قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ میر پور میں لوڈ شیڈنگ کا بہت بڑا مسئلہ ہے، لوگ جمہوری حکومتوں کو گالیاں تو دیتے ہیں لیکن آمر مشرف جس نے دس بارہ سال لگائے لیکن بجلی کا کوئی کارخانہ نہیں بنایا۔

میر پور میں مکان بنانے کا فیصلہ

بہر حال: میں نے اس سفر میں اپنا مکان بنانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے 1966ء میں بھی مکان بنایا تھا جو کہ والد صاحب کے نام تھا، ان کی زندگی میں تو ہم بھائیوں میں سے جس کی مرضی ہوتی وہ جا کر وہاں رہتا تھا۔ ہم تین بھائی تھے مکان ایک تھا۔ اگرچہ اس مکان پر محنت اور پیسہ سب سے زیادہ میرا لگا تھا لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد رشتہ داروں نے بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ آپ کو پلاٹ دے دیتے ہیں۔ جب کہ فیصلہ ہم بھائیوں کو آپس میں کرنا چاہئے تھا۔ خیر میں نے وہ فیصلہ مان لیا، اور اس پلاٹ پر مکان بنانے کا فیصلہ کیا، اور جناب اعجاز بھٹی صاحب کو ٹھیکہ دے کر واپس برطانیہ آ گیا، انہوں نے دو سال میں مکان مکمل کر دیا، مگر میں اپنی بیماری کی وجہ سے تین سال بعد 2013ء میں فیملی کے ساتھ پاکستان گیا، میں نے بھٹی صاحب کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے بہت اچھا کام کروایا تھا، ورنہ پاکستان میں 70، 80 فیصد کام بھی ٹھیک ہو جائے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ بھٹی صاحب

سے بیٹھ کر حساب و کتاب کیا ،انہوں نے بڑی ایمان داری سے ہر چیز کو سامنے رکھا اور ہمارے تمام معاملات بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گئے ،آج تک وہی میرے مکان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

بظاہر تو میں نے یہ حماقت کر لی ہے معلوم نہیں کہ میری اولاد کیا کرے گی؟ اس لئے کہ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے لئے پاکستان جانا مشکل ہے،اسے فروخت کر دیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ جب پاکستان جاؤں تو در در کی ٹھوکریں کھاؤں ، ہاں یہ ضرور لگتا ہے کہ ہم انگلینڈ والوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

اس سفر میں میری فیملی بھی میرے ساتھ تھی، میں نے اس سفر میں وہاں کے دوکانداروں کا ایک عجیب رویہ دیکھا۔ہمارے بچے یہاں برطانیہ کی دوکانداری کے اصولوں کے عادی ہیں، جہاں دوکان پر جا کر وہ چیزیں دیکھنے کے بعد اگر پسند آئیں تو لے لیتے ہیں ورنہ نہیں ، لیکن وہاں دوکاندار اوّل تو عورتوں کو سر سے پاؤں تک گھور گھور کر دیکھیں گے ،کوئی شرم محسوس نہیں کریں گے، اور پھر زبردستی چیزیں تھوپنے کی کوشش کریں گے چاہے وہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو۔پھر اگر کوئی چیز 10 روپے کی ہوگی تو اس کے پچاس مانگیں گے،اور 25،30 تک دے دیں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ قانون نام کی کوئی چیز نہیں ، ہر ایک کا اپنا قانون ہے، دنیا میں سب سے بری ڈرائیونگ پاکستان میں ہے،رشوت دے کر لائیسنس بنا لیا جاتا ہے، لیکن ٹریفک قوانین کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا، ہر آدمی لالچ میں مبتلا ہے کام کوئی نہیں کرنا چاہتا۔جس کا جتنا بس چلتا ہے وہ بے ایمانی ضرور کرتا ہے، اور پھر کہا جاتا ہے کہ حکمران ٹھیک نہیں ہیں۔ جب تک عوام ٹھیک نہیں ہو گی تو فرشتہ بھی حکمران بن جائے حالات سدھر نہیں سکتے۔ جب تک چوکیدار سے لے کر جج اور جرنیل تک کا احتساب نہیں ہو

گا معاملات ٹھیک نہیں ہوں گے۔

ہمارے آزاد کشمیر کے حکمرانوں کا تو زیادہ وقت انگلینڈ میں دعوتیں کھانے میں گزر جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ فل ٹائم یہاں تشریف لے آئیں اور وہاں کی حکومت ہمارے سپرد کر دئیں، ویسے بھی ہمارے بچے پڑھ لکھ گئے ہیں، اور اچھے لیڈر بن گئے ہیں، پھر دیکھیں کیسے سارا نظام درست ہوتا ہے۔ شائد کچھ لوگوں کو یہ مذاق معلوم ہو لیکن کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہمارے یہ حکمران ہمارے ساتھ کس طرح کا مذاق کر رہے ہیں ہر روز یہاں آئے ہوئے ہوتے ہیں بڑے بڑے جلسے، دعوتیں، اور چندے بٹور کر چلے جاتے ہیں، اور ہم خوامخواہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، ان تمام سیاسی جماعتوں پر یہاں پابندی لگنی چاہئے جن کی وجہ سے ہمارے درمیان نفرتیں پیدا ہوتی ہیں۔

ہمیں یہاں رہنا ہے، آپس میں رشتہ داریاں کرنی ہیں، ویسے بھی اب بچے پاکستان سے شادی نہیں کرنا چاہتے، ایک تو مزاج نہیں ملتا، دوسرا وہاں سے منگوانا مشکل ہے، اور تیسرا کوئی آ بھی جائے تو پیچھے سے خاندان کی اتنی ڈیمانڈ ہوتی ہے کہ یہاں ان کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، ان کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہاں ان کے کتنے اخراجات ہیں۔ شکر نہیں کرتے کہ ان کا کوئی بچہ یا بچّی یہاں سیٹل ہو کر اچھی زندگی گزار رہا ہے، لیکن ان کی سوچ ایسی نہیں ہوتی۔ جب یہ سیاست دان یہاں آتے ہیں تو ان کی وجہ سے ہمارے لئے بہت سی مشکلات بن جاتی ہیں۔

میرا 2018ء کا مشاھدہ

2018ء میں میں جب پاکستان گیا تو دیکھا کہ میر پور میں بڑی بڑی دوکانیں پاکستانیوں کی ہیں جو پنجاب یا KPK سے آئے ہوئے ہیں۔ میر پور کے مقامی لوگ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ سڑکیں بنانے والے بھی مقامی ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ وہ کام بھی KPK

والوں کے پاس چلا گیا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ پنجاب سے آ گئے ہیں، آٹھ دس سالہ بچیاں گھروں میں کام کرتی ہیں، زیادہ تر عورتیں کہتی ہیں کہ اُن کے خاوند بیمار ہیں۔ خاوندوں کی بیماری کا بہانہ بنا کر مدد مانگتی ہیں اور اس طرح چالیس، پچاس ہزار روپے مہینے کے بنا لیتی ہیں۔ جن لوگوں نے چھوٹے بچوں کو ملازم رکھا ہوا ہے ان میں سے اکثریت سرکاری ملازمین کی ہے ان کو احساس ہونا چاہئے کہ یہ بچے بھی انسان ہیں۔ یہ ان کے پڑھنے لکھنے کا زمانہ ہے، دنیا کا کوئی قانون ان سے کام کروانے کی اجازت نہیں دیتا، آخر ان کو کون انصاف دلائے گا۔

یہاں ایک اور اہم چیز بتا تا چلوں کہ ہمارے ہاں ملازم رکھنے کا رجحان بہت ہو گیا ہے، ایک تو لوگ سست ہو گئے ہیں، اور دوسرے لوگوں پر رعب جمانے کے لئے کہ ہم نے ملازم رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہاں برطانیہ میں ہم سب اپنا کام خود کرتے ہیں، اور نہ ہی ہم اس کو افورڈ کر سکتے ہیں کہ دس پونڈ فی گھنٹہ کے حساب سے کسی کو ملازم رکھیں۔

یہاں تو وزیر اعظم بھی اپنے گھر کا کام خود کرتا ہے، اور اس میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتا، اور یہی چیز ہمارے دین نے ہمیں سکھائی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنا کام خود کرتے تھے، اور دوسروں سے مدد لینے کو معیوب سمجھتے تھے۔

منگلا ڈیم اپ ریزنگ

1966ء میں جب منگلا ڈیم بنا تو اس میں پانی کا لیول 1210 فٹ رکھا گیا۔ لیکن گنجائش 1270 فٹ رکھی گئی اور اس کے لئے نشانات بھی لگا دئے گئے۔ حکومت نے معاوضہ بھی صرف 1210 تک ادا کئے، اس لئے اکثر لوگ اس کے بعد آباد ہونا شروع ہو گئے، اور اکثر دیہاتوں کے لوگ 1270 کی حدود میں ہی دوبارہ آباد ہو گئے۔ بہت سے وہ لوگ جو انگلینڈ میں آباد تھے انہوں نے بھی کروڑوں روپے لگا کر وہاں مکانات

بنائے ،سب کے ذہن میں تھا کہ حکومت اب مزید اپ ریز نگ نہیں کرے گی ،لیکن ایسا نہ ہوا حکومت پاکستان نے دوبارہ اپ ریز نگ کا فیصلہ کرلیا،جس کی وجہ سے میر پور والوں کو ایک مرتبہ پھر اجڑنا پڑا،حکومت نے سابقہ متأثرین کو بھی دو دو لاکھ روپے معاوضہ دینے کا فیصلہ کیا۔

معاوضہ وصول کرنے والوں میں سے بہت سے لوگ انگلینڈ میں آباد تھے جن کو معاوضہ وصول کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا،اور تقسیم کرنے میں بھی،اس لئے کہ اس وقت تک تین نسلیں گزر چکی تھیں جس کی وجہ سے ناراضگیاں خاندانوں کے اندر پیدا ہوئیں۔لوگوں نے معاوضے لے لئے لیکن وہ وہاں سے نکلنے کے لئے تیار نہیں تھے۔اس کی وجہ ان کے دل کے اندر اس امید کا پایا جانا تھا کہ شائد حکومت پانی نہیں چھوڑے گی۔

حکومت کے بار بار وارننگ دینے کے باوجود کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ بالآخر حکومت نے ڈیم میں پانی بھرنا شروع کر دیا،اور پانی لوگوں کے گھروں میں داخل ہونا شروع ہوا تو تب انہیں یقین ہوا،اور وہ بے یار ومددگار اپنے گھروں سے نکلے،اور رشتہ داروں کے گھروں میں یا کرایہ کے مکانات میں منتقل ہوئے۔کئی کئی فیملیاں ایک ایک گھر میں رہنے پر مجبور ہوئیں۔

آج بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو ٹھوکریں کھا رہے ہیں،اور کچھ 1270 کی حدود میں آباد ہوکر دوبارہ وہی غلطی دھرا رہے ہیں جو پہلی مرتبہ ڈیم بننے کے وقت کی تھی۔

پہلے منگلا ڈیم میر پور شہر سے کافی دور تھا اور میر پور شہر کے اونچائی پہ واقع ہو جانے کی وجہ سے شہر کا پانی اور گند ڈیم میں چلا جاتا تھا،اور شہر کی صفائی خود بخود ہو جاتی تھی۔لیکن دوبارہ اپ ریز نگ کی وجہ سے چتر پڑی سے لے کر جڑی کس تک بائی پاس بنایا گیا۔ یہ بائی پاس ڈیک کے اوپر بنایا گیا ہے جو ڈیم کے ساتھ ساتھ ہے۔میں نے نوٹ کیا

کہ اب شہر کا سارا پانی اور گند اس ڈیک کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے۔

میں نے خود دیکھا کہ سنگوٹ، کھمبال، پھلوٹ اور دوسرے سیکٹروں میں جو ڈیم کے ساتھ ساتھ ہیں، گندے پانی کے بڑے بڑے تالاب بنے ہوئے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے بڑے منصوبے میں شہر کی گندگی کو صاف کرنے کا کوئی پلان موجود نہیں ہے۔ سیورج کا باقاعدہ انتظام نہیں ہے، ڈیم کے اوپر حفاظتی دیوار بھی چھوٹی بنائی گئی ہے جو کہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے وہ ڈیم کے اندر گندگی پھینک دیتا ہے۔ بالکل ڈیم کے اندر اب ہوٹل بن رہے ہیں۔

ہمارے یہاں برطانیہ کے شہر شفیلڈ میں ایک چھوٹا سا ڈیم ہے اس کی اتنی بڑی دیوار ہے کہ کوئی اس کو پھلانگ نہیں سکتا۔ اب ہمارا بھی اور ڈیم کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔

میری معاشی سرگرمیاں

محبت علی اپنی ٹیکسی کے ساتھ

1961ء میں برطانیہ آنے کے بعد میں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک مزدور کی حیثیت سے کیا تھا۔ 1976ء تک مزدوری ہی چلتی رہی اس دوران پاکستان بھی جانا ہوا۔

ٹیکسی کا کام

1976ء میں میں نے ٹیکسی لے لی اور مزدور سے خود روزگار ہو گیا۔ ٹیکسی بظاہر تو آسان کام لگتا ہے لیکن یقین جانئے اتنا آسان کام نہیں جتنا دکھتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ اگر زیادہ پیسے کمانا چاہتے ہیں تو راتیں لگانا پڑیں گی۔ پھر ہر سال ٹیکسی کا ٹیسٹ بھی دینا پڑتا ہے۔ اس میں ٹیکسی کو پورا چیک کرتے ہیں، کوئی چھوٹی موٹی غلطی بھی نکل آئے تو فیل کر دیتے ہیں۔ پیسے اور وقت دونوں کا ضیاع ہو سکتا ہے۔

فیکٹری میں تو پیسے اچھے بنتے تھے لیکن جب ہمارے لوگوں کو پتہ چلا کہ ٹیکسی میں بھی اچھی خاصی آمدنی ہے اور ٹائم بھی فلیکسی ایبل (Flaxiable) ہے تو بہت سے لوگ اس طرف آنے شروع ہو گئے۔ شفیلڈ میں سب سے پہلے 1972ء میں کسی پاکستانی نے ٹیکسی شروع کی، اور جب اس نے اپنے دوسرے دوستوں کو بتایا کہ ادھر بھی مال بہت ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے اگلے دس سال میں آدھے ٹیکسی ڈرائیور ہمارے ہو گئے۔

خیر میں نے بھی ٹیکسی شروع کر دی اور میں نے خواجہ عبدالرزاق صاحب سے 4500 پونڈ میں ایک سال پرانی ٹیکسی خرید لی۔اب میری اپنی مرضی تھی کہ کب کام شروع کروں اور کب ختم کروں میرے اوپر کوئی فورمین نہیں تھا اور نہ کوئی منیجر، نہ اور ٹائم کا چکر، جتنا چاہوں کام کروں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اللہ کی کرنی یہ ہوئی کہ ابھی ٹیکسی کا کام شروع کئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ رات کے چار بجے میں ایک سواری کو لے کر نوٹنگھم جار ہا تھا کہ راستے میں ایک وین والے نے میری گاڑی کو پیچھے سے ایک زوردار ٹکر ماردی، میری گاڑی الٹ گئی ، اور میرے آگے بالکل اندھیرا چھا گیا،تھوڑی دیر میں جب حواس بحال ہوئے تو گاڑی سے باہر آیا۔الحمدللہ میں بالکل ٹھیک تھا،اپنی سواری سے خیریت پوچھی تو اس نے بھی بتایا کہ میں ٹھیک ہوں ۔لیکن جب وین ڈرائیور کو دیکھا تو اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور بولنے کے قابل نہیں تھا۔اتنے میں ایک ٹرک والا آ کر رکا اور اس نے خیریت دریافت کی تو ہم نے وین ڈرائیور کے بارے میں بتایا،اس وقت موبائیل کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔اس نے اپنے ٹرک میں موجود وائیرلس فون کے ذریعے پولیس کو اطلاع دی جو فوراً آ گئی ، اسی اثناء میں ایمبولینس بھی آ گئی اور وین ڈرائیور کو ہسپتال لے گئے۔مجھے پولیس سٹیشن لے گئے اور بیان وغیرہ ریکارڈ کیا، اور پوچھا کہ کوئی ایسا بندہ ہے جو آپ کو لے جائے میں نے اپنے بھائی سلطان کا بتایا، پھر وہ آئے اور مجھے ساتھ لے گئے۔

میری ٹیکسی بالکل ختم ہو چکی تھی ،لیکن الحمدللہ انشورنس کروائی ہوئی تھی تو اس کی رقم مل گئی پھر 1976 ماڈل کی نئی ٹیکسی خرید لی،شروع شروع میں مشکلات پیش آئیں لیکن دن بدن نئے ایریا کا پتہ چلتا جاتا اور مجھے اس کام کی جانکاری حاصل ہوتی رہی۔

ٹیکسی اونر ایسوسی ایشن کی چیئر مینی

شفیلڈ میں اس وقت کل (210) ٹیکسی تھیں جس میں آدھے انگریز اور آدھے ایشین تھے۔ 1984ء میں میرے دوستوں اور رشتہ داروں نے کہا کہ کیوں نہ ہم آپ کو ٹیکسی اونر ایسوسی ایشن کا چیئر مین بنا دیں۔ کیونکہ اس وقت نصف انگریز ڈرائیور تھے، اصول یہ تھا کہ اگر چیئر مین پاکستانی ہو تو سیکرٹری انگریز ہوگا، بہر حال میں T.O.A کا چیئر مین بن گیا۔ میں اس وقت ایتھنک مینارٹی (Ethnic minority) کے پولیس پینل کا ممبر بھی تھا، اور مکی مسجد کا سیکرٹری بھی تو اس وجہ سے پولیس کے ساتھ اکثر میٹنگ ہوتی رہتی تھیں۔ میں نے پولیس کو شکایت کی کہ رات کو جب ہمارے رینک میں آدمی زیادہ ہو جاتے ہیں تو پرائیویٹ ہائیر (Private Hire) والے ہماری سواریاں اٹھانا شروع کر دیتے ہیں ،آپ رینک میں ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا دیں تا کہ بلیک کیپ (Black cabs) والوں کے ساتھ زیادتی نہ ہو، اور پھر انہوں نے ایسا ہی کیا جو کہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

کام اچھے طریقے سے چل رہا تھا مگر پھر کچھ لوگوں کے پیٹ میں درد ہوا اور کہنے لگے کہ چیئر مین صاحب کام صحیح نہیں کر رہے چنانچہ انہوں نے عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرانے کی کوشش کی۔ مجھے یاد ہے کہ یکم اگست 1984ء کو ہماری میٹنگ تھی جس میں انہوں نے کہا کہ ہم محبت علی کو چیئر مین نہیں چاہتے اس کے بجائے کسی اور کو چیئر مین بنایا جائے لیکن میرے ساتھ سیکرٹری مسٹر جان اور مسٹر ڈیوڈ نے کہا کہ مسٹر علی بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے، اگر مسٹر علی جائے گا تو ہم بھی نہیں رہیں گے آپ پھر پوری نئی ٹیم لے کر آ جائیں، تو اس پر مخالفین اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔

خیر میں نے اپنا سال مکمل کیا، یہ کوئی تنخواہ والا عہدہ نہیں تھا، میں اپنا وقت نکال کر

یہ کام کرتا تھا لیکن اس کے باوجود میری مخالفت کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مخالفت اس کی کی جاتی ہے جو کام کرتا ہے اور ہماری پاکستانی کمیونٹی میں یہ بیماری ہے کہ کام کرنے والوں کی ٹانگیں کھینچی جاتی ہیں، اور مخالفت برائے اصلاح کے بجائے مخالفت برائے مخالفت ہوتی ہے۔ میرے مخالفین کو اگلے سال خود اس الیکشن میں حصہ لینا چاہیئے تھا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا صرف میری مخالفت مقصود تھی، خدارا ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیئے اگر آپ خود کوئی کام نہیں کر سکتے اور کوئی دوسرا کر رہا ہو تو اس کے راستے میں روڑے مت اٹکائیں۔

ٹیکسی چھوڑنے کی وجہ

لیکن میں اس کام سے زیادہ خوش نہیں تھا اس کی ایک وجہ تو پیسہ بنانے کے لئے راتوں کو کام کرنا پڑتا تھا، جو کہ ایک سوشل لائف گزارنے والے آدمی کے لئے مشکل ہے کہ دن کو سویا رہے اور رات کو کام کرنا پڑے، اس لئے کہ اگر کسی خوشی یا غمی میں یا رفاہی کام میں دن میں شریک ہو تو رات کو پھر کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر رات کو کام کریں تو پھر سوشل لائف چھوڑنی پڑے گی۔ دوسری وجہ رات کے وقت مسافروں کی اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کلبوں سے نکلتے ہیں اور نشے میں غرق ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات لڑائی جھگڑے کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ مجھے رات کو کام کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے اکثر شادی بیاہ، یا دوستوں رشتہ داروں کی مجلس میں بیٹھے بیٹھے میں سو جاتا یا مشکل سے بیٹھتا۔ ان حالات میں ہر وقت اللہ سے دعاء کرتا کہ یا اللہ مجھے اس سے کوئی بہتر روزگار عطا فرما۔

یہاں ایک بات اور لکھ دوں کہ ٹیکسی کے حوالے سے یہ میرا ذاتی تجربہ تھا ورنہ ٹیکسی میں بہت سے فائدے بھی ہیں مثلاً: آپ کی ذاتی سواری ہے جس پر آپ ذاتی کام بھی کر سکتے ہیں، آپ کسی کے ملازم نہیں ہوتے اپنی مرضی سے کام شروع اور ختم کر سکتے ہیں کہیں جانا چاہیں تو چھٹی کی ضرورت نہیں پڑتی بس ٹکٹ لیں اور چلے جائیں، نماز کے

اوقات میں جہاں چاہیں باجماعت نماز ادا کر لیں، جب کہ دیگر ملازمتوں میں یہ آپ نہیں کر سکتے۔

بزنس کا آغاز

ہائی فیلڈ بلڈنگ

پھر 1985ء میں اللہ نے میری یہ دعا سن لی اور میں نے ایک دوکان لے لی، اور ٹیکسی ڈرائیور سے بزنس مین بن گیا۔ جب میں نے بلیک کیپ (Black cabs یعنی لندن ٹیکسی) کی ایجنسی لینا چاہی تو مجھے کہا گیا کہ پہلے گیرج لیں پھر ایجنسی ملے گی۔ چنانچہ میں نے ایک بڑی بلڈنگ لے لی اور میرے پاس تین بزنس ہو گئے، ایک سپیئر پارٹس کی، دوسری ہول سیل کی، اور تیسرا گیرج۔ کار پارٹس کا مشورہ میرے ایک دوست محمد امین نے دیا جن کا تعلق بریڈ فورڈ سے تھا میں نے جب ان سے دوکانداری کرنے کا مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ کام شروع کرو میں تمہاری مدد کروں گا۔ اس وقت سرمایہ اتنا نہیں تھا لیکن اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا اور اللہ نے اس میں خوب برکت عطا فرمائی۔

اُس وقت آٹھ دس ہزار پاؤنڈ بہت بڑی بات تھی لیکن اس سے بھی کام نہ بنا تو مکان پر قرضہ لیا اور کام شروع کر دیا۔ زیادہ فوکس میں نے لندن ٹیکسی کے پارٹس پر رکھا اور اس کے سو فیصد پارٹس رکھنے شروع کر دیئے اور باقی کاروں کے پارٹس ضرورت کے مطابق رکھے۔

شفیلڈ میں اس وقت تقریباً 250 کے لگ بھگ ٹیکسی تھی۔آدھی اپنے لوگوں کی تھیں، اوران میں میرے دوست اور رشتہ دار بہت زیادہ تھے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اگر ان لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کیا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا،لیکن میں جن کو زیادہ دوست سمجھتا تھا وہ کبھی زندگی میں میرے پاس نہیں آئے ،اور کچھ آئے بھی اورانہوں نے مدد بھی کی، اور کچھ اُدھار کر کے چلے جاتے جو میرے لئے مشکل کھڑی کر دیتا، جب مطالبہ کرتا تو آگے سے ہزار باتیں سننی پڑتیں۔ مجھے تو کمپنی کو ٹائم پر ادائیگی کرنی ہوتی تھی۔کچھ لوگ تو چھے ماہ یا سال کے بعد آتے اور کہتے کہ یہ پارٹ خراب ہے۔اورلوگوں کو بھی کہتے کہ اس کے پارٹ ٹھیک نہیں ہیں اس سے مت خریدو،لیکن جب اللہ تعالیٰ مدد کرنا چاہے تو پھر کسی کی نہیں چلتی۔

میں نے گیرج والوں کو فوکس کرتے ہوئے ہول سیل کا کام شروع کر دیا،اور اس طرح تھوڑے عرصہ میں بہت سارے گیرج والے میرے کسٹمر بن گئے۔ان میں سے ایک انگریز جس کا نام Jack Shaw تھا وہ سب سے بڑا کسٹمر تھا۔بہت سے لوگوں نے اُس کو مجھ سے توڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ کہتا کہ مسٹر علی بہت اچھا آدمی ہے میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔بہرحال بزنس بہت اچھے طریقے سے چلنے لگا،لیکن بزنس کا سٹریس انسان کو بیمار کر دیتا ہے،یہی میرے ساتھ ہوااور میں دل کا مریض بن گیا۔

بزنس بڑا مشکل کام ہے مال خریدنے کے لئے آپ کو ایڈوانس پیمنٹ کرنی پڑتی ہے، اگر وہ مال نہ نکلے تو وہ آپ کے کسی کام کا نہیں، اس لئے کہ آئے روز گاڑیوں کے ماڈل میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور پانچ چھے سال میں آپ کے پرانے پارٹس کی افادیت ختم ہوجاتی ہے۔

1989ء میں میرا بائی پاس ہوا ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ زیادہ کام نہ کرو، اس لئے کہ جتنا پریشر لوگے تو بیمار ہو جاؤ گے، اس لئے میں نے تین چار سال کے بعد اپنی بزنس بڑے بیٹے امجد علی کے نام کردی، اور اس کو کہا کہ بعد میں تمہارے دوسرے بھائیوں کو بھی اس میں سے حصہ دوں گا۔ میری نگرانی میں اس نے کام شروع کردیا اور 1997ء میں ایک بڑی دوکان لی اور وہاں سے لندن ٹیکسی کی ایجنسی اور کار پارٹس ہول سیل میں دینے شروع کردیئے اور یوں ہمارا بزنس بہت پھیل گیا۔

امجد انگریزی اچھی بولتا تھا، پڑھنے لکھنے میں بھی مجھ سے اچھا تھا اور لوگوں سے ڈیل بھی اچھی کرتا تھا، پھر میرا دوسرا بیٹا بھی جوان ہوگیا اور 2005ء میں اس نے بھی کام شروع کردیا، ہم تقریباً دوسو دوکانوں پر سامان دیتے تھے، وہ یہ سامان مختلف جگہوں پر ڈیلور کرتا تھا، اس طرح ہمارے بزنس نے خوب ترقی کی۔

2012ء میں جب مجھے دل کی تکلیف زیادہ ہوئی تو میں نے سوچا کہ اپنی زندگی میں دوکانوں کو اسی طرح اپنی اولاد میں تقسیم کردوں جس طرح ہم پاکستان میں برابر حصہ کرتے ہیں، چنانچہ میں نے بڑی کمپنی اپنے دولڑکوں ماجد علی اور واجد علی کو دی۔ اور اُن سے میں نے کہا کہ تم بزنس چلاؤ اور یہ دوکان سب فیملی کی ہے اس لئے سب اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ میرے تین بیٹوں میں سے سب سے بڑے بیٹے امجد کو جو سب سے زیادہ بزنس کو سمجھنے والا ہے اس کو میں نے دوسری دوکان دے دی۔ اور ساتھ ہی میں نے سب کو

نصیحت کی کہ سب بھائی مل جل کر کام کریں۔

لیکن جب بزنس بیٹوں کے نام ہوئی تو بعض لوگوں نے میرے منجھلے بیٹے کو میرے خلاف ورغلایا کہ تمہارے والد نے تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں کیا، حالانکہ وہ میرا سب سے لاڈلا بیٹا تھا۔ اس کو میں ہر سال نئی گاڑی لے کر دیتا تھا، اُس کو میں نے دوکان دی مکان بھی لے کر دیا، جبکہ اصولاً اس دوکان کا حق دار بڑا بیٹا تھا، لیکن میرے بڑے بیٹے نے کبھی اس کی شکایت نہیں کی۔

میں سوچتا تھا کہ جس طرح امجد میری سنتا ہے یہ بھی میرا تابعدار ہوگا، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ کرتے کراتے امجد کے پاس کوئی کام نہ رہا، اس نے زندگی میں کسی کی ملازمت نہیں کی تھی اس لئے اُس کے لئے بہت مشکل ہوگئی اور وہ ڈپریشن کا شکار ہوگیا، اور پھر اُسے ہارٹ کی تکلیف بھی ہوگئی اور آپریشن کرانا پڑا۔

چھوٹا بیٹا واجد علی جو وکیل ہے اس نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ مجھے دوکان کی ضرورت نہیں آپ نے زبردستی میرے نام کر دی، میں وکیل ہوں، اور دوکان سے مجھے کبھی قسط ملتی ہے کبھی نہیں ملتی، کبھی کوئی اور ایسی حرکت ہوتی ہے جس سے میرے لئے مشکل بن جاتی ہے۔ وہ بھی اس وجہ سے کمزوری کا شکار ہوگیا۔

میں نے اپنے منجھلے بیٹے کو بہت سمجھایا کہ ایسا نہ کرو مگر اس نے میری نہ سنی اور لوگوں کے کہنے پر لاکھوں کی بزنس کو ڈاؤن کر دیا۔ جب میں نے دیکھا کہ کمپنی بالکل ختم ہونے کو ہے تو کورٹ میں کیس کر دیا کہ اس کمپنی کا آدھا حصہ اس کا ہے اور آدھا اس کے دوسرے بھائی کا۔ کورٹ نے فیصلہ دیا کہ آدھا حصہ اپنے بھائی کو دو، لیکن وہ کہتا ہے کہ میرے پاس رقم ہی نہیں ہے، بینک بھی اُس کو قرض دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یعنی اب اس کے پاس دوکان نہ ہونے کے برابر ہے، اور والدین، بہن بھائی بھی ناراض ہیں، اور

اللہ کی ناراضگی الگ۔

اس لئے میں سب کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی جائداد سب کو علیٰحدہ علیٰحدہ ان کے کام کے مطابق دیں۔ پاکستان والا معاملہ یہاں نہیں چلتا، جو جس کے نام ہوگا وہ اسی کا ہوگا، سب لوگ میرے بیٹے امجد کی طرح نہیں ہو سکتے۔ ماجد کے رشتہ داروں کی لالچ کی وجہ سے میرے پورے خاندان کی محنت اور سکون تباہ و برباد ہو گیا۔ اور اس کا اثر اگلی نسل پر بھی پڑے گا۔ میرے پوتے پوتیاں تو ابھی چھوٹے ہیں، لیکن جب بڑے ہوں گے تو ان کو پھر اس بات کا احساس ہوگا کہ ان کا خیرخواہ کون تھا۔
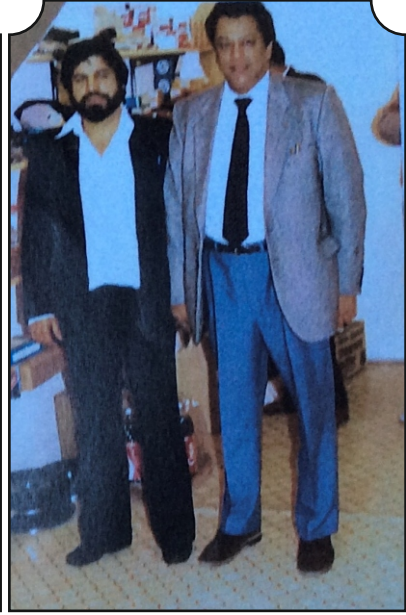
محبت علی اور ڈاکٹر قمرالزمان

میری پہلی بزنس 1985ء

چوہدری ولائت اور لارڈ میئر بزنس کے افتتاح کے موقعہ پر 1998

پاکستان کی طرف زمینی سفر کی روائیداد

یوں تو میں نے زندگی میں بہت سے سفر کئے ہیں اور ان کی روائیداد بھی آپ کو سناؤں گا لیکن میری زندگی کا سب سے انوکھا اور سبق آموز سفر وہ ہے جو میں نے پاکستان کی طرف اپنی وین پر کیا، یہ وہ سفر ہے جس کو میں زندگی میں کبھی بھول نہیں سکتا ہوں۔ یہ ستمبر 1978ء کی بات ہے جب ہم چار ساتھیوں نے شفیلڈ سے بذریعہ روڈ پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ ایک وین میں چلا رہا تھا، دوسری میں برخوردار حبیب اپنی فیملی کے ساتھ سوار تھے تیسری میں جناب عیسیٰ خان اور ان کا بھانجا، اور چوتھی میں صابر حسین صاحب سوار تھے۔ یہاں انگلینڈ سے فیری پر سوار ہونے کے لئے ہول کی طرف روانہ ہوئے اور شام کے وقت فیری پر سوار ہوئے، پوری رات سفر کرتے ہوئے اگلی صبح بلجئیم (جو کہ یورپ کا ایک چھوٹا لیکن بہت خوبصورت ملک ہے) پہنچ گئے۔ یہ ملک انگلینڈ کی بہ نسبت غریب ہے لیکن ان کا رہن سہن بہت اچھا ہے۔

وہاں سے چار گھنٹے سفر کرنے کے بعد جرمنی میں داخل ہو گئے۔ یہ بھی بہت صاف ستھرا ملک ہے، سڑکوں کی حالت بہت اچھی ہے۔ لوگ بڑے سمارٹ ہیں۔ بہر حال ہم نے وہاں رکے بغیر سفر جاری رکھا جس کی وجہ سے کسی سے بات چیت کا موقع نہیں ملا، رات کو جرمنی کے ایک مقام پر ہم نے پڑاؤ کیا جو مسافروں کے لئے مخصوص تھی، اور وہاں بیت الخلاء اور گرم پانی کا بندوبست بھی تھا، رات بڑی اچھی بسر کی، اور صبح کو وہاں سے آسٹریا کی طرف چل پڑے اور تقریباً ایک دو بجے کے لگ بھگ وہاں پہنچ گئے۔ وہاں جو ہم نے مختلف چیز نوٹ کی وہ سڑک کے کنارے عام درختوں کے بجائے پھل دار

درختوں کا ہونا تھا، جس میں سیب ، ناشپاتی کے درخت تھے،لوگ بھی بہت اچھے اور مدد کرنے والے تھے۔ وہاں سے نکل کر یوگوسلاویہ میں داخل ہوئے یہ اس وقت کمیونسٹ ملک تھا۔انگلش وہ جانتے نہیں تھے میری گاڑی وہاں خراب ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ گاڑی یہیں چھوڑ دوں لیکن بات نہ بنی اور میں نے اپنی گاڑی کو دوسری گاڑی کے ساتھ باندھ کر سفر جاری رکھا، یوگوسلاویہ کی سڑکیں باقی یورپ کی طرح کشادہ نہیں ہیں،اور ٹریفک بھی کافی تھی، اوراوپر سے برفباری بھی شروع ہوگئی جس کی وجہ سے سخت سردی ہوگئی۔ میری گاڑی میں ہیٹر بھی نہیں تھا، جس کی وجہ سے سردی سے براحال ہورہا تھا، اگلے ساتھی کو اپنی ضرورت کے بارے میں بتا بھی نہیں سکتا تھا، بہرحال آہستہ آہستہ کرتے کراتے دو دن میں بلغاریہ پہنچے۔ یہ ملک یوگوسلاویہ سے بھی زیادہ غریب ہے۔

یہاں سے آگے ترکی کا سفر تھا، شام کے وقت ہم نے ترکی میں داخل ہونا تھا مگر بلغاریہ والوں کے سخت قانون اور ناکوں کی وجہ سے ہمیں کافی وقت لگا، ایک گیٹ کراس کرتے تو دوسرا آجاتا، ایک جگہ تو ہم نے سمجھا کہ ہم ترکی میں داخل ہوگئے لیکن انہیں سلام کیا تو معلوم ہوا کہ ابھی بلغاریہ ہی میں ہیں ، خیر ہم ترکی میں داخل ہوئے ، وہاں ہم نے سمندر پر بنے ہوئے ایک منفرد پل کا نظارہ کیا، اس کے بعد ایک بہت اونچے پہاڑ پر چڑھنا پڑتا ہے اوراس پر چڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ آسمان نیچے رہ گیا ہے، اور پھر میدانی علاقہ شروع ہوجاتا ہے، استنبول بہت ہی سرسبز وشاداب اور قابل دید شہر ہے، اُس وقت وہاں کافی غربت تھی۔ ایک شہر جس کا نام ازروم ہے وہاں تو یہ عالم تھا کہ پٹرول، ڈیزل بھی ملنا مشکل تھا، ہم تقریباً 1500 میل کا سفر ٹوچین (Tochan) کرتے ہوئے جب ترکی پہنچے تو برخوردار حبیب نے کہا کہ اس طرح ٹوچین (Tochan) کرتے رہے تو ممکن ہے کہ میری گاڑی بھی خراب ہوجائے گی اور بڑا مسئلہ بن جائے گا، دوسرے دوساتھیوں سے

بات کی تو انہوں نے بھی معذرت کر لی اور کہا کہ گاڑی کو یہیں چھوڑیں اور ہمارے ساتھ آجائیں، مرتا کیا نہ کرتا، سامان اٹھایا ان کی وین میں رکھا اور اپنی وین ایک پرائیویٹ گیرج والے کے پاس چھوڑی اور بہت بڑی غلطی ہوئی کہ گورنمنٹ کے گیرج میں نہ چھوڑی۔

اب جب ہم ترکی سے نکل کر ایران میں داخل ہونے لگےتو بارڈر پر ترکی کے کسٹم آفیسر نے مجھے ایران داخل ہونے سے روک دیا، وجہ وہی غلطی تھی کہ گاڑی چھوڑتے وقت میں نے کوئی حکومتی لیٹر نہیں لیا تھا کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ میری گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے میں نے گورنمنٹ کے ڈپو میں چھوڑ دی ہے۔ ہم چار ساتھیوں میں سے برخوردار حبیب کے ساتھ فیملی تھی وہ جلد سے جلد پاکستان پہنچنا چاہتے تھےان کا تقاضا بھی معقول تھا،لیکن دوسرے دو ساتھیوں نے میرے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کا مجھے آج بھی گلہ ہے، انہوں نے مجھے بارڈر پر اکیلا چھوڑ دیا اور خود ایران کی طرف چل پڑے، حالانکہ راستے میں میں نے ان کی مدد بھی کی جب ان میں سے ایک ساتھی کی وین کا ریڈی ایٹر خراب ہوا تو میں نے یہ سوچ کر کہ میری گاڑی تو خراب ہے اس کا کام ہو جائے میں نے اپنی وین کا ریڈی ایٹر نکال کر اس کو دے دیا لیکن انہوں نے نہ تو میری گاڑی اپنی گاڑیوں کے ساتھ ٹوہ کی اور جب بارڈر پر گاڑی کے چھوڑنے کی وجہ سے میرے پاس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے مجھے روک لیا گیا تو انہوں نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا میں نے بھی اللہ کے بھروسے پر انہیں اللہ حافظ کہہ دیا۔

اور یہ بات یاد رکھیں کہ جب آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا تو اللہ کی ذات آپ کے ساتھ ہوتی ہے،اور وہ آپ کو طاقت دیتی ہے اور راستے کھلنے لگتے ہیں۔ خیر میں ایک کافی بار میں گیا تو مجھے ایک آدمی ملا جو انگریزی جانتا تھا، میں نے اس سے کہا کہ میں ایک

مسافر ہوں اور کسٹم والوں نے مجھے یہاں روک لیا ہے۔ اُس نے انہیں خوب برا بھلا کہا اور کہا کہ یہ لوگ ملک کا نام بدنام کرتے ہیں، پھر میں نے اس سے واپسی کا پوچھا تو اس نے کہا کہ یہاں سے ٹیکسی لو اور تقریباً دس میل کے بعد ایک شہر آئے گا وہاں سے تم بس لے لینا، اور وہ تمہیں ہرزجان پہنچا دے گی، میں نے ایسا ہی کیا اور تقریباً شام کے وقت ہرزجان پہنچ گیا۔ بارش اور برف باری ہو رہی تھی، میرے پاس زیادہ کپڑے بھی نہیں تھے۔ ایک ہوٹل میں گیا اور ان سے کمرہ مانگا تو اس نے صاف انکار کر دیا، پھر کئی اور ہوٹلوں میں گیا لیکن سب نے انکار کر دیا اور کوئی اس کے لئے تیار نہیں تھا، سردی کی وجہ سے میری جان نکل رہی تھی، اور میں سوچ رہا تھا کہ شائد سردی کی وجہ سے میری جان چلی جائے، خیر ایک ہوٹل میں گیا اور اشاروں کنایوں سے سمجھایا کہ مجھے کمرہ چاہئے اس نے بھی انکار کر دیا تو میں نے اپنی جیب سے ترکی کے لیرے نکالے اور ٹیبل پر رکھ دیئے اور کہا کہ جتنے چاہئے لے لو لیکن مجھے کمرہ دے دو۔ اب معلوم نہیں کہ ترکی لیرے دیکھ کر یا میری شکل دیکھ کر اسے ترس آ گیا اور اس نے مجھ سے کہا کچھ انتظار کرو 12 بجے تک جو لوگ کھانا کھانے آئے ہیں یہ چلے جائیں تو تمہارے لئے کوئی بندوبست کرتا ہوں، پھر اس نے چند کرسیاں جوڑ کر مجھے کمبل دیا اور میں نے رات بسر کی۔ دن کو جب کمرہ خالی ہوا تو اس نے مجھے کمرہ دے دیا۔

وہاں سے میں نے انگلینڈ اپنے بھائیوں کو فون کیا کہ میری وین خراب ہوگئی ہے اور میں اس طرح ترکی میں پھنس گیا ہوں، انہوں نے کہا کہ فکر نہ کرو، ہم یہاں سے گاڑی کے پارٹ بھیج دیتے ہیں چنانچہ انہوں نے فوراً میرے دوست حاجی محمد بوستان کو گاڑی کے پارٹ دے کر ترکی روانہ کر دیا اور کچھ رقم بھی بھیج دی، حاجی صاحب ترکی پہنچے اور دو تین دن تک قیام کرنے کے بعد واپس روانہ ہو گئے، میں نے پارٹ ایک گیرج والے کو دیئے جس نے پارٹ ڈالنے کے بعد کسی طرح اس کو سٹارٹ کیا لیکن پھر فوراً خراب ہوگئی۔

اب اس کام میں میرے دو تین ہفتے لگ گئے،اس دوران وہاں ترکی کا ایک پولیس آفیسر میرا دوست بن گیا جس نے میری بہت مدد کی ،اور مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی وہ لا کر دے دیتا اور اس کی وجہ سے لوگ بھی مجھ سے کم قیمت وصول کرتے تھے، وہ ایک اچھا انسان تھا،ایک دفعہ میں نے اس سے کہا کہ یار میں بغیر مرچ کے کھانے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں،اس نے کہا کہ یہ بھی کوئی بات ہے اور میرے لئے فوراً مرچوں کا بندوبست کر دیا۔

ایک دفعہ اس نے کہا کہ یہاں ایک پاکستانی ہے جو کافی پریشان ہے میں نے اس سے ملنا چاہا تو وہ اسے میرے پاس لے آیا، وہ بریڈ فورڈ کا رہنے والا تھا اور بریڈ فورڈ سے وین لے کر آیا تھا اور پاکستان میں علاقہ چھچھ سے تعلق رکھتا تھا،اس کو بھی میں نے اپنے ہوٹل میں آنے کی دعوت دی اور اس کی درخواست پر اپنی گاڑی کے پارٹ بھی اس کو دے دیئے جس سے اس کی گاڑی چلنے کے قابل ہوگئی اور میں نے اپنی گاڑی اس کی گاڑی کے ساتھ ٹوہ کی اور وہاں سے چل پڑے لیکن دس میل کے فاصلے پر پہاڑوں کے بیچ ایک ویرانے میں اس کی وین پھر خراب ہوگئی۔اتنے میں دو آدمی ہمارے پاس آئے جن سے ہم نے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کی گاڑی کو دھکا دے کر قریب ہی اپنے جھونپڑے کے پاس لے چلتے ہیں،رات ہمارے ساتھ بسر کریں،کھانا کھائیں اور صبح کو دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔اگلے دن ہم نے ایک ٹرک کرایہ پر لیا اور ایران چلے گئے۔

ترکی کے لوگ بہت مددگار تھے جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے،سوائے کچھ کسٹم آفیسر کے جو رشوت خور تھے جن کی وجہ سے مجھے تکلیف اٹھانی پڑی۔ایران میں میں نے دیکھا کہ ان کی خواتین ایک بڑی کالی چادر کے ذریعے خوب اپنے آپ کو ڈھانپ کر باپردہ آزادی کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں،محسوس ہوا کہ یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ اور سمجھ

دار ہیں۔اس وقت شاہ ایران کی حکومت تھی، ہر طرف اس کے پوسٹر لگے ہوئے تھے، جب کہ دوسری طرف اس کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ایران کے لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور وہ ترکی اور پاکستان کے لوگوں کی طرح جلد فرینڈلی نہیں ہوتے۔ ترک اور پاکستانی قوم میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔

خیر جب ہم ایران داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ بڑی تعداد میں پاکستانی وہاں بہت بری حالت میں پڑے ہوئے تھے، کپڑے میلے کچیلے اور محسوس ہوتا تھا کہ کئی دنوں سے انہوں نے غسل نہیں کیا۔وہاں انہوں نے بتایا کہ یہاں سے چند لوگوں پر مشتمل ایک قافلہ بنایا جاتا ہے، ان کے ساتھ ایک گائیڈ لگایا جاتا ہے اور انہیں ایران کراس کرایا جاتا ہے۔

ایران میں ہماری ملاقات عبدالغنی نامی ایک بزرگ سے ہوئی جو ہمارے ساتھ دوسرے گاؤں جھنگ سے تعلق رکھتے تھے، اور ان سے میری پہلے سے شناسائی تھی، ان کے پاس چار ٹرک تھے اور دو وین تھیں، اور ڈرائیور صرف دو، انہوں نے ایک ٹرک پر دوسرا ٹرک لوڈ کیا تھا اور دوسرے پر وین، میں نے اور قائم دین نے ان سے کہا کہ آپ کی وینیں ہم ڈرائیو کر لیتے ہیں اور آپ ہماری وینیں اپنے ٹرکوں پر لوڈ کر لیں، انہوں نے کہا کہ دعا کریں یہاں جلدی کام ہو جائے تو ہم آپ کی مدد کریں گے۔ہم نے ان کی خوب خاطر مدارات کی، لیکن جب ان کو گائیڈ مل گیا تو وہ وہاں سے چلنے لگے میں نے ان سے کہا بزرگو ہمارا کیا ہوگا؟ وہ کہنے لگے محبت تمہارا اللہ حافظ۔

مجھے بہت غصہ آیا کہ ایک ہفتہ اُن کی وجہ سے ہم وہاں پڑے رہے، اور وقت آنے پر دغہ دے گئے۔وہاں کوئی افغانی ٹرک بھی نہیں تھے جن پر ہم اپنی وین لوڈ کر سکتے اس لئے مجبوراً ہم نے حکومتی ڈپو میں اپنی وینیں جمع کرا کران سے رسیدیں حاصل کیں، اور

وہاں سے بس میں سوار ہو کر تہران کے لئے روانہ ہو گئے۔ ساری رات سفر کرنے کے بعد صبح تہران پہنچے۔ وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا، میں نے اپنے بریڈفورڈ کے ساتھی سے کہا کہ میں بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان جاؤں گا آپ کا کیا ارادہ ہے اس نے کہا میرے پاس جہاز کا کرایہ نہیں۔ میں نے کہا میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا، ہم برٹش ایمبیسی گئے اور کہا کہ آپ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ آپ واپس انگلینڈ جانا چاہتے ہیں تو ہم ٹکٹ کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر پاکستان جانا ہے تو حکومت پاکستان سے مدد طلب کریں۔ ہم نے بہت کوشش کی، کبھی پی، آئی، اے آفس، کبھی ہائی کمشنر کے پاس، مگر کسی نے کوئی مدد نہیں کی۔

پھر اللہ کی کرنی کہ ایک میرپور کے ساتھی مل گئے جن کا نام صدیق تھا ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے انہیں یہاں آنا پڑا۔ میں نے انہیں اپنی داستانِ غم سنائی کہ ہم دونوں ساتھی بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان جانا چاہتے ہیں لیکن میرے اس ساتھی کے پاس کرایہ نہیں جس کی وجہ سے دو ہفتوں سے ہم یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ فکر نہ کریں میں آپ کو رقم دیتا ہوں آپ پاکستان پہنچ کر میرے بھانجے کو واپس کر دینا وہ خود آپ سے رابطہ کر لے گا۔ ہم نے ٹکٹ خریدا اور پاکستان روانہ ہو گئے۔

جب اسلام آباد ائیرپورٹ پر پہنچے تو میں نے اپنے اُس ساتھی کو جس کا نام میں یہاں درج نہیں کر رہا سے کہا کہ ٹیکسی کر کے بس اڈے پر جاتے ہیں لیکن اُن کا رویہ اچانک بدل گیا، اس سے پہلے جو میں کہتا وہ سنتے تھے، لیکن اب اس نے کہا کہ مجھے ٹیکسی کی ضرورت نہیں آپ چلے جائیں میں اپنا بندوبست کر لوں گا۔ خیر میں نے ان سے کہا کہ میں شفیلڈ میں رہتا ہوں جو رقم میں نے آپ کے لئے ادھار لی ہے وہ مجھے وہاں واپس کر دینا، میں نے

ان سے بریڈفورڈ کا ایڈریس بھی نہ لیا۔ میرپور پہنچ کر میں نے صدیق صاحب کے بھانجے کو وہ رقم ادا کردی۔

جب میں انگلینڈ واپس ہوا تو انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ نہ کیا مجھے معلوم ہوا کہ وہ شفیلڈ میں رہنے والے ہمارے ایک دوست کے رشتہ دار ہیں میں نے ان سے بات کی تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر چلے گئے اس طرح بادل نخواستہ انہوں نے میری رقم مجھے واپس کی، لیکن وہ اس پر خوش نہیں تھے، اور انہوں نے میری اس نیکی پر شکریہ تک ادا نہ کیا حالانکہ میں اس کا طلب گار نہیں تھا اس لئے کہ میں نے جو کچھ کیا اللہ کی رضا کے لئے کیا۔ لیکن دُکھ اس بات کا ہوا کہ جس انسان کے ساتھ میں نے نیکی کی وہ کس قدر چھوٹی سوچ کا مالک ہے۔

یہاں پر میرے اس تکلیف دہ سفر کی داستان اختتام پزیر ہوتی ہے۔ جس سے میں نے بہت سے سبق سیکھے، مشکل وقت میں صرف اور صرف اللہ کی ذات ہی آپ کی مدد کرتی ہے، جب کہ آپ کا اپنا سایہ بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔

قارئین سے گزارش کروں گا کہ سفر میں اپنے کسی ساتھی کو اکیلا مت چھوڑیں کیونکہ انسان کی اصل پہچان اسی وقت ہوتی ہے جب آپ اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں یا کوئی معاملہ۔ مجھے تو جب بھی موقع ملا میں تو اسی طرح کروں گا جیسے میں نے اس سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیا۔

مکی مسجد شفیلڈ

یہ 24 جنوری 1976ء کی بات ہے کہ حاجی محمد بوستان صاحب کے گھر (Staniforth Road) میں ایک میٹنگ ہوئی کہ نَدر ایج (Nether Edge) کے علاقے میں ہماری ایک مسجد ہونی چاہیئے وہاں موجود تمام افراد نے 50،50 پونڈ چندہ دیا، پھر جلد ہی جناب جلال الدین صاحب نے بتایا کہ پلانٹیشن روڈ (Plantation Road) میں ایک بہت بڑی بلڈنگ برائے فروخت ہے۔ یہ ایک چرچ کی بلڈنگ تھی اور اس روڈ پر صرف ایک ہی عمارت تھی سب نے اتفاق کیا، میں نے اور حاجی بوستان صاحب نے تجویز دی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی ٹرسٹی نہیں بنے گا بلکہ شہر کے مختلف لوگ جو جماعت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ان کو ٹرسٹی بنایا جائے گا اس میں سب سے اہم مولانا عبید الرحمٰن صاحب مرحوم، حاجی تصدق حسین صاحب اور حمید بھائی تھے، سب نے اتفاق کرلیا۔ یہ بلڈنگ ہم نے آٹھ ہزار پونڈ میں خرید لی لیکن اس کی حالت کافی مخدوش تھی، لیکن لوگوں میں ایک جذبہ تھا، پیسے اتنے نہیں تھے مگر ہر آدمی اپنی جان اور ٹائم دینے کے لئے تیار تھا ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ اس عمارت کو جلد از جلد نماز پڑھنے کے لئے تیار کیا جائے سب سے

پہلے ہم نے ایک چھوٹے کمرے کو اس قابل بنایا کہ وہاں نمازیں شروع کر سکیں۔

اسلامیہ گرلز ہائی سکول کا قیام

اسلامیہ گرلز ہائی سکول کا قیام کے وقت مختلف کمیونٹی کے افراد کے ساتھ گروپ فوٹو

ایک دن حاجی بوستان صاحب کہنے لگے کہ انگلینڈ میں تین چار جگہ گرلز ہائی سکول کھل گئے ہیں ہمیں بھی یہاں شفیلڈ میں ایک سکول قائم کرنا چاہیے۔ میں نے اور مولانا عبید الرحمٰن صاحب نے کہا کہ اگر سکول کھولنے میں کوئی مشکل نہیں تو ٹھیک ہے، چنانچہ 20، اکتوبر 1982ء کو ہم نے اللہ کا نام لے کر سکول کھولنے کا اعلان کر دیا۔

سب سے پہلے ہم نے چند سکولوں کا وزٹ کیا، جس میں بریڈ فورڈ کا ایک سکول بھی شامل تھا۔ ہم نے مسجد کے ساتھ ملحقہ تین چار کمرے اس مقصد کے لئے مختص کر دیئے۔ کلاس روم، لیب اور دفاتر تیار کر کے ماسٹر شفیق منہاس صاحب کو معائنہ کے لئے بلوایا، انہوں نے کہا کہ جگہ مناسب ہے، آپ ایک درخواست سنٹر حکومت کو لکھ دیں آپ کو سکول کھولنے کی اجازت مل جائے گی۔ اس کے بعد ہم نے شفیلڈ سے لوگوں کو دعوت عام دی کہ اس طرح اسلامک سکول کا آغاز کر رہے ہیں، آپ اپنی بچیوں کو اس میں داخل کروائیں۔ چنانچہ ہماری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تقریباً چالیس پچاس آدمی اپنی بچیوں کو سکول بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اب اگلا مرحلہ اساتذہ رکھنے کا تھا، اس کے لئے ہمیں چند مشکلات کا سامنا تھا کیونکہ اس وقت ہماری بچیاں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں، کالج، یونیورسٹی بھیجنے کا رواج بھی نہ تھا، اور اگر جا بھی رہی تھیں تو وہ ابھی زیر تعلیم تھیں۔ ہمیں دو انگریز ٹیچر مل گئیں، ایک کا نام مسز رولنگ تھا، اور دوسری مسز منیز ز، اس کے علاوہ ہمارے ایک ساتھی رشید صاحب جو نیشنل بینک کے منیجر تھے، ان کی بیوی اور بھائی لیاقت صاحب کی بیوی بھی اس کے لئے تیار ہو گئیں۔ کچھ عرصہ بعد مولانا عبید الرحمٰن صاحب کی بہو بھی شامل ہو گئیں اور کام چل پڑا۔ اساتذہ کی تنخواہ، بچیوں کی کتابیں، اور دوسری تمام ذمہ داریاں میرے سر پر آ گئیں حاجی صاحب تو چونکہ جماعت کے ساتھ ہی رہتے تھے، اور زیادہ وقت ڈیوز بری ہوتے تھے، آنے جانے میں مشکلات تھیں لیکن جب ضرورت ہوتی تو ان کو یا مولانا کو بلا لیتا۔

سکول چلانا ویسے بھی مشکل کام ہے، لیکن گرلز سکول تو اس سے بھی زیادہ مشکل۔ اور سب سے اہم مسئلہ پردہ کا ہے، اور اس کے ساتھ دوسرے معاملات بھی۔ میں انتظامی معاملات تو چلاتا تھا لیکن جب کوئی میڈیا کے حوالے سے کام ہوتا یا کہیں کوئی تقریر کرنی ہوتی یا سکول میں کوئی نیا ٹیچر رکھنا ہوتا تو اس کے لئے حاجی صاحب کو زحمت دینی پڑتی تھی۔

کچھ بچیاں بسوں پر سکول آتی تھیں اور کچھ کے والدین خود چھوڑتے تھے۔ مسافت زیادہ ہونے کی وجہ سے والدین کافی مشکل میں تھے، لہٰذا انہوں نے سکول وین کا مطالبہ کر دیا۔ نومبر 1983ء میں سکول کے لئے وین لے لی، لیکن اب ڈرائیور رکھنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ مولانا عبید الرحمٰن صاحب کو اللہ جزائے خیر دے، ہر کام کی طرح یہاں بھی وہ آگے آگے رہے اور کہا کہ یہ کام میں کروں گا۔ والدین بھی مطمئن ہو گئے، کیونکہ مولانا کے ساتھ وہ اپنی بچیوں کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ہمیں سکول چلانے کے حوالے سے مالی مشکلات کا سامنا تھا کیونکہ والدین سے صرف پانچ پونڈ ہفتہ کا لیتے تھے۔ اب سوچا کہ کیا کیا

جائے۔اُن دنوں یوسف اسلام اسلامک سکول چلانے کے حوالے سے کافی متحرک تھے اور ان کا اس میں کافی تجربہ بھی تھا۔میں نے ان سے رابطہ کیا کہ ہماری کچھ مدد اور راہنمائی کریں۔چنانچہ انہوں نے اپنا ایک نمائندہ جس کا نام مسکین تھا اور جرمنی سے ایک نو مسلم تھا، ہمارے پاس بھیجا، بہت ہی اچھا انسان تھا، میں نے اسے بتایا کہ ہمیں سکول چلانے میں کافی دقّت کا سامنا ہے۔ہمیں کسی عرب ملک سے امداد دلوا دیں، اس نے جواب دیا محبت میری بات غور سے سنو! یہ عرب آپ لوگوں کو کچھ نہیں دیں گے، اگر کچھ لینا ہے تو اپنی اس حکومت سے لیں ان کے پاس بہت فنڈز ہیں، خیر انہوں نے اپنی طرف سے بھی کچھ مدد کی اس کے بعد میں نے سٹی کونسل سے گرانٹ حاصل کرنے کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ اس کے لئے کونسل کے آفیسر جن میں مسٹر سٹیو جان اور مسٹر سائمن شامل کے ساتھ میٹنگ کی، تو انہوں نے کہا کہ آپ کو دوبارہ بلائیں گے۔اسی اثناء میں ایم پی، فرنک ہولی، کونسلر ٹینا کلاک اور مکیش سوانی کو بھی مکی مسجد بلایا کہ آپ اس سلسلہ میں اپنا کردار ادا کریں انہوں نے بھی کہا کہ ہم کوشش کریں گے۔

کچھ عرصہ بعد ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ والوں نے ہمیں بلایا اور کہا کہ ہم نے اسلام آباد سیکرٹری تعلیم کو خط لکھا ہے کہ یہاں برطانیہ میں کچھ افراد گرلز مسلم سکول چلانا چاہتے ہیں، جبکہ ہمارے ہاں کو ایجوکیشن (Co-education) کا نظام چل رہا ہے۔انہوں نے آگے سے جواب دیا ہے کہ اُن کا دماغ خراب ہے، ہم یہاں پاکستان میں کو ایجوکیشن (Co-education) کی طرف جا رہے ہیں، اور وہ وہاں برطانیہ میں اس کا مطالبہ کر رہے ہیں، چنانچہ ہمیں ان کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔

یوسف اسلام اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے کہ اس اثناء میں مکی مسجد کی انتظامیہ تبدیل ہوگئی۔میں نے کام چھوڑ دیا۔جب دوبارہ دو سال بعد مجھے کمیٹی میں لیا گیا تو

اس وقت تک سکول بند ہو چکا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ جتنا تعاون عام عوام نے کیا تھا اتنا اگر مذ ہبی طبقہ کرتا تو ممکن تھا کہ وہ اسکول اچھی طرح سے چلتا رہتا۔ کچھ ہماری ناتجربہ کاری اور کم علمی کا بھی عمل دخل تھا، اور کچھ لوگوں کی مخالفت بھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مذہبی تنظیم کے سرگرم رکن نے ہمارے اس ادارے کی کتنی بڑھ چڑھ کر مخالفت کی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے علاوہ جو بھی کام کر رہے ہیں سب غلط ہیں۔

ایم، پی مگ مون اور جج مائیکل مرفی کا مکی مسجد کا وزٹ

مکی مسجد مسلم یوتھ سنٹر

تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی ورزش بھی بہت ضروری ہے،اور بالخصوص نوجوانوں کو صحت مندانہ سرگرمیوں میں مصروف رکھنے سے بہت سی قباحتوں اور بری مجلسوں سے بچایا جاسکتا ہے۔ یہی سوچ میرے ذہن میں تھی۔ مکی مسجد میں بچوں کے لئے تعلیم کا بندو بست تھا، جس میں حفظ اور ناظرہ کلاسز چل رہی تھیں، لیکن جسمانی ورزش کے لئے کوئی انتظام نہ تھا مسجد کے ساتھ ایک بہت بڑا ہال خالی پڑا ہوا تھا لیکن اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے مولانا عبیدالرحمٰن اور حاجی بوستان سے مشورہ کیا کہ اس کو یوتھ سنٹر میں تبدیل کر دیتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اگر چلا سکتے ہو تو ہمارا کوئی اعتراض نہیں۔ چنانچہ دسمبر 1983ء کو ہم نے یوتھ سنٹر کھولنے کا اعلان کیا۔ صفائی وغیرہ کر کے بیڈمنٹن کا آغاز کر دیا۔

پھر میں نے سیکشن 11 فیملی اینڈ کمیونٹی کی چیئرمین کونسلر شینا کلاک کو 2 فروری 1984ء کو مسجد بلایا، اور اس پروجیکٹ کے حوالے سے بریفنگ دی، وہ بڑی خوش ہوئی۔

اس نے ایک کونسل آفیسر پیٹر سیکر کو ہمارے پاس بھیجا، اس نے کہا کہ ہال کا بہت کام ہونے والا ہے، آپ ایک مکمل فیسی لیٹی رپورٹ (Facility Report) بنائیں، اور یہ کام کسی اچھے آرکیٹیکٹ (Architects) سے کراوئیں۔ ہم نے کہا کہ ہمارے پاس تو اس کے لئے پیسے ہی نہیں، اس نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں یہ رقم میں دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی ایک لڑکی کو بھیجا جو نئی نئی یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تھی، اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ رپورٹ تیار کی۔ جس میں تمام تفصیلات درج تھیں۔

اس کے بعد میں نے ایم، پی فرنک ہولی اور کونسلر شینا کو دوبارہ بلایا اور سارا پلان اُس کے سامنے رکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ بہت زبردست پلان ہے۔ کیونکہ اس وقت بہت سے لوگ بے کار ہیں، اور بچوں کے کھیلنے کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ کونسلر شینا اور پیٹر سیکر نے اس کو کمیٹی میں لے جانے کا فیصلہ کرلیا، اور کہا کہ یہ صرف آپ کی درخواست نہیں ہو گی بلکہ اس میں ہر کمیونٹی اور آرگنائزیشن شامل ہوگی، اور کمیٹی فیصلہ کرے گی کہ کس کو گرانٹ ملتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ یکمشت گرانٹ نہیں ملے گی، بلکہ ہر سال تھوڑی تھوڑی کر کے ملے گی۔ چنانچہ ہماری درخواست منظور ہوگئی اور کچھ رقم مل گئی اس وقت ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایک نوجوان بلڈر عبدالسلام نے نیا نیا کام شروع کیا تھا، اس نے بہت جلد ہی ہمیں اس ہال کو اندر سے ٹھیک کر دیا، جس سے ہم اپنا کام چلا سکتے تھے۔

اس کے بعد ہم نے پولیس کو بھی دعوت دی کہ آپ اس سنٹر کو دیکھیں، وہ بھی بڑے خوش ہوئے، کیونکہ اُن دنوں ہمیں کافی تنگ بھی کیا جاتا تھا تو پولیس کا آنا جانا لگا رہتا تھا، انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو ایک سرجن آفیسر دیں گے جو آپ کے بچوں کو یوتھ سنٹر میں مدد کرے گا۔ پولیس نے اپنے بجٹ سے ہمیں کھیلوں کا کچھ سامان بھی لے کر دیا، اور یوں پورے شفیلڈ میں ہمارا یوتھ سنٹر بہت مشہور ہوگیا۔ ہماری اپنی کرکٹ ٹیم تھی، جس کا

کپتان معروف زمان تھا۔ کرکٹ، بیڈمنٹن، اور ویٹ لفٹنگ کے علاوہ دوسرے تمام ان ڈور گیم کا اچھا انتظام تھا۔ پولیس ہمارے بچوں کو کبھی سائیکلنگ کے لئے لے جاتی، اور کبھی کبھار دریا کی سیر کے لئے بھی۔ پھر یہ ہال شادی بیاہ کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔

یہ سنٹر صرف مکی مسجد کے بچوں کے لئے نہیں تھا، بلکہ ہر ایک کے لئے تھا، اور صرف نوجوان نہیں بلکہ بڑی عمر کے لوگ بھی اس میں آتے تھے۔ کونسل نے ہمیں اگلے سال 20،21 ہزار پونڈ کی گرانٹ دی۔ جب وہ رقم ملی تو اس وقت میری جگہ رحمانی صاحب سیکرٹری بن گئے، انہوں نے ہال کے چھت وغیرہ کا کام کروایا، لیکن میرے جانے کے بعد سنٹر اتنا فعال نہ رہا۔ جب میں دوبارہ آیا تو اب وہ بات نہ تھی۔

پھر جب مولانا عبید الرحمٰن صاحب چیئر مین بن گئے اور چوہدری رفیق سیکرٹری اور چوہدری یعقوب خزانچی تو ان حضرات نے یوتھ سنٹر کو ختم کر کے وہاں مسجد کے لئے ایک بہت بڑا ہال بنا دیا جہاں 1500 لوگوں کے لئے نماز کی گنجائش بن گئی۔ میرے خیال میں ان کے اس فیصلے سے میں متفق نہیں ہوں، کیونکہ ہمارے ہاں پانچ وقت کے نمازیوں کی تعداد 40،50 سے زیادہ نہ تھی۔ اور جمعہ میں بھی دو تین سو افراد کے لگ بھگ افراد آتے تھے۔ اس لئے 1500 افراد کے لئے گنجائش بنانے کی ضرورت نہ تھی۔

یوتھ سنٹر ایک بہت بڑا پروجیکٹ تھا، جس سے نوجوان بہت خوش تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کچھ شریر لڑکے بھی آتے تھے جن کی وجہ سے کبھی کبھار پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن یہ ہر جگہ ہوتا ہے۔ آج بھی جب وہ نوجوان جواب چالیس پچاس سال کے ہو گئے ہیں جب ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انکل آپ نے یوتھ سنٹر بنا کر بہت اچھا کام کیا تھا۔

میری سوچ ہے کہ لوگ چیئر مین، سیکرٹری ضرور بنیں لیکن پہلے مسجد کو وقت دیں، اس کام کو سمجھیں پھر جو مرضی بنیں۔ اگر گروپ بن کر آئیں گے تو چلتے کام کا بھی ستیا

ناس ہوجائے گا۔

مین پاور پروجیکٹ

جب ٹوری پارٹی نے الیکشن جیت کر حکومت بنائی، اور ایڈورڈ ہیتھ وزیراعظم بن گئے، لیکن کچھ عرصہ بعد اُن کی جگہ تھیچر وزیراعظم بن گئی۔ لیبر پارٹی کی حکومت ابھی تازہ تازہ ختم ہوئی تھی، اور تمام فیکٹری ورکر لیبر حکومت سے بہت خوش تھے۔ کیونکہ وہ لیبر یونین کو بہت عزت دیتے تھے۔ فیکٹری مالکان کو تنگ نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ ان کو بہت بڑی بڑی گرانٹ بھی دی جاتی تھی۔ مسز تھیچر نے اعلان کر دیا کہ اب سے کسی کو کوئی گرانٹ نہیں ملے گی۔ اگر کوئی فیکٹری چلانا چاہتا ہے تو اپنے بل بوتے پر چلائے، اس سے تو بہتر ہے کہ ہم لوگوں کو براہ راست بینیفٹ دے دیں۔

اس اعلان کے بعد ہڑتالیں شروع ہوگئیں۔ اُس وقت سب سے بڑی ہڑتال شفیلڈ میں کوئلہ کے مزدوروں نے آرتھر سکاگل کی لیڈرشپ میں کی۔ پولیس اور مظاہرین کی اچھی خاصی جھڑپیں ہوئیں، لیکن تھیچر اپنے فیصلے پر ڈٹی رہیں، جس کے نتیجے میں بہت سی فیکٹریاں بند ہوگئیں جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ بے روزگار ہو گئے، تو گورنمنٹ نے بہت سی سکیمیں نکالیں۔ ان میں ایک مین پاور پروجیکٹ (Manpower Project) بھی شامل تھا، ان کو ٹاسک دیا گیا تھا کہ جو بھی کمیونٹی سنٹر ہیں اگر وہ کوئی آدمی ملازم رکھنا چاہیں تو گورنمنٹ ان کو تنخواہ دے گی جو کہ اسی آرگنائیزیشن کے انڈر رہوں گے،

لیکن پیسے مین پاور پروجیکٹ(Manpower Project)دے گا۔

ہم نے یوتھ سنٹر میں مین پاور پروجیکٹ (Manpower Project) کے مینجر کو بلایا تو انہوں نے منظوری دی کہ آپ ورکر رکھیں ہم ان کو تنخواہ دیں گے۔ہم نے آٹھ بندوں کو پارٹ ٹائم ورکر رکھا جس میں وہ نوجوان بھی شامل تھے جو سکولوں سے فارغ ہوئے تھے،اوران کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ایک سال کچھ لوگوں کو رکھا،اور پھر اگلے سال اور۔پھرانہوں نے کہا کہ آپ کو ایک فل ٹائم ورکر کی تنخواہ بھی ہم دیں گے تو میں نے مولانا عبیدالرحمٰن صاحب کے مشورے سے حاجی رحمانی کو رکھ لیا۔اس کام سے بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو فائدہ ہوا۔اور اسی کے بل پوتے پر کئی ایک نے اپنے لائف پارٹنر،خاوند یا بیوی کو پاکستان سے منگوایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر لگن اور شوق سے کام کیا جائے تو ہر کام ہوسکتا ہے،مگر شرط ہے کہ جان،مال اور ٹائم دینا پڑتا ہے۔اور صرف اللہ کو خوش کرنے کے جذبہ سے،اور اگر اس کام سے کسی ایک کو بھی سہولت مل جائے تو سودا مہنگا نہیں۔

مسجد کے لئے آئمہ کا تقرر

مولانا عبیدالرحمٰن صاحب چونکہ اپنی دوکان چلاتے تھے اس لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے ہم نے انڈیا کے ایک امام مولانا عبدالوہاب صاحب کو بطور امام مسجد میں رکھ لیا،میں سمجھتا ہوں انہوں نے اس وقت بہت مجاہدہ کیا،گرم پانی کا مسئلہ تھا اور اتنی بڑی

بلڈنگ میں اکیلے رہنا اُس سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز تھی۔ خیر وہ کچھ عرصہ رہے اور پھر انہوں نے شادی کر لی اور مزید خدمت جاری رکھنے سے معذرت کر لی۔ اس اثناء میں قاری محمد اسماعیل صاحب پاکستان سے آ گئے اور ان کو امام مقرر کر دیا کچھ عرصہ وہ امام رہے پھر انہوں نے بھی کچھ وجوہات کی بنا پر معذرت کر لی۔

اب میں نے مولانا عبید الرحمٰن صاحب اور حاجی بوستان صاحب نے میٹنگ کی کہ ہمیں پاکستان سے کسی امام کو بلانا چاہیئے، اور طے یہ ہوا کہ یہاں چونکہ میر پور والوں کی اکثریت ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ میر پور یا کشمیر سے کوئی امام لے کر آئیں، حاجی بوستان صاحب پاکستان جا رہے تھے انہوں نے وہاں جا کر مفتی محمد یونس صاحب سے بات کی کہ ہمیں مکی مسجد کے لئے امام کی ضرورت ہے آپ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کریں، انہوں نے کہا کہ اس وقت میر پور میں تو کوئی بڑا عالم نہیں ہے لیکن میرے ایک ساتھی باغ کے ہیں مولانا اسلم زاہد صاحب جو میرے ساتھ پڑھے ہیں ان کی سفارش کروں گا۔

اسی اثناء میں حاجی بوستان صاحب کی نظر اس وقت میر پور کے ایک متحرک نوجوان جو جمیعت طلباء اسلام کے ساتھ منسلک تھے پر پڑ گئی جن کا نام قاری تصور الحق تھا اور وہ مدینہ یونیورسٹی کے فاضل تھے اور اپنی ولولہ انگیز تقاریر کی وجہ سے میر پور میں بہت مشہور تھے۔ حاجی صاحب نے ان سے ملاقات کی اور کہا کہ ہم آپ کی صلاحیتوں سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، اور برطانیہ میں جمیعت علمائے برطانیہ کو فعال کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ اس کام کے لئے تیار ہیں تو ہم آپ کو مکی مسجد منگوا لیتے ہیں، آپ کے ذمہ دو کام ہوں گے ایک بچوں کی تعلیم اور دوسرے جمیعت کو متحرک کرنا، انہوں نے اس کے لئے حامی بھر لی۔ پھر حاجی صاحب نے واپس آ کر کہا کہ ہم ایک کی جگہ دو عالم بلائیں گے میں نے ان سے اتفاق کیا، اور ان دونوں حضرات کے کاغذات تیار کروا کر پاکستان بھیج دیئے۔

مولانا اسلم زاہد صاحب 8، ستمبر 1984ء کو لندن تشریف لائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حاجی بوستان صاحب اور میرے بھائی سلطان محمود میری گاڑی لے کر ان کو ائیر پورٹ پر لینے گئے تھے۔ پھر وہ تین دن میرے مہمان رہے اس کے بعد ان کی رہائیش کا بندوبست مکی مسجد میں کر دیا، ہمارے ایک ساتھی حاجی عبدالرشید صاحب جو ہمارے رشتہ دار بھی تھے انہوں نے مولوی صاحب کی بہت خدمت کی۔ میں اُس وقت مسجد کا سیکرٹری تھا میں نے مولانا محمد اسلم زاہد صاحب سے کہا کہ دین کا کام آپ نے کرنا ہے، اس میں میرا عمل دخل نہیں ہوگا، اور انتظامی امور میرے ہوں گے ان میں آپ کا کوئی لینا دینا نہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں قاری تصور الحق صاحب بھی آ گئے، ان کی ذمہ داریاں بھی ان کو بتا دیں کہ آپ نے بچوں کو پڑھانا ہے اور جمعیت کا کام کرنا ہے۔

حفظ کلاس کا اجراء

اُس وقت مولانا عبیدالرحمٰن صاحب میں اور حاجی بوستان صاحب ہر کام باہمی مشاورت سے کرتے تھے اور عام زبان میں ایک پیج پر تھے۔ کام تو سب سے زیادہ میں ہی کرتا تھا کیونکہ حاجی صاحب کا زیادہ وقت جماعت میں مصروف رہتا تھا اور مولانا صاحب دوکان پر مصروف رہتے تھے، لیکن ان کی سرپرستی ہر وقت رہتی تھی اور ایک دوسرے کی مان کر چلتے تھے، مکی مسجد میں حفظ کلاس کا آغاز مولانا عبیدالرحمٰن صاحب نے کیا اور اس کے بعد قاری اسماعیل صاحب نے اس کلاس کو آگے جاری رکھا۔ کرتے کراتے اس میں بیس پچیس بچے ہو گئے۔ اس میں میرا بیٹا بھی شامل تھا، جب اس نے پہلا سپارہ مکمل کیا تو مولانا نے کہا کہ حاجی صاحب ایک دعوت ہونی چاہئے، میں نے تو دعوت کا انتظام کیا لیکن وہ دعوت جلسہ کی صورت اختیار کر گئی۔ میری خواہش تھی کہ میرا بیٹا حافظ بن جائے، لیکن 17 سپارے حفظ کرنے کے بعد اس نے مسجد چھوڑ دی جس کا مجھے افسوس ہے۔ مکی مسجد میں مکتب

کا انتظام بہت اچھا تھا جس میں پورے شفیلڈ سے بچے بچیاں پڑھنے کے لئے آتے تھے،
ہر سال بچوں کا امتحان ہوتا تھا، جس میں مختلف مساجد کے آئمہ آ کر امتحان لیتے تھے۔

پارکنگ

ہمارے پاس مسجد کی کوئی مستقل کار پارکنگ نہیں تھی، جب کہ کونسل والے بھی تنگ کرتے تھے کہ اپنی کار پارکنگ بنائیں۔ مسجد کے ساتھ کچھ خالی جگہ تھی لیکن وہ ایک پہاڑی تھی جس میں بے شمار درخت تھے پھر 1984ء میں ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس جگہ کار پارک بناتے ہیں، سب ساتھیوں نے مل کر اپنی مدد آپ کے تحت سب درخت کاٹ دیئے، جگہ صاف کی، مولانا خود ہم سے زیادہ کام کرتے تھے۔ محترم محمد یونس ویلڈر صاحب جو ایک فیکٹری چلاتے تھے، انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔ ہم نے ایک کمپنی کو چالیس (40,000) ہزار کا ٹھیکہ دیا اور تمام نگرانی انہوں نے کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

مسجد میں ہر رمضان میں افطار پارٹی کا خصوصی انتظام ہوتا تھا، اور بالخصوص وہ مسلمان طلباء جو مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے ان کو افطار کے لئے دعوت دی جاتی تھی۔

مسجد کے تمام معاملات مولانا عبید الرحمٰن صاحب کی سرپرستی میں احسن طریقے سے چل رہے تھے، میں سیکرٹری تھا اور زیادہ تر ذمہ داریاں میرے کندھوں پر ہی تھیں۔ پھر اچانک کچھ لوگوں کی چھٹی حس جاگ اٹھی، اور انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی سیکرٹری بنیں، کچھ نمازیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ الیکشن ہوں اور کمیٹی بنائی جائے جو ایک جائز مطالبہ تھا اور اس کے لئے کوشش بھی کی گئی، لیکن حاجی بوستان صاحب نے کہا کہ سیکرٹری حاجی محبت صاحب ہی رہیں گے، جبکہ مجھے اس کی کوئی خواہش نہیں تھی اور میں نے آفر کی جو

بھی اس کام کو سنبھالنا چاہیے مجھے خوشی ہوگی۔

اسی دوران مولانا عبید الرحمٰن صاحب کے بھائی قاری سعید الرحمٰن صاحب پاکستان سے تشریف لائے۔ مسجد کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے، ان کو منصف بنایا گیا تو انہوں نے کہا کہ محبت کی جگہ رحمانی صاحب کو سیکرٹری بنایا جائے۔ میں اور مولانا عبید الرحمٰن صاحب اس معاملے سے دور ہو گئے، اور حاجی بوستان صاحب بھی شریک نہ ہوئے۔

حاجی رحمانی صاحب سیکرٹری بن گئے، انہوں نے بڑی مشکل سے دو سال تک کام کیا اور دو سال کے بعد مولانا عبید الرحمٰن صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ معاملات ٹھیک نہیں چل رہے، آپ دوبارہ سیکرٹری بن جائیں اور اُسی طرح کام کریں جس طرح پہلے کرتے تھے، اس طرح 1986ء میں دوبارہ میں سیکرٹری بن گیا۔ اس وقت مسلم گرلز سکول جو ہم نے شروع کیا تھا وہ بند ہو چکا تھا۔

1976ء میں جب مسجد بنی تو بہت مشکل حالات تھے سب ساتھیوں نے بہت محنت کی، ان میں بھائی عبدالحمید پانچ میل دور سے آتے، اور دوسرے انور شاہ تھے جو اس کو خالص دینی کام سمجھ کر کرتے تھے۔ حاجی بوستان صاحب کے بھائی اور رشتہ دار اور میرے بھائی اور بالخصوص مولانا عبید الرحمٰن یہ تمام وہ لوگ تھے جو اپنا مال اور وقت مسجد کے لئے دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مکی مسجد کے آس پاس انگریزوں کی اکثریت تھی، اور وہ بہت تنگ کرتے تھے اُس وقت سِکن بیڈ (seken BAD) (رنگت) کا بڑا چرچہ تھا، وہ ہمیں پتھر مارتے تھے۔

ایک روز انہوں نے خنزیر کا سر مسجد کے دروازے پر رکھ دیا، ہم نے پولیس اور مقامی سیاست دانوں کو جمع کیا کہ ہماری مدد کریں، انہوں نے اس میں تعاون کیا اور مسجد کا پڑوسی انگریز جو زیادہ تنگ کرتا تھا اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنا مکان فروخت کر دے، اور بالآخر

اس نے اپنا مکان فروخت کر دیا تو کچھ سکون ہوا۔

خیر میں بات یہ کر رہا تھا کہ مشکل حالات میں مسجد کو آباد کیا، اور وہ لوگ جو فیکٹریوں میں یا دوسرے کاموں میں مصروف تھے جب ان کے پاس ٹائم ہو گیا تو ان کے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ ہم بھی کمیٹی کے چیئر مین، سیکرٹری، خزانچی بنیں۔ دوسری طرف وہ عالم جس کو ہم نے منگوایا تھا انہوں نے ہمارے ہی کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا، اور مولانا عبید الرحمٰن صاحب کو بھی ہم سے دور کر دیا۔

خیر اس ساری محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1995ء میں نئی کمیٹی بن گئی جس میں مولانا عبید الرحمٰن صاحب چیئر مین، چوہدری محمد رفیق سیکرٹری اور چوہدری محمد یعقوب خزانچی بن گئے۔ میرے بھائی برکت علی بھی ان کے ساتھ تھے، اور وہ کام جو میں کرتا تھا اب وہ ان کے ذمہ تھے۔ میرے خاندان کو میرے پیچھے لگا دیا گیا، اور حاجی بوستان کے کچھ رشتہ دار ان کے پیچھے لگ گئے۔ لیکن اس سارے قضیہ میں سب سے زیادہ تکلیف میں برداشت کر رہا تھا، کیونکہ حاجی صاحب مجھے آگے کر کے خود جماعت میں چلے جاتے تھے، یا کسی دوسرے ملک میں اپنی بیوی بچوں کے پاس۔ ان کے رشتہ دار بھی کم ہی آتے تھے۔ میں اکیلا ہوتا تھا، ہوتے ہوتے بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ گئی، میرے بھائی کے بچے اور ان کے کچھ ساتھی لڑائی پر اتر آئے، اور کچھ لوگوں نے اس پر خوب تیل چھڑکا۔ دوسری طرف یہ کہا کہ محبت نے غنڈے رکھے ہوئے ہیں جو ہمیں مارتے ہیں۔

حاجی ممتاز، محبت علی، حافظ حسین احمد اور حفیظ الرحمٰن

حاجی ممتاز خان صاحب جو چھاچھی برادری سے تعلق رکھتے ہیں ،اور مرتضیٰ اعوان صاحب جو پولیس آفیسر تھے میرے پاس آئے میں نے ان کو ساری تفصیل بتائی تو انہوں نے میرے مؤقف کی تائید کی۔انہوں نے کہا کہ آپ کو مسجد کمیٹی میں ہونا چاہیے مگر یہ کام جب ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر ختم نہیں ہوتا۔بالآخر اس لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان لوگوں نے ایک اور مسجد بنالی۔اب جب مسجد دوبارہ ہمارے پاس آئی تو مسلم یوتھ سنٹر بند ہو چکا تھااور دوا یکٹرز مین جو ہم نے کونسل سے لینا طے کی تھی وہ بھی واپس ہوگئی، یہ 2001ء کی بات ہے جب میں مسجد کمیٹی کا دوبارہ حصہ بن گیا،لیکن اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔

مکی مسجد کے امام
مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب

ان دنوں مکی مسجد کے امام مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب تھے جو 1998ء میں مسجد کے امام بنے۔جب وہ پاکستان سے انگلینڈ کے لئے آئے تو ان کو پرسٹن جانا تھا لیکن ہم نے حاجی عدالت خان صاحب کو کہہ کر کہ ان کی ہمیں مکی مسجد میں زیادہ ضرورت ہے انہیں یہیں ٹھیرا لیا۔ مانچسٹر ائیر پورٹ پر انہیں لینے میں اور حاجی بوستان صاحب میری گاڑی میں گئے ، انہیں ائیر پورٹ سے سیدھا میں اپنے گھر لا یا،اور تین دنوں تک میرے گھر پر قیام کرنے کے بعد وہ مسجد میں شفٹ ہو گئے۔

وہ ایک شریف الطبع اور خاموش طبیعت والے انسان ہیں، اور بہت بڑے عالم بھی۔ ان کا معمول تھا کہ کسی سے غیر ضروری گفتگو نہیں کرتے تھے میں نے بیس سال میں کبھی بھی نہیں دیکھا کہ وہ کبھی نماز میں دیر سے آئے ہوں، بلکہ ہمیشہ دس منٹ جلدی آتے اور قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف ہو جاتے۔ اپنے پیش رو امام کی طرح نمازیوں میں کوئی گروپ بندی نہیں کی، بس اپنے کام سے کام رکھا۔ مسجد کی بھی دیکھ بھال کرتے تھے، میں ان کی اور وہ میری عزت کرتے رہے، اور کبھی بھی ہمارے درمیان کوئی اونچ نیچ نہیں ہوئی۔ انتظامی معاملات میں انہوں نے کبھی بھی دخل اندازی نہیں کی۔

2013ء کی بات ہے کہ جب مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب کے سامنے میرے دوست ڈاکٹر شاہ نواز نے کہا کہ کچھ نمازی تمہیں پسند نہیں کرتے کہ یہ مسجد ٹھیک نہیں چلا رہا، میں نے کہا ٹھیک ہے میں اپنی ذمہ داریاں ان کو دے دیتا ہوں، چنانچہ میں نے سیکرٹری حفیظ الرحمٰن، اور خزانچی کرامت حسین کو بتایا کہ میں آج سے چیئرمین شپ چھوڑ رہا ہوں آپ نیا چیئرمین بنالیں، وہ سال بھر ٹالتے رہے، پھر میں نے سختی سے کہا کہ میری جگہ نیا چیئرمین بنالیں۔ اس کے بعد حاجی محمود حسین صاحب کو چیئرمین بنایا گیا۔ وہ تین سال رہے، اس کے بعد ایک آتا اور دوسرا جاتا، اور یہ سب حاجی بوستان صاحب کے خاندان والے تھے۔ پھر حاجی صاحب کا داماد مہربان چیئرمین اور نواسا سیکرٹری بن گئے۔ انہوں نے آتے ہی مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے لئے بیس صفحات پر مشتمل ایک نیا اگریمنٹ تیار کیا اور اس کے اندر ایسی ایسی شرائط رکھیں جو کسی طرح قابل قبول نہیں تھیں۔ میں نے ان کو کہا کہ میں تمہارا بڑا ہوں اور سمجھا رہا ہوں کہ ایسا نہ کرو، مگر وہ کسی کی بات سننے پر تیار نہ تھے۔

اب مولانا نے کہا کہ میرے لئے اس ماحول میں کام کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے یہاں پھر سے گروپ بندیاں ہوں اور لڑائی جھگڑے کا ماحول بنے، بہتر ہے کہ میں کنارہ کش ہو جاتا ہوں۔

میں نے مولانا حیات خان اور ڈاکٹر شاہ نواز اور بھائی عبدالرشید کو اپنے گھر بلایا اور کہا کہ مولانا پچھلے بیس سال سے ہماری خدمت کر رہے ہیں، ان کے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے۔ میں نے تجویز دی کہ دو امام رکھ لیتے ہیں، ایک انگلش سپیکنگ جو بچوں کو بھی پڑھائے اور دو جمعے بھی، اور مولانا نمازیں اور دو جمعے پڑھائیں۔ دوسری تجویز دی کہ مولانا صاحب کو پانچ چھے ہزار الم سم دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دیں۔ لیکن انہوں نے ان تجاویز کا کوئی مثبت جواب نہ دیا، بلکہ آگے سے کچھ ایسی تجاویز دیں جو مولانا کے لئے قابل قبول نہ تھیں۔

مولانا نے کہا کہ بہتر ہے حاجی بوستان صاحب سے بات کر لی جائے۔ پھر جب ڈیوزبری جا کر حاجی صاحب سے انہوں نے بات کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا، جس کے بعد مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب نے مسجد کی امامت اور خطابت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ایک طرف حضرت مرکز کی خاطر پوری دنیا سے ٹکر لے رہے ہیں، لیکن جب گھر کی بات آئی تو صاف کہہ دیا کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

سب لڑائیاں دوسروں کے گھروں میں اچھی لگتی ہیں، وہ اصول جو دوسروں کے لئے بنائیں خود بھی ان پر عمل کریں تو تب مزہ ہے۔ اچھے علماء کی قدر کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اگر مولانا کو عزت دی جاتی تو وہ مفت میں بھی نمازیں پڑھا سکتے تھے، لیکن جان بوجھ کر ان کی تذلیل کی گئی۔

مولانا کے سب بچے بچیاں دینی تعلیم سے آراستہ ہیں۔ بڑا بیٹا جو بلیک برن مدرسہ میں عالم بن رہا تھا اور ساتھ یونیورسٹی میں بھی پڑھ رہا تھا، لیکن جب اس نے والد کے

ساتھ یہ سلوک ہوتے دیکھا تو دلبرداشتہ ہوکر مدرسہ چھوڑ دیا کہ اگر عالم دین بن کر یہی سلوک برداشت کرنا ہے تو پھر کیا فائدہ۔ اس کی تعلیم چھوڑنے کا بھی مولانا کو بہت صدمہ ہے۔ میں تو ان لوگوں کے لئے دعاء ہی کرسکتا ہوں جن کی وجہ سے حالات یہاں تک پہنچے۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔

چوھدری محمد اکرم اور محمد حنیف صاحب

چوہدری محمد اکرم، محمد حنیف اور حاجی محمد یٰسین

1988ء سے لے کر 2013ء تک دو آدمیوں نے میری بہت مدد کی اگر ان دو افراد کا تذکرہ نہ کروں تو ناانصافی ہوگی، ایک چوہدری محمد اکرم صاحب اور دوسرے حنیف مغل صاحب ان لوگوں نے جو بھی کام کیا محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا، میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے گواہ ہیں اور پھر بھائی مرتضیٰ اور بھائی ممتاز خان صاحب بھی۔

جمعیت علماء برطانیہ

جس وقت میں برطانیہ آیا اس وقت مساجد، علماء اور مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔شفیلڈ میں جو مسجد سب سے پہلے بنائی گئی وہ انڈسٹری روڈ پر تھی۔ جو 1962ء میں قائم ہوئی اور اس کے سب سے پہلے امام عزیز الرحمٰن صاحب تھے جو علاقہ چھچھ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو ایک گھر میں تھی۔عید یا رمضان کا آغاز جمعیت علماء برطانیہ کی معلومات کی بنا پر ہوتا تھا۔اُس وقت جمعیت کوئی اتنی فعال نہیں تھی، اس کے امیر مفتی عبدالباقی صاحب تھے۔ بعد میں علامہ خالد محمود اور قاری لطف الرحمٰن بھی امیر رہے۔ بہر حال یہاں دینی حوالہ سے بڑا مسئلہ عید اور رمضان کا آغاز تھا۔

شروع شروع میں چونکہ مسلمان کم بھی تھے اور خبر رسانی کا اتنا فعال نظام بھی نہیں تھا تو اس ایشو کا اتنا چرچا نہیں تھا۔شروع میں جمعیت والے عید اور رمضان کا آغاز مراکش کی رؤیت پر کرتے تھے، اور بریلوی حضرات سعودی عرب کی رؤیت پر، عرب حضرات تو پہلے ہی سعودی عرب کے ساتھ تھے۔

اب ہمارے لئے مشکل ہوگئی، ہر گھر میں کوئی دیوبندی ہے اور کوئی بریلوی۔ آدھا گھر روزے سے ہوتا اور آدھا عید کر رہا ہوتا، اور پھر یہ مسئلہ زیادہ تر میرپور اور شمالی پنجاب یعنی راولپنڈی، گوجر خان اور جہلم والوں کے ساتھ تھا جو کہ آج تک حل نہیں ہوسکا۔ شروع میں جب دیوبندی مسلک والے مراکش کے ساتھ تھے کہ یہ ملک برطانیہ کے نزدیک ترین اسلامی ملک ہے تو اس وقت بریلویوں کا طعنہ ہوتا تھا کہ کیا مراکش مکہ اور مدینہ ہے، عید سعودی عرب کے ساتھ ہونی چاہئے کچھ کا مؤقف تھا کہ برطانیہ والوں کو اپنی عید

کرنی چاہیئے اور کسی ملک کو فالو نہیں کرنا چاہیئے جس میں مولانا محمود میر پوری، یو کے اسلامک مشن کے صدیقی صاحب قابل ذکر ہیں۔

بہر حال 1983ء میں اکثر لوگوں نے مراکش کو چھوڑ کر سعودی کے ساتھ عید کرنے کا اعلان کر دیا، اور 17 ستمبر 1983ء کو عید کا دن تھا تو سارے شفیلڈ نے عید منائی لیکن ہماری مسجد نے 18 تاریخ کو عید منائی۔ کیونکہ مولانا عبیدالرحمٰن صاحب نے کہا کہ ہم پہلے جمعیت کی میٹنگ بلائیں گے، پھر فیصلہ کریں گے، خیر اگلے سال 1984ء کو اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ عید اور رمضان کا آغاز سعودی عرب کے ساتھ ہوگا، لیکن کچھ عرصہ بعد بریلوی حضرات نے کہنا شروع کر دیا کہ سعودی والے چاند کی رؤیت کے بغیر ہی اعلان کر دیتے ہیں، ہم ابزویٹری کے اوپر عید اور رمضان کا آغاز کریں گے، اور پھر سے دو عیدوں اور رمضان کا آغاز شروع ہو گیا جو کہ آج تک چلا آ رہا ہے۔ اس میں علماء کو تو شائد کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن مزدور طبقہ کو بہت فرق پڑتا ہے اور پھر گھروں کے اندر تقسیم شروع ہو جاتی ہے۔ باپ، بیٹے کی اگر الگ الگ عیدیں ہوں تو اس عید کا کیا مزہ۔ شریعت میں ہر مسئلہ کا حل موجود ہے، اگر علماء کرام سنجیدگی سے مل بیٹھ کر اس مسئلے کو حل کریں تو کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ عوام کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ کیا فارمولہ اپنایا جائے، سعودی عرب، مراکش یا ابزرویٹری وہ تو صرف ایک دن مل کر خوشی منانا چاہتے ہیں۔ اب علماء کو ہی اس کا حل ڈھونڈنا ہے۔

خیر بات جمعیت کی شروع کی تھی اور نکل چاند کی طرف گیا۔ تو جمعیت شروع میں اتنی فعال نہ تھی۔ 1984ء میں جب مکی مسجد میں مولانا عبیدالرحمٰن صاحب کی سرپرستی میں عید کے حوالے سے میٹنگ ہوئی تو اس میں ایک تو یہ فیصلہ ہوا کہ رمضان اور عید سعودی کے ساتھ ہوگی۔ دوسرا یہ کہ نمازوں کے اوقات کا ٹائم ٹیبل پرانا ہی رہے گا، اور تیسرا فیصلہ یہ

ہوا کہ جمعیت کو منظّم کر کے فعال کیا جائے گا۔ 1984ء کے اخیر میں قاری تصور الحق صاحب کو مکی مسجد میں بلایا گیا اور انہیں خاص طور پر جمعیت کو فعال کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، وہ نوجوان تھے، مدینہ یونیورسٹی کے فاضل تھے، پاکستان میں کالج کی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی، اور اخبارات میں لکھنے کا ملکہ بھی حاصل تھا، سیاسی حوالے سے جمعیت طلباء اسلام میں کافی فعال رہ چکے تھے۔ انہوں نے آتے ہی ہر شہر کا دورہ کیا اور تمام علماء کرام کو بتایا کہ مولانا عبید الرحمٰن اور حاجی بوستان صاحب نے انہیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ تمام علماء کو اکھٹا کیا جائے۔

چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں برطانیہ بھر کے علماء مکی مسجد میں جمع ہوئے اور جمعیت کی تنظیم نو کی گئی۔ مولانا عبید الرحمٰن صاحب کو سرپرست اعلیٰ بنایا گیا، جبکہ باقی عہدیداروں میں مولانا عبدالرشید ربانی صاحب جنرل سیکرٹری، مولانا پنڈورصاحب صدر، مولانا ایوب لہر صاحب خزانچی مقرر ہوئے جبکہ قاری تصور الحق کو سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا، اور اس طرح جمعیت نے ایک نئے ولولے کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ ہر شہر میں جلسے رکھے گئے اور پاکستان سے بھی کافی علماء کو بلایا گیا۔ عرب ممالک کے دورے کئے گئے، اور جمعیت علمائے برطانیہ بہت مشہور ہو گئی۔

اس وقت ختم نبوت کا مسئلہ کافی نمایاں تھا، بالخصوص مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ اس کو بہت نمایاں کرتے تھے۔ پھر جمعیت نے ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ بروز اتوار 4، اگست 1985ء کو ایک بہت بڑی عالمی ختم نبوت کانفرنس ویمبلے سنٹر لندن میں منعقد ہوگی، اور پوری دنیا سے علماء کرام کو بلایا جائے گا۔ پھر قاری تصور الحق کو یہ کام سونپا گیا کہ برطانیہ کی تمام مساجد تک یہ پیغام پہنچایا جائے، اور دوسرے اخبارات میں بیانات دیئے جائیں، اور تیسرے پوری دنیا سے علماء کو مدعو کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے انڈیا، بنگلہ دیش، پاکستان

اور سعودی عرب اور دوسرے ممالک سے بے شمار علماء کو مدعو کیا۔ الحمد للہ مکی مسجد کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس کانفرنس کے تمام مہمانوں کے قیام کا انتظام میں نے، مولانا عبید الرحمٰن اور حاجی بوستان کے ساتھ مل کر کیا۔ ویمبلے ہال میں 2500 افراد کی گنجائش موجود تھی، لیکن ختم نبوت کے پروانے پورے برطانیہ سے بسوں اور کوچوں اور اپنی کاروں پر بہت بڑی تعداد میں لندن پہنچ گئے۔

لوگوں کا کوئی شمار نہیں تھا، میں نے اپنی زندگی میں اس کے بعد اتنی بڑی ختم نبوت کانفرنس نہیں دیکھی۔ بڑے بڑے علماء اس میں شریک ہوئے جن میں علامہ خالد محمودؒ، مولانا ضیاء القاسمیؒ، مولانا اجمل خان، مولانا عبد الحفیظ مکیؒ، مولانا منظور چینیوٹیؒ، مولانا اللہ وسایا اور دیگر بہت سے علماء شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس ہر اعتبار سے ایک کامیاب کانفرنس تھی، جس میں قاری تصور الحق صاحب کا بہت بڑا کردار تھا۔ بعد کے سالوں میں بھی یہ کانفرنس جاری رہی اور ابھی تک ہے۔ لیکن پھر اس میں بھی دو گروپ بن گئے۔ اب جو کانفرنس ہو رہی ہے اس میں چونکہ مقامی علماء کا کردار بہت کم ہے اس لئے اس کی افادیت میں کمی آئی ہے۔

پھر جمعیت نے اپنا دفتر برمنگھم میں کھولا، اور اس کا انچارج قاری تصور الحق صاحب کو بنایا گیا۔ انہوں نے بڑی محنت سے اس کا سیٹ اپ کیا۔ علمائے دیوبند کی کتابیں آڈیو کیسٹیں اور دیگر مواد کا انتظام کیا، یہ مکان تھا جس میں مسجد بھی بنائی، قاری صاحب اس کے امام بھی ہو گئے، پھر جب اس میں نمازیوں کے لئے جگہ کم ہوگئی تو اس مکان کے ساتھ ملحقہ یارڈ کو مسجد میں تبدیل کر دیا جو کہ زیادہ تر میرپور کے لوگوں کے تعاون سے تھا۔

پھر ایک دفعہ جمعیت کے ایک ذمہ دار نے حاجی بوستان صاحب کو کہا کہ جزل سیکرٹری صاحب ہماری بات نہیں سنتے اس لئے انہیں سمجھائیں، حاجی صاحب نے ان کے

ساتھ میٹنگ کی ،لیکن اندرخانہ بات کچھ اور تھی اور وہ صاحب سمجھتے تھے کہ جب تک قاری تصورالحق اور حاجی بوستان ہیں ہماری لئے آگے بڑھنا مشکل ہے۔

مسجد عمر جہاں پر جمعیت کا دفتر تھا وہاں کچھ نمازی چھچھ کے بھی تھے،انہوں نے قاری صاحب کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔وہ صاحب وہاں بھی پہنچ جاتے تھے، اور بالآخر قاری صاحب کو وہاں سے فارغ کر دیا۔اس بات کا قاری صاحب کو بہت افسوس ہوا کہ میں نے اپنی جان، مال اور ٹائم دیا اور میرے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔

ادھر حاجی بوستان کو کہا گیا کہ آپ عالم نہیں ہیں اور اب میٹنگ میں صرف علماء ہی آئیں گے،تو قاری صاحب نے اپنی الگ جمعیت بنالی جس کے امیر مولانا اختر غوری صاحب کو بنایا، میں اور حاجی بوستان صاحب قاری صاحب کے ساتھ تھے۔قاری صاحب اپنا کام کرتے رہے،انہوں نے پہلے مسجد طیبہ بنائی،اس کے بعد مسجد عثمان ، اور پھر برمنگھم کی بہت بڑی مسجد، مسجد علی کی تعمیران کا سنہرا کارنامہ ہے۔وہ ہمیشہ علمائے دیوبند کی خدمات کو اجاگر کرتے رہے۔2018ء میں انہوں نے مسجد علی کے اندر میٹنگ بلائی، اوراس میں تمام علماء کو اس بات پر راضی کیا کہ بیشک آپ اپنا اپنا کام کریں لیکن ایک دوسرے کے پروگراموں میں جائیں ،اور ناراضگیاں نہ رکھیں ۔ وہاں میں نے علماء کے سامنے ایک سوال رکھا کہ ہمارا کیا قصور ہے کہ ہم لوگوں نے آپ لوگوں کو جمعیت بنا کر دی کہ آپ لوگوں تک صحیح دین پہنچائیں ،لیکن آپ میں سے کچھ لوگوں کی وجہ سے ہم بھائی آپس میں جدا ہو گئے اور کچھ نے دین سے زیادہ علاقائیت کو پروان چڑھایا کہ یہ میر پوری ہے اور یہ چھاچھی لیکن مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔اب بھی کئی جمعیتیں ہیں لیکن صرف اخباروں تک محدود ہیں۔جب کوئی مرجاتا ہے تو تیس چالیس علماء کا تعزیت نامہ آجاتا ہے اور بس۔

سفرِ حج

حج اسلام کا اہم رکن ہے جو ہر صاحب استطاعت پر زندگی میں ایک دفعہ فرض ہے ،جس وقت بھی انسان کو مالی اور بدنی استطاعت ہو اس کو ضرور حج کرنا چاہیئے ۔ میری عمر اس وقت تقریباً 41 سال ہو گئی تھی ،اور انگلینڈ آئے ہوئے بھی 20 سال بیت چکے تھے ، میرے والد صاحب مرحوم پانچ وقت پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے ، وہ جماعت کے ساتھ وابستہ تھے ۔انہوں نے 1964ء میں جماعت کے ساتھیوں کے ساتھ حج کیا تھا ،ان کی بدولت میرا سرکل بھی اچھے لوگوں کے ساتھ تھا۔کبھی کبھار جماعت کے ساتھ وقت لگانے کے لئے بھی جاتا تھا تو وہ بھی نماز ، روزہ اور حج کے فضائل بیان کرتے تھے ۔ ہر مسلمان کی طرح میرے دل میں بھی اللہ کے گھر کی زیارت کا شوق تھا۔ 1979ء میں حج کا ارداہ کرلیا ، میں نے والدہ کو بھی یہیں بلایا تھا انہیں بھی حج کا بہت شوق تھا ، پھر میرے ماموں عبد الکریم صاحب بھی تیار ہو گئے ۔حاجی بوستان صاحب نے بتایا کہ جماعت کے بہت سے ساتھی جا رہے ہیں ، اور میرا بھی ارادہ ہے ۔میں نے ان سے تین ٹکٹ بک کروانے کا کہہ دیا۔انہوں نے اردن کی ایئر لائن کے ٹکٹ بک کروا دیئے ۔میری فیملی انگلینڈ میں تھی ، بچے سکول جا رہے تھے ،اور میں خود ٹیکسی چلاتا تھا تو چھٹی کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

ہم لندن ایئر پورٹ سے سوار ہو کر صبح سویرے اردن پہنچ گئے ،اور صبح کی نماز ایئر پورٹ پر پڑھی ۔اب وہاں سے ہمیں دوسرا جہاز لینا تھا۔ایئر پورٹ پر ہی احرام پہنا ، اور نوافل ادا کر کے اللہ سے دعاء کی کہ اے رب جو فریضہ سرانجام دینے کے لئے نکلے ہیں

اس کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔ تین گھنٹے کے بعد وہاں سے جدّہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہمارے گروپ میں حاجی بوستان صاحب، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن، محمد صدیق خان بھی شامل تھے جہاز میں زیادہ تر تبلیغی ساتھی تھے جن میں زیادہ تعداد انڈین مسلمانوں کی تھی۔ 2 گھنٹے میں جہاز جدّہ ائیر پورٹ پہنچ گیا۔ ایئر پورٹ سے نکلنے کے بعد حج کیمپ میں چلے گئے جو بالکل ساتھ ہی تھا۔ اس میں بڑے بڑے ہال تھے، یہ گورنمنٹ کی طرف سے انتظام تھا دو تین دن وہاں قیام کے بعد بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے۔

تقریباً عشاء کے وقت مکہ پہنچ گئے، ہمارے معلّم محمد شیر پنجابی تھے، اپنا سامان ان کے ہاں رکھ کر بیت اللہ کی طرف چل پڑے۔ جب میں حرم کے اندر داخل ہوا اور پہلی نظر خانہ کعبہ پر پڑی تو دل کی عجیب کیفیت تھی، بے اختیار آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، اور میں ایک چھوٹے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ یقین جانئے اللہ کے گھر کے متعلق آپ دوسروں سے جو مرضی سنتے رہیں، لیکن جب آپ اپنی آنکھوں سے اس کا دیدار کرتے ہیں تو وہ کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ مجھے رونا آتا ہی نہیں، لیکن اس دن میں اتنا رویا کہ شائد زندگی میں اس سے پہلے یا بعد کبھی رویا ہوں۔ یہی حال میری والدہ ماجدہ اور دیگر ساتھیوں کا تھا۔

عمرہ کے تمام ارکان بحسن وخوبی مکمل کئے۔ طواف، سعی اور باقی ارکان کی ادائیگی میں حاجی بوستان صاحب نے خوب راہنمائی فرمائی کیونکہ وہ اس سے پہلے حج کر چکے تھے۔ میں اس وقت الحمدللہ صحت منداور جوان تھا، لیکن اس کے باوجود تھکاوٹ ہوگئی۔ حرم سے باہر نکلے تو ایک پاکستانی بھائی ہمارا انتظار کر رہے تھے، وہ ہمیں اپنے ساتھ ایک ایسے مکان پر لے گئے جو نیا نیا تعمیر ہوا تھا، ہمیں وہ مکان پسند آیا، اس کے مالک کے ساتھ ملایا گیا، ہم نے کرایہ طے کر کے مکان لے لیا۔ ہم چھ افراد تھے، میں نے جاتے ہی اپنے دل میں

ارادہ کرلیا تھا کہ والدہ صاحبہ کوخود کھانا پکا کر کھلاؤں گا۔ بازار سے کھانے پینے کی اشیاء خرید لیں، اوردن کوتر کاری وغیرہ خود بنالیتا، اورروٹی بازار سے لے کرآتا۔

ہمارا معمول یہ تھا کہ تہجد کی نماز حرم میں جا کر پڑھتے ، پھرفجر اوراشراق تک وہیں رہتے ، واپس آکر ناشتہ وغیرہ کر کے کچھ دیر آرام کرتے ۔ پھرظہر کے لئے جاتے ، اورواپس آکر کھانے کا بندو بست کرتے ۔ پھرعصر میں دوبارہ جاتے اورعشاء کے بعد واپس اپنی رہائیش گاہ پرآتے ۔حاجی بوستان صاحب تبلیغ کے ساتھ وابستہ تھے، وہ کبھی کبھار مجھے اپنے ساتھ مدرسہ صولتیہ لے جاتے ، وہاں جماعت کا کام بہت اچھا ہوتا تھا، زیادہ تر انڈین مسلمان اس کا انتظام چلارہے تھے۔حافظ پٹیل صاحب بھی وہیں پرٹھیرے ہوئے تھے، ان سے بھی دعاءوسلام ہوجاتی تھی۔

پھرآٹھ ذوالحجہ کوسب منیٰ کی طرف چل پڑے۔ ہمارے معلّم صاحب نے ہمیں بس پرسوار کروایا، اور کچھ ہی دیر میں ہم منیٰ پہنچ گئے ۔ وہاں پر بڑے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے ، وہاں قیام کے دوران جماعت کے بزرگ جو کہ ہمارے قافلے میں بہت زیادہ تھے،اس لئے ہروقت کوئی نہ کوئی دین کے حوالے سے اصلاحی بیان فرتے رہتے تھے ساتھ ساتھ ذکرواذکار میں مشغول رہتے تھے۔پھرنو ذوالحجہ کوہم عرفات کے لئے چل پڑے وہاں پرخیمہ کا انتظام تھا۔پورادن میدان عرفات میں گزارنے کے بعدشام کوواپس مزدلفہ کے لئے روانہ ہوگئے، وہاں سے رمی کے لئے کنکریاں اکھٹی کیں، اوررات مزدلفہ میں کھلے آسمان تلے گزارنے کے بعد پھرمنیٰ کے لئے روانہ ہوگئے۔منیٰ پہنچنے کے بعدرمی جمرات، قربانی،حلق اورپھرطواف کے لئے بیت اللہ جانا یہ ساراکام ایک ہی دن میں کرنا حج کا سب سے مشکل ترین عمل ہے۔

ہمارا یہ سارا سفرتبلیغ کے بزرگوں کے ساتھ گزرا،کبھی حافظ پٹیل صاحب دعاء

کرارہے ہیں تو کبھی کوئی اور بزرگ، اور پھر اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ سے ہوتا ہے، اور اللہ کے غیر سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور ہر جگہ اللہ رب العزت کی ذات کی قدرت نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بہت اچھا حج ادا کیا، جس میں تمام ارکان خوب دلجمعی کے ساتھ ادا کئے، اور اس میں حاجی بوستان صاحب نے بہت زیادہ راہنمائی کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

یہاں میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ حج جوانی کا ہے، جب آدمی صحت مند ہو، اور اگر بڑی عمر میں حج کرنا پڑے تو اپنے ساتھ کسی جوان، صحت مند بندے کو ضرور رکھنا چاہیئے بہت مشکل حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔

مکہ میں حج کے تمام ارکان سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے، راستہ میں حاجی صاحب نے بتایا کہ ایک جگہ مچھلی بہت اچھی بنتی ہے، چنانچہ انہوں نے اس جگہ گاڑی رکوائی، ہم نے مچھلی کھائی جو واقعی بہت مزیدار بنی ہوئی تھی۔ ہماری بس میں حکومت کا ایک نمائندہ تھا جو ہمیں بتا رہا تھا کہ مدینہ سے اب ہم کتنے دور ہیں، دل کی عجیب سی کیفیت تھی، وہاں پر درود شریف کا ذکر تھا، اور دل حضور کے روضہ کی زیارت کے لئے تڑپ رہا تھا، ہر مسلمان کے دل کی یہی کیفیت ہوتی ہے جو مجھ پر طاری تھی۔ خیر مدینہ منورہ پہنچے، اپنا سامان ہوٹل میں رکھ کر مسجد نبوی کی طرف چل پڑے۔ پہلی نگاہ جب پڑی تو دل کو عجیب قسم کا سکون ملا۔ اندر جا کر دو رکعت نماز ادا کی، پھر روضہ رسول کی طرف چلے، آقا کے روضہ پر خوب درود وسلام پڑھا، اور دل کھول کر دعائیں کی۔

مولانا سعید احمد خان صاحب کی زیارت

مدینہ شریف میں قیام کے دوران حاجی صاحب نے فرمایا کہ آج مولانا سعید احمد خان صاحب کے ہاں تمام جماعت والے ساتھیوں کی دعوت ہے تم بھی میرے ساتھ

چلو گے، جب وہاں گئے تو دیکھا کہ ایک بالکل چھوٹا سا گھر تھا، اور دوسرے بزرگوں کے علاوہ حافظ پٹیل صاحب بھی موجود تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اتنے بڑے بزرگوں کا دیدار بھی کیا۔ حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب کی بھی زیارت ہوئی۔ جب کھانا رکھا گیا تو حاجی بوستان صاحب نے بتایا کہ یہ سب ان کے گھر والوں نے خود بنایا ہے۔ مولانا سعید صاحب تو خود ایک بہت بڑے اللہ والے تھے، بزرگ تھے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان کی خدمت ہو، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ خود لوگوں کو کھانا ڈال ڈال کر دے رہے تھے اور ان کی خود خدمت کر رہے تھے۔

مولانا سعید احمد خان صاحب نہایت ہی سادہ اور نرم مزاج کے انسان تھے۔ انتہائی دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے تھے، ساری زندگی وہاں دعوت وتبلیغ کا کام کیا، مگر ایک وقت آیا کہ انہیں کہا گیا کہ آپ تبلیغ کا کام یہاں نہیں کر سکتے، انہوں نے کہا کہ اس کام کے لئے تو میں یہاں ہوں، اگر یہ نہیں کر سکتا تو میری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ پھر حکومت نے کہا کہ اگر آپ ہماری بات نہیں مانتے تو آپ کی شہریت ختم کر دیں گے، اور ملک بدر کر دیں گے، انہوں نے فرمایا جو کچھ کرنا ہے کر لیں میں اپنے مشن سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ چنانچہ سعودی حکومت نے انہیں ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق صاحب نے ان کو بلا لیا، اور پھر وہ وہی کام کرتے رہے۔

مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت

پھر ایک دن حاجی صاحب نے نے کہا کہ مولانا زکریاؒ بھی یہیں رہتے ہیں کیوں نہ تمہاری ملاقات ان سے کروا دوں۔ میں نے کہا یہ تو بہت اچھا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا شیڈول بہت مصروف ہے، کیونکہ وہ تہجد سے لے کر اشراق تک مسجد نبوی میں قیام کرتے ہیں، جس میں وہ درود شریف کا ذکر اور اپنے دوسرے معمولات بجالاتے ہیں۔ اس کے بعد

وہ گھر آتے ہیں اور درس وتدریس کا سلسلہ چلتا ہے۔صرف عصر کے بعد ملاقات کرتے ہیں، جب میں حاجی صاحب کے ساتھ وہاں گیا تو کافی لوگ وہاں ان کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، جو بھی ملاقاتی آتا اس کو ملاقات کے بعد اپنے ہاتھ سے چائے کپ میں ڈال کر دیتے۔

حضرت مولانا محمد زکریاؒ کی تبلیغی جماعت کے حوالے سے بہت زیادہ خدمات ہیں۔تبلیغی نصاب ان ہی کا مرتب کیا ہوا ہے جس سے عرب وعجم میں کروڑوں لوگ مستفیض ہورہے ہیں، جس میں علماء حفاظ اور عام آدمی سبھی شامل ہیں، اور یہ فیض ہر طرف جاری ہے۔ میرا ان سے ملنا میری بڑی سعادت اور خوش بختی تھی۔اور ان سے ملنے کے بعد علماء دیوبند پر میرا یقین اور بھی پختہ ہوا ہے۔اگر کوئی دین کا کام کررہا ہے تو یہ اللہ والے بزرگ ہیں جنہوں نے اپنی جائدادیں نہیں بنائیں، صرف اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچایا ہے، جو بھی شخص خالص اللہ کی رضا کی خاطر دین کا کام بغیر کسی دنیاوی لالچ کے کرے وہی ولی اللہ اور حقیقی پیر ہے۔اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

واپسی

مدینہ شریف میں قیام مکمل کرنے کے بعد ہم دوبارہ بیت اللہ شریف آئے اور پھر ایک دو دن وہاں قیام کے بعد جدّہ ائیر پورٹ آ گئے۔وہاں سے اردن پہنچے، وہاں ہوٹل میں قیام کیا۔ہمارے ساتھ مولانا جلاد صاحب بھی تھے، اگلی صبح جب لندن روانہ ہونے کے لئے ائیر پورٹ پہنچے تو بہت سے انگریز مسافر بھی ہمارے ساتھ تھے۔وہ ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے کہ اتنے زیادہ ایشین لوگ بھی برٹش ہیں۔یوں ہمارا یہ حج کا سفر مکمل ہوا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی خلوص دل سے حج کرے تو وہ ایک بالکل نیا انسان بن

جا تا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے جوانی میں حج کیا اور پھر اپنی والدہ اور ماموں کو بھی ساتھ لے کر گیا، اور اپنی ہمت کے مطابق ان کی خدمت کی۔ اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

پاکستان مسلم سینٹر شفیلڈ

پی، ایم، سی کی بلڈنگ

شفیلڈ میں ہماری تعداد کافی ہو گئی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ضروریات بھی بڑھ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ شادی بیاہ کے لئے مناسب جگہ کا نہ ہونا تھا۔ اب تک ہم سکول کے ہال بک کروا کر شادی بیاہ کے پروگرام منعقد کرتے تھے۔ لیکن اس میں مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی کرسی، میز ٹوٹ جائے یا اور کوئی نقصان ہو جائے تو اس کا جرمانہ بھی بھرنا پڑتا تھا، اور دوبارہ بکنگ کے لئے مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور دوسرے باہر سے آئے ہوئے کسی مہمان کے لئے پچاس سو آدمیوں کے لئے کوئی پروگرام منعقد کرنا ہوتا یا پارٹی پروگرام، عید پارٹی وغیرہ کرنا ہوتی تو ہمارے پاس کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔

سب سے پہلے ہم نے یہ تجویز براما لین چرچ میں لیبر پارٹی کی میٹنگ میں رکھی۔ یہ الیکشن کا زمانہ تھا۔ آصف جاجا جو لیبر پارٹی میں کافی سرگرم تھا انہوں نے اس میٹنگ

میں مطالبہ رکھا کہ ہمارے لئے ایک سینٹر ہونا چاہیئے ،اور پھر یہ مطالبہ ہر طرف سے آنے لگا۔ یہاں آپ کے علاقے کے کونسلرز اور ایم ،پی آپ کی بات سنتے ہیں۔اور جب بھی ان کو بلائیں وہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے اپنے ایم، پی ایز اور کونسلرز کے سامنے یہ مطالبہ رکھا۔ پھر بہت سی تنظیمیں تھیں، انہوں نے بھی اس کا مطالبہ کر دیا۔ان میں مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن، ایشین ویلفیئر ایسوسی ایشن مکی مسجد نمایاں تھی۔اس کے علاوہ جو نو جوان کونسل میں کام کرتے تھے انہوں نے بھی ایک گروپ بنا لیا ،اور یہی مطالبہ کرنے لگے، حالانکہ وہ سول سرونٹ تھے، اور ان کا یہ کام نہ تھا، لیکن اس کے باوجود وہ آگے بڑھے پھر پاکستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کا گروپ تھا، ان میں ڈاکٹر ارمانی، اور ممتاز صاحب اور چند دیگر افراد بھی شامل تھے، اور اسی طرح دوسرے افراد نے اس کے لئے آواز بلند کرنا شروع کر دی۔

لیکن دو گروپ اس کام میں پیش پیش تھے، ایک مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن اور دوسرا ایشین ویلفیئر ایسوسی ایشن ۔ پہلے گروپ کا مطالبہ تھا کہ اس سنٹر کا نام مسلم سنٹر ہونا چاہیئے ،اور ہم مکی مسجد والے ان کے ساتھ تھے، دوسری طرف ایشین ویلفیئر ایسوسی ایشن والوں کا مطالبہ تھا کہ ہر علاقہ میں ایک سنٹر ہونا چاہیئے اور اس کا نام ایشین سینٹر ہونا چاہیئے۔ کونسل نے کہا کہ آپ ایک نام پر متفق نہیں ہو سکتے تو آپ کو جگہ کیسے دیں؟ پھر طے ہوا کہ نہ مسلم سنٹر اور نہ ہی ایشین سنٹر بلکہ اس کا نام پاکستان مسلم سنٹر ہونا چاہیئے ، اور یہ بھی طے پایا کہ اس کو وہ ایسوسی ایشن ووٹ دے سکے گی جس کے باقاعدہ بینک اکاونٹ ہوں گے۔ چنانچہ کل سولہ (16) تنظیمیں شارٹ لسٹ ہوئیں، اور ہر تنظیم کو دو ووٹ الاٹ ہوئے۔ ہماری مکی مسجد کی پانچ کمیٹیاں تھیں (1) مکی مسجد (2) مسلم گرلز سکول (3) مکی مسجد یوتھ سنٹر (4) گوڑا ڈومال ڈیتھ کمیٹی (5) جماعت اصلاح المسلمین۔لہٰذا ہمارے دس

نمائندے تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ مکی مسجد ہی زور لگا رہی تھی، جس میں مولانا عبید الرحمٰن اور حاجی بوستان اور میں خود ذاتی طور پر کام کر رہے تھے۔ اس وقت فنڈنگ فیملی اینڈ کمیونٹی سروس کے ذریعے ہوتی تھی۔ اس کی چیئرمین شینا کلارک کو ہم بہت دفعہ سنٹر میں دعوت دے چکے تھے، اور ان کو معلوم تھا کہ جو کام مکی مسجد کر رہی ہے اتنا اور کوئی نہیں کرتا۔ پھر ایم، پی فرنک ہولی کو بھی بلاتے رہتے تھے، اور حاجی بوستان صاحب اس پر بہت محنت کرتے تھے۔ تو پاکستان سنٹر بنانے میں مکی مسجد کا کلیدی کردار تھا۔ چنانچہ کونسل نے سنٹر کے لئے بلڈنگ دے دی۔ 32 ووٹوں میں سے دس ہمارے تھے۔

حاجی بوستان صاحب نے کہا کہ کیوں نہ ہم اپنا آدمی آگے لے کر آئیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کون ہونا چاہیئے؟ انہوں نے کہا کہ میری مرضی ہے کہ انڈسٹری روڈ مسجد ہماری پرانی مسجد ہے، اس کا آدمی لیتے ہیں، پھر اس سنٹر میں دین کا کام بھی ٹھیک ہوگا۔ چنانچہ میں، حاجی بوستان اور صدیق خان، حاجی جعفر خان کے پاس گئے، اور کہا کہ ہم آپ کو اس سنٹر کا چیئرمین بنانا چاہتے ہیں، انہوں نے حامی بھر لی۔ ہم نے اس معاملے میں مولانا عبید الرحمٰن صاحب سے مشورہ نہیں لیا تھا اس لئے کہ زیادہ تر دینی معاملات ہی میں ہم ان سے مشورہ لیتے تھے۔

دوسری طرف ایشین ایسوسی ایشین والوں نے مدنی مسجد میں الیاس صاحب اور صفدر خان سے مشورہ کیا کہ صفدر خان کو چیئرمین بناتے ہیں۔ ممکن ہے اُس وقت ان کو علم نہ ہو کہ ہم جعفر خان کو چن چکے ہیں۔ یہ گروپ مولانا عبید الرحمٰن صاحب کے پاس آیا کہ آپ کے دس ممبر ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ صفدر خان کی حمایت کریں، لیکن ہم تک بات پہنچنے سے پہلے ہی کام ہو چکا تھا، میں، حاجی بوستان اور صدیق خان، جعفر خان کو لے کر مدنی مسجد گئے کہ آپ جعفر خان کو چیئرمین بننے دیں، لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور گروپ بندی ہو

گئی۔مکی مسجد میں بھی دو گروپ بن گئے۔جب الیکشن ہوا تو ہمارا امیدوار جعفر خان چیئر مین بن گیا۔

ہم نے ایک کوارڈینیٹر (Coordinator) بنانا تھا کیونکہ کونسل نے ہم کو تقریباً 108000 پونڈ کی گرانٹ دی تھی کہ آپ اس سے بلڈنگ کو ٹھیک کریں۔میں نے مشورہ دیا کہ درمیان میں چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں ان کو نکال دیں،اور بڑے ہال بنائیں۔ شادی بیاہ اور بڑے پروگراموں میں کام آئیں گے۔اور باہر ایک برآمدہ ہے اس کو بہتر کر کے نماز کی جگہ اور لائبریری بنائیں۔لیکن انہوں نے میری بات کو اہمیت نہیں دی اور کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔

جب کوارڈینیٹر (Coordinator) رکھنے لگے تو میں نے عبدالوہاب کا نام دیا کہ وہ کتنے عرصے سے بغیر تنخواہ کے کام کر رہا تھا،اب اگر اسی کو جاری رکھیں سب نے کہا کہ ٹھیک ہے ووٹنگ ہوگی تو ان کو ہی رکھ لیں گے۔پھر انہوں نے ایک سلیکشن کمیٹی بنانے کی تجویز دی۔میرے ایک دوست نے مجھے کہا کہ اگر آپ مجھے اس کمیٹی میں رکھوا دیں تو میں آپ کے ممبر کو ووٹ دوں گا۔لیکن جب ٹائم آیا تو انہوں نے عبدالقیوم صاحب کو ووٹ دیا۔میں پھر اس کمیٹی میں نہیں گیا۔دوبارہ الیکشن سے پہلے بہت سی نئی تنظیمیں بن گئیں۔

اگلے الیکشن میں پھر جعفر خان چیئر مین بن گئے۔پھر قوم پرستی آ گئی اور میر پور، پنجاب اور خاص کر راولپنڈی ایک طرف ہو گئے۔اب دوبارہ الیکشن سے پہلے طے ہوا کہ (one man one vote) ایک آدمی کا ایک ووٹ ہوگا۔اور جب الیکشن ہوئے تو افسیر شاہین صاحب چیئر مین بن گئے،اور جعفر خان ہار گئے۔پھر آپس میں لڑائی شروع ہوگئی۔اُن کے کوارڈینیٹر (Coordinator) شاہد ملک صاحب تھے،انہوں نے کام شروع تو کر دیا مگر لڑائی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی،یہاں تک کہ سالانہ

رپورٹ بھی کمیٹی پیش نہ کر سکی، اور انہیں سٹی میموریل ہال بک کروانا پڑا۔لیکن وہاں پر اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔اس کمیٹی میں زیادہ تر عمل ودخل ایشین ویلفیئر ایسوسی ایشن کا تھا۔

جب حاجی غلام نبی صاحب چیئرمین بنے تو تب جا کر لڑائیاں ختم ہوئیں۔ وہ جب چیئرمین تھے تو یورپین گرانٹ ملی تو اس سے انہوں نے ایک بڑی بلڈنگ بنائی، اور ایک ریسٹورنٹ بھی، بعد میں وہ ریسٹورنٹ بھی بند ہو گیا۔اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو کچھ گیرج بناتا اور کچھ دوکانیں، اور ایک دو ریسٹورنٹ اور ان کے اوپر رہائیش کے لئے فلیٹ، اور ایک سپورٹ ہال۔اور یہ سب کرایہ پر دیتا جس سے پاکستان سنٹر کو اچھی خاصی آمدن ہوتی۔ لیکن یہ بابو جو آجاتے ہیں ممکن ہے ان کی سوچ اچھی ہو لیکن جو کام ایک ورکر کر سکتا ہے یہ نہیں کر سکتے۔وہ اپنا ٹائم اور جان بھی دیتا ہے اور بغیر تنخواہ کے وہ ایک تنخواہ دار کی طرح کام کرتا ہے۔

حاجی محبت علی چیئرمین محمد علی کے ہمراہ

اب موجودہ وقت میں اس سنٹر کے چیئرمین محمد علی صاحب ہیں۔وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ باقی لیڈر سوئے ہوئے ہیں، وہ اگر جاگ گئے تو پھر پہلے والا کام شروع ہو جائے گا۔میری ہر آدمی سے التماس ہے کہ جو ساتھی آپ کے ساتھ مخلص ہیں ان کی قدر کریں۔

میں جناب محمد علی صاحب سے گزارش کرتا ہوں کہ مسلم سنٹر کا نام رکھنے کا کوئی

مقصد تھا۔ مسلمان دوسروں سے مختلف ہے وہ جہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے جاتا ہے سب سے پہلے نماز کے لئے جگہ ڈھونڈتا ہے۔ جب پہلی کمیٹی میں سب سے زیادہ ممبر رکھنے والا میں تھا، میری خواہش تھی کہ سنٹر میں نماز کے لئے الگ جگہ بنائی جائے، اگر کوئی قانونی مسئلہ ہو تو اس کو لائبریری یا سٹڈی روم کا نام دے سکتے ہیں۔ اور کافی شیڈ پڑے ہوئے ہیں ایک اچھی سی روم نماز کے لئے بن سکتی ہے۔ اگر کونسل رقم خرچ نہیں کرسکتی تو مسلمان اپنی جیب سے دے دیں گے۔

دوسری چیز جس کی ضرورت ہے وہ کھیلوں کا ہال ہے۔ ہمیں جو ملین گرانٹ ملی تھی وہ اس طرح کی ضرورتوں پر خرچ ہونی چاہیئے جو کمیونٹی کی ضرورت ہے، نہ کہ آفس بنانے کے لئے، وہ کونسل کے پاس اپنے بہت ہیں۔

اور آخری بات یہ کہ باقاعدہ ممبر شپ ہونی چاہئے، اور اس کے لئے کم از کم پانچ (5) پونڈ فیس ہونی چاہئے۔

اور الیکشن سب کمیٹی کے ہونے چاہیں۔ ایک سال ایک چیئرمین اور دو ایگزیکٹیو ممبر ہوں، اور یہ سلسلہ یوں ہی چلے تو پانچ سال میں سب کا نمبر آجائے گا، اور کوئی لڑائی نہیں ہوگی۔ اور جو بھی عہدیدار آئے گا اچھے طریقے سے کام کرسکے گا۔

میں نے جو ٹھیک سمجھا لکھ دیا اگر کسی کو اختلاف ہو تو اس کا حق ہے۔

میر پور مدرسہ جامعہ اسلامیہ

یہ کوئی 1983ء کی بات ہے حاجی بوستان صاحب نے مجھ سے بات کی میر پور سے ڈاکٹر یعقوب صاحب آئے تھے، اور انہوں نے بتایا ہے کہ ہم میر پور سیکٹر F/2 میں ایک پلاٹ ہے اور وہاں مدرسہ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے لئے کافی مشکلات ہیں۔ ایک تو بریلوی حضرات ہمارے لئے مشکلات کھڑی کر رہے ہیں اور دوسرے مالی وسائل بھی کم ہیں اگر آپ ہماری مدد کریں اور اس کا چارج سنبھال لیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں اور ہم سب ساتھیوں کو ساتھ ملا کر اس کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ میں نے حامی بھر لی اور 10 اگست 1983ء کو مکی مسجد میں انگلینڈ بھر سے مختلف ساتھیوں کو جمع کیا۔ ان کے سامنے بات رکھی کہ ڈاکٹر یعقوب صاحب اور ان کے ساتھیوں کے لئے مدرسہ بنانا بہت مشکل ہے، اور میر پور میں دیو بندی ویسے بھی کم ہیں اگر تمام ساتھی اس سلسلہ میں اپنا تعاون کریں تو یہ کام ہو سکتا ہے۔ سب جماعت کے ساتھی تھے وہ فوراً تیار ہو گئے اور نقد چندہ جمع ہو گیا۔ جتنا چندہ جمع ہوا ہم نے بینک میں جمع کروا دیا اور یہ اکاونٹ میرے اور حاجی بوستان کے نام تھا اور جب تک دونوں دستخط نہ کریں، پیسے نہیں نکل سکتے تھے۔

پھر ہم نے عملی طور پر کام شروع کر دیا۔ میرے پاس اپنی گاڑی تھی، جہاں بھی جانا ہوتا میں اور حاجی صاحب اکھٹے جاتے۔ میں نے اپنی دوکان لی تو وہاں پر بھی چندہ بکس رکھ دیا۔ میرے بھائی نے بھی گیرج بنایا، اور وہاں پر بھی چندہ بکس رکھا۔ اس وقت ہم تینوں بھائی تین جسم لیکن ایک جان تھے۔ میں کوئی بھی بات کرتا تو میری پوری فیملی میرا مان رکھتی تھی۔ حاجی صاحب کی ساری فیملی اس وقت ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ ویسے بھی اُس وقت خاندان یا برادری کی سوچ نہیں تھی۔ اصل مقصد دین کا فروغ تھا، کیونکہ میں کسی اور جگہ بھی یہ بات لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک دیوبندی علماء ہی اصل میں دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور اس بات کی فکر تھی کہ ہمارے خاندان، گاؤں اور شہر والے اور باقی افراد بھی انہی علماءِ حق کی طرف مائل ہو جائیں۔ ہم کوئی چیز اپنے نام نہیں کرنا چاہتے تھے، اور یہی طے ہوا اور کام شروع ہو گیا۔

میرا پاکستان جانا تو بہت کم ہوتا تھا، حاجی صاحب کے ذمہ تبلیغی کام اور دوسرے ممالک کے دورے اور میر پور مدرسہ کا کام تھا۔ میرا زیادہ عمل ودخل نہیں تھا۔ ہاں یہاں انگلینڈ میں مالی تعاون کے سلسلے میں برابر کا شریک تھا۔ جب کبھی میر پور جاتا تو جن لوگوں کو مالی تعاون اور دیگر معاملات میں مدرسے کا معاون پاتا، اُن میں نفیس بیکری والے چوہدری محمد سلیم صاحب، ڈاکٹر اختر الزمان غوری صاحب، میاں ممتاز صاحب سب سے نمایاں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی افراد تھے جوں جوں مدرسہ تعمیر ہوتا گیا اس کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا گیا، اور تعاون کرنے والے بھی مزید شامل ہوتے رہے جن میں چوہدری محمد حسین ایڈووکیٹ بھی شامل ہیں، وہ یہاں انگلینڈ میں اپنے بچوں کے پاس رادھرم آئے، پھر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا، اور اس کے بعد وہ مکی مسجد میں جمعہ کے نمازی بن گئے کبھی کبھار میرے گھر آجاتے، یا کہیں اور مل بیٹھتے۔ پھر جب وہ پاکستان واپس گئے تو حاجی

صاحب نے ان کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ان کو بہت لوگ جانتے تھے،اُن کی وجہ سے مدرسہ کو بہت فائدہ ہوا،اورانہوں نے مدرسے کو بہت وقت دیا۔

1992ء میں جب میری والدہ بیمار ہوگئی تو میں اپنی فیملی کو لے کر میر پور گیا۔ جمعہ پڑھنے مدرسے میں گیا تو وہاں جمعہ نہیں ہورہا تھا۔میں نے جب وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ کچھ علمائے کرام کہیں جمعہ پڑھتے ہیں اور کچھ کہیں۔میں نے کہا کہ اگلا جمعہ ہم یہاں ہی ادا کریں گے۔جب ہم نے اگلے جمعہ کو نماز جمعہ شروع کی تو عین جمعہ کے وقت ہمارے پڑوس میں واقع بریلوی مسلک کی مسجد والوں نے لاؤڈ سپیکر پر ٹیپ ریکارڈ لگا دیا تا کہ ہمارے جمعہ کے اندر خلل پیدا ہوا۔اگلے جمعہ کو میں نے اپنی جیب سے پیسے دیئے اور لاؤڈ سپیکر کا انتظام کردیا۔میں تقریباً چار مہینے وہاں رہا،اوراس دوران با قاعدگی سے وہاں جمعہ ہوتا رہا،اورالحمدللہ آج تک جاری ہے۔

مدرسے کے تعمیراتی کام سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا،اور حاجی صاحب سارے انتظامات کرتے تھے۔پھر ہمارے ایک نوجوان محمد یونس صاحب حفظ مکمل کر کے کراچی گئے،اوروہاں عالم اور مفتی کا کورس مکمل کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ میں واپس انگلینڈ نہیں جاؤں گا۔حاجی بوستان صاحب نے ان سے کہا کہ میں آپ کو مدرسہ کا نگران بناتا ہوں،آپ میری سرپرستی میں کام کریں۔وہ ایک متحرک نوجوان تھا،اس نے اپنی پوری کوشش کی لیکن چند وجوہات کی بنا پر اُن کی حاجی صاحب کے ساتھ بات چل نہ سکی اور وہ مدرسہ چھوڑ گئے۔لیکن مدرسہ چلتا رہا اور دن بدن ترقی کرتا رہا۔

پھر ہمارے گروپ میں رادھرم سے حاجی اللہ دتہ صاحب کی فیملی بھی شامل ہوگئی جو کہ بہت شریف فیملی ہے اوران کے پورے خاندان نے مدرسے کے ساتھ بھر پور مالی تعاون کیا جو ہزاروں پونڈ میں ہوتا تھا۔پھر حاجی صاحب نے مدرسہ کا نیا اکاؤنٹ کھول لیا تو

اس میں میرا نام نہیں تھا، لیکن میں پھر بھی ساتھ رہا۔اس کے بعد حافظ اعجاز صاحب جن کا میر پور میں کاروں کا کاروبار ہے وہ بھی مدرسے کے ساتھ شامل ہو گئے اور مدرسہ کی کافی خدمت کی۔

میر پور مدرسہ جامعہ اسلامیہ

حاجی صاحب کے چھوٹے بھائی حاجی نجیب بھی پاکستان چلے گئے اور مدرسے کے انتظامات دیکھنے لگے۔ پھر شیخ مشتاق صاحب بھی اس ٹیم میں شامل ہو گئے۔ میر پور سے ہمارے دو دوست چوہدری محمد بشیر صاحب اور ملک شفیق صاحب بھی آ گئے۔ حاجی صاحب جب میر پور جاتے تو ان کے ساتھ زیادہ تر یہی دو افراد ہوتے تھے۔

پھر جب 2001ء میں حاجی صاحب ڈیوز بری منتقل ہو گئے تو اس کے بعد میرا ان کے ساتھ پہلے جیسا تعلق باقی نہ رہا، لیکن میل وملاقات کا سلسلہ اچھے طریقے سے چلتا رہا آہستہ آہستہ حاجی صاحب پیر بن گئے، اب ماشاءاللہ ان کے مریدوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن چند وجوہات کی بناء پر ان کے پرانے ساتھی ان سے دور ہو گئے ہیں، اور اب ان کے ساتھ نئی ٹیم آ گئی ہے، اور نئے نئے لوگوں سے تعلقات بن گئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو مزید ترقی دے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ جس وقت مدرسہ کا آغاز کیا تھا تو ہماری سوچ یہی تھی کہ

جس طرح باقی مدارس چل رہے ہیں ہم اس مدرسے کو اُس طرح نہیں چلائیں گے۔ہم نے کبھی اس کا ٹرسٹی بننے کا نہیں سوچا تھا، جو بھی ساتھی شامل ہوتا تھا وہ محض اللہ کی رضا کے لئے اور دین کا کام سمجھ کر شامل ہوتا تھا۔ مدرسے کی انتظامیہ کو بتایا ہوا تھا کہ جو بھی ساتھی انگلینڈ سے مدرسے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، وہ جب بھی مدرسے میں آئیں ان کا خوب اکرام کریں۔ اور یہ سلسلہ بڑے اچھے طریقے سے چلتا رہا، میں جب بھی مدرسہ میں جاتا تو کمرہ نمبر 2 میں میری رہائیش ہوتی، اور کمرہ نمبر 1 میں سب ساتھی مل بیٹھتے، اور حاجی صاحب بھی بات کرتے کہ ہم سب اس کام میں شامل ہیں۔

مدرسہ کو چلانے میں جہاں مدرسے کا اساتذہ اور دیگر احباب کا کردار ہے وہاں پر میں مرحوم چوہدری قربان کو کیسے بھلا سکتا ہوں جنہوں نے تیس (30) سال مدرسے کی خدمت کی۔

آخر میں ایک بات حاجی بوستان صاحب کی میں نقل کرنا چاہتا ہوں، وہ اکثر کہا کرتے تھے، جب بندہ پیر بن جاتا ہے تو اس کے پاس پاور، مال اور عورت دوڑ کر آتے ہیں، اگر ان کے ہوتے ہوئے وہ بچ گیا تو ٹھیک، نہیں تو لوگوں کو نقصان اٹھاتے دیکھا ہے۔

میر پور مدرسہ جامعہ اسلامیہ

صوبہ سرحد (KPK) کا سفر

میں 1979ء میں براستہ سڑک ایک وین پاکستان لے کر آیا تھا، اس وقت کسٹم طورخم سے ہوتی تھی۔ میں نے وہاں کے ایک مقامی ساتھی کو جو میرپور میں رہتا تھا ساتھ لیا اور وہاں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہٹیاں تک میں گاڑی چلا رہا تھا، لیکن اس کے بعد دوسرے ساتھی نے کہا کہ میں گاڑی چلاؤں گا، کیونکہ اگر کوئی واقعہ پیش آ گیا تو بہت مشکل بن جائے گی۔ اگر خدانخواستہ حادثہ پیش آ گیا اور ایک بکری بھی گاڑی کے نیچے آ گئی تو پوری گاڑی دینے پڑے گی۔

ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، ایک عجیب خوف کی فضا چھا رہی تھی، ہر آدمی کے پاس رائفل اٹھائی ہوئی تھی، بڑی بڑی حویلیاں بنی ہوئی تھیں، اردگرد کوئی مکانات نہیں تھے، پتھریلی اور ناقابل کاشت زمین، لوگوں کی زبان بھی بالکل مختلف تھی، مجھے تو میرے ساتھ جانے والے ساتھی نے بالکل خاموش رہنے کا کہا تھا کہ اگر تم بات کرو گے تو وہ اجنبی سمجھ کر داؤ لگانے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے میں خاموش تھا۔

میں نے پورا یورپ، ترکی، ایران اور اس کے بعد جاپان، سنگاپور اور عرب ممالک کا سفر کیا ہے، لیکن خدا گواہ ہے اتنا خوف مجھے کہیں محسوس نہیں ہوا، یہاں تو جان ہتھیلی پر رکھ کر سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ دوسری طرف میں یہ سوچتا ہوں کہ میں جن بھائیوں کے پاس گیا تھا، وہ پاکستان میں ہر جگہ بلا خوف وخطر جاتے ہیں، اور اکثر جگہوں پر تو کاروبار بھی ان کے ہیں۔ خود ہمارے میرپور، چکسواری، اور ڈڈیال میں بے شمار دوکانیں انہیں بھائیوں کی ہیں۔

جس وقت منگلا ڈیم بنا تو ہم میر پور والے پنجاب اور سندھ میں تو گئے ہیں، لیکن سرحد کی طرف کسی کی جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خوف کی فضا نہیں ہونی چاہیئے، اور بالخصوص وہاں کے علماء اور سیاسی لوگوں کو چاہیئے کہ ان لوگوں میں سے تنگ نظری کو ختم کریں اور اپنے آپ کو قومی دھارے میں لے کر آئیں۔ہم سب پاکستانی ہیں۔ ٹھیک ہے علاقائی محبت ہر ایک کے دل میں ہوتی ہے لیکن ملک سب سے پہلے آتا ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی اپنے مشاہدے کی کروں کہ دنیا میں دو قومیں ایسی ہیں جو اپنے آدمی سے صرف اپنی زبان میں بات کریں گی، خواہ تیسرا بندہ ان کے درمیان میں ایسا ہو جو ان کی زبان نہ سمجھتا ہو۔ایک انگریز، اور دوسرے پٹھان۔ ورنہ اس کے علاوہ میں نے دوسرے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ دوسروں کا خیال کرتے ہیں، اور جس ساتھی کو ان کی زبان نہیں آتی اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اس کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، اور وہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرے اب اگر کچھ لوگوں کے اندر اس طرح کی لسانی عصبیت ہو اور وہ قومی لیڈر بننے کا دعویٰ کریں تو میں ایسے لوگوں کو قومی لیڈر نہیں مانتا۔

کراچی کا سفر

یہ 1984ء کی بات ہے کہ میں اور حاجی بوستان صاحب پاکستان گئے اور اس سفر میں کراچی بھی جانا ہوا۔ میں اس سے پہلے 1961ء میں کراچی گیا تھا، اس وقت اردو بولنے والوں کا راج چلتا تھا۔ زبان اردو، لباس پتلون اور شرٹ، اور جدھر جاتے بس اردو والے نظر آتے تھے، شہر کا بندوبست اچھے طریقے سے چل رہا تھا۔ مگر اب کی بار جب ہم کراچی گئے تو وہ پہلے والا کراچی نہیں تھا۔ اب دو کمیونٹیوں کی لڑائی صاف نظر آرہی تھی۔ ایک طرف مہاجر گروپ، اور دوسری طرف الطاف گروپ، ایک کا لیڈر الطاف بھائی، اور دوسرے کے آفاق بھائی، دونوں میں شدید لڑائی جاری تھی، اور درجنوں کے حساب سے

ایک دوسرے کے لوگ قتل کئے جارہے تھے۔

پھر دوسری طرف پٹھانوں کے بھی دو گروپ بنے ہوئے تھے، ایک مذہبی گروپ جس کے لیڈر مفتی احمد الرحمٰن صاحب تھے اور وہی ہمارے میزبان بھی تھے وہ اس وقت سواد اعظم اہل سنت والجماعت کے امیر تھے، اللہ مغفرت فرمائے بہت اچھے انسان تھے۔ دوسرا گروپ عوامی نیشنل پارٹی کا تھا، جن کا زیادہ زور سہراب گوٹھ کی طرف تھا، لیکن یہ لوگ اتنے طاقت ور نہیں تھے ۔مذہبی طبقہ کا ووٹ بینک زیادہ تھا۔ بہر حال یہ 1961ء والا کراچی نہیں تھا، اس میں باہر سے بہت سے لوگ آ کر آباد ہو چکے تھے۔ ہم ایدھی سینٹر بھی گئے لیکن وہاں کے صفائی کے نظام سے ہم خوش نہیں تھے۔

لیبیا کا سفر
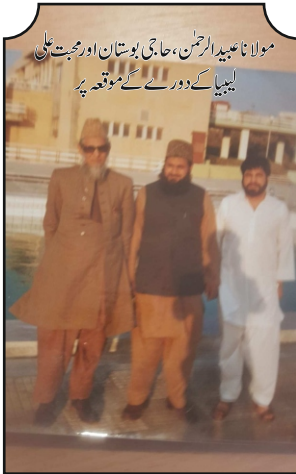
مولانا عبید الرحمٰن، حاجی بوستان اور محبت علی
لیبیا کے دورے کے موقعہ پر

13 ،اگست 1982ء کو میں ، مولانا عبید الرحمٰن صاحب اور حاجی بوستان صاحب صبح 6 بجے شفیلڈ سے بذریعہ ریل گاڑی لندن کے لئے روانہ ہوئے، اور تقریباً صبح 9 بجے ہم لندن پہنچ گئے۔ اس کے بعد 3 بجے لندن ائیر پورٹ سے لیبیا کے لئے روانہ ہوئے اور صبح چھ بجے ٹرپلی پہنچ گئے۔ ہمارا یہ سفر دراصل ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے تھا، جو کہ جمعیۃ الدعوۃ الاسلامی نے منعقد کی تھی ، اور اس کے آرگنائزر احمد شریف جنرل سیکرٹری آف مذہبی امور تھے۔ انہوں نے پوری دنیا سے علماء کرام کو بلایا ہوا تھا۔ انگلینڈ سے شیخ ذکی

بیداوی، مولانا عیسیٰ منصوری اور مولانا نثار یو کے، ایم اور کچھ اور حضرات بھی شامل تھے۔

اس کانفرنس کا مقصد اس بات پر غور و حوض کرنا تھا کہ کس طرح سب مسلمان مل کرامت مسلمہ کی خدمت کر سکتے ہیں۔اور دوسرا کرنل قذافی صاحب نے ایک گرین کتاب لکھی تھی اس کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی اس کو دور کرنا تھا کہ یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔

ہماری رہائیش طرابلس شہر کے ایک بڑے فائیو سٹار ہوٹل میں تھی ،جس کا نام باب البحر تھا۔ پوری دنیا سے قریباً 600 علماء کرام اور سکالر آئے ہوئے تھے۔ ہمارے وفد کی سربراہی ذکی بیداوی صاحب کر رہے تھے۔ چودہ اگست کو صبح کانفرنس کا آغاز ہوا، اس میں چارسو کے قریب افراد شریک تھے۔تقریریں ہوئیں، اس کے بعد شام کو اسلامی کونسل کی طرف سے ایک بہت بڑی دعوت دی گئی جو بہت شاندار دعوت تھی۔ دوسرے دن پھر کانفرنس شروع ہوئی، آغاز صبح 9 بجے ہوا، مختلف موضوعات پر ہر ملک کے سکالرز نے گفتگو کی۔

اس کانفرنس میں تمام مسالک کے نمائندے شریک تھے، جن میں سنی، شیعہ، اہل حدیث سبھی شامل تھے۔ پاکستان سے حضرت مولانا عبدالحکیم صاحبؒ راولپنڈی، اور قاری محمد یوسف صاحب تھے اور ایک پشاور کے پروفیسر صاحب تھے جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ انڈیا سے مولانا وحیدالدین صاحب، ایران سے مولانا یونس صاحب تھے۔

ایک واقعہ جو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کانفرنس کے ایک سیکشن میں شیخ ذکی بیداوی نے مکالمہ پڑھا، اور اس میں کہا کہ خطبہ جمعہ عربی میں ضروری نہیں بلکہ کسی بھی مقامی زبان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ حاجی بوستان صاحب کو اس پر اعتراض تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ کوئی پاکستانی عالم اس کا جواب دے، انہوں نے مولانا عبدالحکیم صاحبؒ کو کہا، لیکن

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر مولانا نثار صاحب سے کہا تو انہوں نے حاجی صاحب سے کہا کہ فقہ حنفی میں یہ جائز ہے لیکن حاجی صاحب اس پر مصر تھے کہ اس کا جواب آنا چاہیئے، پھر جب حاجی صاحب کی باری آئی تو کسی اور موضوع پر بات چل رہی تھی، لیکن حاجی صاحب نے اسی خطبے والے موضوع پر بات شروع کردی تو ایرانی عالم مولانا یونس کھڑے ہو گئے اور کہا کہ جناب اس موضوع پر تو بات صبح کے سیکشن میں ہو چکی۔ اب جو موضوع چل رہا ہے اس پر بات کریں، اب حاجی صاحب کا پسینہ چھوٹ گیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی بات مکمل کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اتنے بڑے مجمع میں جہاں دنیا بھر سے سکالرز جمع تھے حاجی صاحب کا اس طرح بات کرنا بھی ان کی بہت بڑی بہادری تھی۔ جب سٹیج سے نیچے آئے تو کہنے لگے محبت آج پہلی دفعہ تقریر کرتے ہوئے پسینہ آیا ہے۔

پھر آخری دن تمام علماء و سکالرز اکھٹے ہوئے، کرنل قذافی خود بھی اس سیشن میں موجود تھے انہوں نے عربی میں ایک جاندار تقریر کی، اور اپنی کتاب کے متعلق لوگوں کی غلطی فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ تقریر کر ہی رہے تھے کہ ایک افریقن عورت نے ان کی تعریف شروع کردی، تو کرنل صاحب نے کیمرہ مین سے کہا کہ اس عورت کے فوٹو لو۔ میں نے دل میں سوچا کہ وہ تو ویسے بھی فوٹو لے رہا تھا، اب کرنل صاحب کو کیا ضرورت تھی ایسا کرنے کی۔

بہرحال کانفرنس اختتام پذیر ہوگئی، اور شام کو بلدیہ طرابلس نے ایک باغ میں ہم سب مہمانوں کے لئے ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ باغ میں ہر طرف لائٹیں لگی ہوئی تھیں، اور قالین بچھے ہوئے تھے، ہر آدمی کے آگے میز اور طرح طرح کے کھانے لگے ہوئے تھے۔ دف بھی بجایا جا رہا تھا۔ میری زندگی میں کسی حکومتی سطح کے بڑے لوگوں کے

ساتھ یہ پہلا تجربہ تھا۔رات گئے تک یہ محفل رہی۔

اگلے دن ہم نے اپنی مرضی سے شہر کی سیر کرنی تھی۔ ہم نے ایک بہت خوبصورت کالونی دیکھی جو کہ غریب لوگوں کے لئے بنائی گئی تھی۔پھر ایک نہر دیکھی جس کے ساتھ بہت سے باغات اور درخت لگے ہوئے تھے۔ہمیں بتایا گیا کہ اس کے ذریعے سے بہت سے رقبے کو قابل کاشت بنایا گیا ہے۔ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ حالات کیسے ہیں؟ تو انہوں نے کہا سب اچھا ہے۔لیکن ان کے چہرے ان کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔لیکن اس کے علاوہ وہ کہہ بھی کیا سکتے تھے،ورنہ ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔کچھ بزنس مین ہمیں بتا چکے تھے کہ جو نظام کرنل قذافی لے کر آئے ہیں،اس میں انہوں نے وہ لوگ جن کے پاس ایک سے زائد دوکانیں تھیں وہ ان سے لے لیں،اور اسی طرح مکان بھی۔اور جن کے پاس نہیں تھے ان کو دے دیئے۔

ہم ایک بہت بڑی دوکان میں کچھ تحفے لینے کے لئے گئے تو جو نوجوان لڑکے لڑکیاں سٹور میں کام کر رہے تھے،انہیں گاہکوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔آپس میں خوب گپ شپ کر رہے تھے اور ہم جس چیز کا پوچھتے تو کہتے ختم ہوگئی ہے۔اگر دس چیزوں کا پوچھا تو ممکن ہے دو تین ہی ملی ہوں۔ان کو اس بات کی فکر نہ تھی کہ کسٹمر بغیر چیز کے چلا جائے گا،انہیں صرف اپنی تنخواہ سے غرض تھی جو ان کو ہر ماہ مل جاتی تھی۔میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس حکومت والوں نے ہماری تو بہت خدمت کی ہے،لیکن اپنی قوم کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ہمارا سچا مذہب ہے جس میں پوری زندگی کا نظام موجود ہے،لیکن ہم اس کو چھوڑ کر ایک ادھار نظام لے کر چلتے ہیں جس سے نہ دنیا بنتی ہے اور نہ ہی آخرت،مگر کیا کیا جائے بڑے لوگوں کے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔پھر اسی شام کو ہمارے وفد کے جنرل سیکرٹری کی احمد شریف کے ساتھ ملاقات ہوئی،اور اگلے روز 20 اگست کو ہم واپس آ گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی نظام اپنایا جائے وہ سب کے لئے ہو، یہ نہ سوچیں کہ میں نے ساری زندگی اقتدار میں رہنا ہے۔ جتنا وقت مل جائے اسے غنیمت سمجھیں اور عوام کی خدمت کریں۔ ہمارے ملکوں میں اسلامی نظام تو بالکل بھی نہیں ہے کہیں بادشاہت ہے، کہیں فوجی حکومت اور کہیں نام نہاد جمہوریت۔ بادشاہت سعودی عرب، مراکش، اور اردن وغیرہ میں ہے، جہاں سب سے پہلے خاندان، پھر تعلق دار اور آخر میں عوام کو کچھ مل جاتا ہے

پھر جہاں فوجی حکومتیں ہوتی ہیں تو وہاں ایک آدمی کی حکومت ہوتی ہے سارا مال اس کا اور اس کے تعلق داروں کا ہوتا ہے، اور عوام کی قسمت میں نعرہ بازی ہوتی ہے کہ امریکہ برا ہے، یورپ شیطان ہے، مگر اپنی اولادیں وہیں پرورش پاتی ہیں، تعلیم حاصل کرتی ہیں، اور اپنے سارے اکاؤنٹ بھی وہیں کھلتے ہیں۔ فوجی حکمران کی خواہش ہوتی ہے کہ ساری زندگی اس کی اور اس کی اولاد کی حکمرانی رہے۔ لیکن آخر کار عوام تنگ ہو کر ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

جب لڑائی شروع ہوتی ہے تو امریکہ کو مدد کے لئے بلاتے ہیں، جس کے نتیجے میں سارے کا سارا ملک تباہ ہو جاتا ہے۔ لیبیا، عراق، شام، مصر اور تیونس، الجزائر میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ جن ملکوں میں بادشاہت ہے وہ ابھی تک چل تو رہے ہیں لیکن وہاں پر شخصی آزادی بالکل نہیں ہے، اور لوگ غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان، ترکی، بنگلہ دیش میں کبھی کبھی جمہوریت کا تڑکہ لگا دیا جاتا ہے، لیکن فوج ہی اصل طاقت رکھتی ہے۔ اگر الیکشن بھی کروانے ہیں تو اس میں بھی عمل دخل انہی کا ہوتا ہے، اور اپنے کٹھ پتلی آگے کر دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی آنکھ دکھاتا ہے تو اس کو چلتا کر دیتے ہیں۔ لوگوں کو نعرہ دیتے ہیں کہ یہ حکمران چور ہیں، اور پھر خود براہ راست آ کر دس دس سال تک بیٹھ جاتے ہیں۔ اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم آپ کے خیر خواہ ہیں۔

لیکن ایک بات طے ہے کہ جب بھی بغیر دباؤ کے عوام کو موقع دیا گیا انہوں نے عوامی لیڈر کا انتخاب کیا۔محترمہ فاطمہ جناح میدان میں آئیں تو جنرل ایوب نے ان کو انڈیا کا ایجنٹ قرار دیا۔بھٹو صاحب آئے تو جنرل ضیاء الحق نے ان کو اندر کر دیا، اور پھر پھانسی دے دی۔ بے نظیر اور نواز شریف جب تک ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے تو باری باری اقتدار حاصل کرتے رہے، لیکن جب انہوں نے آنکھیں دکھائیں تو ایک کو شہید کر دیا گیا، اور دوسرے کو ذلیل کر کے اس کی زندگی جہنم بنا دی گئی۔لیکن مشرف صاحب مزے کر رہے ہی۔

آج کل ایک اور لیڈر آ گیا ہے جس کا صرف ایک ہی کام ہے ،اور وہ ہے اپوزیشن کو گالیاں دینا، باقی کا کام اس کو سلیکٹ کر کے لانے والے کر رہے ہیں، اگر یہ پانچ سال پورے کر گیا تو پھر پاکستان کا اللہ ہی حافظ ہے۔

انگلینڈ میں سیاسی سرگرمیاں

1961ء میں جب انگلینڈ آیا تو اس سے پہلے میر پور کے لوگ 1940ء میں سیکڑوں کی تعداد میں آچکے تھے، کیونکہ جب انگریزوں کی انڈیا پر حکومت تھی تو اس وقت ہمارے لوگ مرچنٹ نیوی میں کام کرتے تھے۔ انگلینڈ کی امپورٹ، ایکسپورٹ اسی ذریعہ سے ہوتی تھی، اور یہ لوگ اس میں لیبر کے طور پر کام کرتے تھے۔ پھر جب برصغیر کی تقسیم ہوئی اور پاکستان اور انڈیا آزاد ہو گئے تو یہ لوگ واپس گئے اور میر پور والے بھی واپس گئے اور لوگوں کو بتایا کہ انگلینڈ میں بہت کام ہے، اور پیسہ بھی بہت ہے۔ یہ سن کر بہت سے لوگوں نے انگلینڈ آنے کی کوشش شروع کر دی، مگر حکومت پاکستان آزاد کشمیر کے لوگوں کو آنے نہیں دیتی تھی۔ لیکن 1953ء میں پاکستان حکومت نے اعلان کر دیا کہ جو آدمی 1100 روپے زرضمانت جمع کرائے گا اس کو اجازت دے دیں گے۔

اس کے بعد ہمارے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آنے شروع ہو گئے۔ اس وقت کوئی ویزا نہیں تھا جس کی مرضی ہوتی کام کے لئے آ سکتا تھا۔ اس وقت پاکستان سے ریٹائیرڈ فوجی، بالخصوص راولپنڈی سے بڑی تعداد میں آئے۔ ہم جس جہاز میں آئے تھے اس میں بھی ایک ریٹائیرڈ فوجی افسر ہمارے ساتھ تھے، اور ہماری بڑی مدد کی تھی۔

ہمارے جو بزرگ 1940ء میں یہاں آئے انہوں نے اپنے گھر آباد کر لئے تھے۔ انگلینڈ کے تمام مشہور شہروں میں میر پور کے ہزاروں افراد آباد تھے۔ ان کی انگریز بیویاں تھیں، اور ان سے اولاد بھی۔ اس کے علاوہ کاروبار اور اپنی گاڑیاں بھی تھیں۔ جس شہر میں ہمارے علاقے کا کوئی بزرگ ہوتا تو اس کے گاؤں والے اس کے پاس آ کر ٹھیرتے،

وہ ان کی خوب مدد کرتے ،تھوڑے عرصہ میں وہ اپنے کسی اور رشتہ دار کو بلا لیتے ،اور یوں 1962ء تک ہماری تعداد ہزاروں میں ہوگئی۔ پھر حکومت نے دیکھا کہ پوری دنیا سے لوگ آرہے ہیں تو انہوں نے قانون بنایا کہ ہر آدمی اپنی بیوی بچوں کو بلاسکتا ہے۔ 1966ء میں حکومت نے بغیر ویزہ کے اس ملک میں آنے پر پابندی لگادی۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ میرپور والوں کو جنرل ایوب نے انگلینڈ بھیجا ہے یہ سراسر غلط ہے۔ اگر ایوب کو بھیجنا ہی تھا تو وہ تربیلا ڈیم والوں کو بھیجتے۔ جب منگلا ڈیم 1967ء کو مکمل ہوا تو اس سے پہلے بہت زیادہ لوگ میرپور سے آکر برطانیہ آباد ہو چکے تھے۔ شروع شروع میں کاغذی کاروائی کے حوالے سے ہم لوگوں کو یہاں برطانیہ میں کافی مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ اگر میت پاکستان بھیجنی ہوتی تو کافی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ پاسپورٹ کے لئے یا دوسرے کاغذات کے لئے ہائی کمشنر جانا پڑتا تو وہاں کئی ایک مشکلات ہوتیں۔

مجھے بذات خود ہائی کمشنر میں ایک کام پڑ گیا تو اس وقت ہمارے ہائی کمشنر کرنل محمد یوسف صاحب تھے ،انہوں نے مختلف حیلے بھانے بنائے کہ یہ کرو وہ کرو۔ لیکن کچھ تنظیمیں اور افراد ایسے تھے جو کمیونٹی کی بہت خدمت کر رہے تھے۔ شفیلڈ میں مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن بن گئی جس کے چیئرمین چوہدری کرم داد صاحب اور سیکرٹری محمد رفیق قریشی ،جو محمد نثار قریشی اکاؤنٹنٹ کے رشتہ دار تھے۔ میں نے ان سے دو تین لیٹر بنوائے۔ اسی طرح برمنگھم میں چوہدری محمد زمان تھے ،وہ وہاں لوگوں کی خدمت کر رہے تھے۔ نوٹنگھم میں چوہدری مٹھو صاحب تھے۔ ان لوگوں کی بیویاں انگریز تھیں ،اور پڑھی لکھی تھیں تو ان کے ذریعے انہوں نے لوگوں کی بہت مدد کی۔ کسی کو مکان لینا ہوتا یا اور کوئی انگریزی کا مسئلہ ہوتا تو یہ لوگ پیش پیش ہوتے۔

پھر ہمیں مسجدوں کی ضرورت پڑی تو شفیلڈ میں سب سے پہلی مسجد 13 ،انڈسٹری

روڈ پر بنی۔ اوراس کا آغاز چوہدری علی حیدر اور چوہدری کرم داد صاحب نے کیا۔ ہماری دینی ضروریات پورا کرنے کے لئے ان بزرگوں کا بنیادی کردار تھا۔ برمنگھم میں جو سنٹرل مسجد بنی اس کے بنانے والے چوہدری محمد زمان تھے۔انہوں نے اوران کے ساتھیوں نے جواس وقت پلان بنایا تھا اس میں مسجد کے علاوہ رہائیشی فلیٹ، کار پارک اور کمیونٹی سنٹر بھی تھا،لیکن وہ کسی وجہ سے اس طرح نہ ہوسکا،اور کچھ اورلوگوں نے ٹیک اور کرلیا،اور پھر چالیس سال تک وہ مسجد پوری طرح تیار نہ ہوسکی۔کار پارک وغیرہ بہت دیر بعد تیار ہوئی۔اب بڑے طویل عرصے کے بعد ایک بڑی توسیع کا کام ہورہا ہے۔ بہرحال ان بزرگوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق بہت کام کیا۔فیکٹریوں میں کام کرنے والوں سے لے کر مکانات لینے تک،اوراپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں ان کا بہت بڑا کردار ہے۔

پھر جونوجوان 1960ء کے بعد آئے وہ ایک قدم اور آگے بڑھے، کچھ بس ڈرائیور بنے کچھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بنے، کچھ کونسل میں ملازم ہو گئے، کچھ لوگوں نے سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کرلی۔

اگر میں شفیلڈ کی بات کروں توان میں ایک چوہدری محمد ولایت صاحب ہیں۔وہ لیبر پارٹی میں شامل ہوئے اس کے بعد وہ کونسلر بنے۔انہوں نے حکومت کے سامنے کچھ مطالبات رکھے کہ ہم اقلیتوں کو وہ تمام حقوق حاصل نہیں جو ہونے چاہیئے۔ایک کمیٹی بنائی جائے جو اقلیتوں کے حقوق کے متعلق حکومت کو آگاہی دے۔اس مطالبے میں اورلوگ بھی شامل تھے۔اور یہ مطالبہ منظور ہوااور ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا نام ریس ریلیشن بورڈ رکھا گیا جس کے چیئرمین سرجعفری ولسن تھے۔پھران کو ہرشہر کے ممبروں نے اپنے شہر میں بلایا۔

ہم نے 13، اکتوبر 1975ء کوانہیں شفیلڈ بلایا۔سٹی سینٹر میں کلاسک سینما کے نیچے خواجہ عبدالرؤف کے ریسٹورنٹ میں دعوت دی،اوران کواپنے مطالبات بتائے کہ ہم

لوگوں کو فیکٹریوں میں بہت تکلیف ہوتی ہے ۔ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو کو حکومتی اداروں میں کام نہیں ملتا۔اس کے بعداس کمیٹی نے پورے برطانیہ میں ہمارے مسائل کے حل میں بہت اہم کردارادا کیا۔

برطانیہ میں لیبر پارٹی چونکہ ہمیشہ سے متوسط اور نچلے طبقے کی نمائندہ آواز بنی رہی ہے۔اس لئے ہمارے لوگوں کا رجحان شروع ہی سے اسی جماعت کی طرف رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نوٹنگھم سے محمد اسلم صاحب اس وقت بھی لیبر پارٹی کے سرکردہ راہنما تھے، اور اس پوزیشن میں تھے کہ وہ ایم ، پی بھی بن سکیں ،لیکن کچھ اپنوں کی مہربانیوں کی وجہ سے وہ نہ بن سکے، اور یہ ہر شہر میں تھا۔ گلاسکو میں بشیر خان صاحب تھے جو نمایاں تھے، اسی طرح بریڈ فورڈ میں عجائب خان صاحب ، لندن میں مولانا یعقوب چشتی اور صبغت اللہ قادری وغیرہ ایسی شخصیات تھیں جو سیاست میں اپنا نام بنارہی تھیں۔

چوہدری محمد ولایت

محبت علی، چوہدری ولایت اور کونسلر ٹونی ڈیم کے ساتھ

یہاں شفیلڈ میں چوہدری محمد ولایت صاحب سب سے آگے تھے ۔ ان کا اپنا نیٹ ورک بہت اچھا تھا، کیونکہ یہاں کے تمام مقامی لوگوں کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ انہی تعلقات کی بنیاد پر وہ کونسلر بھی منتخب ہوئے۔ پھر پولیس کے ساتھ ان کا کافی قریبی تعلق تھا، اس کے علاوہ بہت سے ٹربیونل میں بھی بیٹھتے تھے۔ دوسری طرف وہ

پاکستان ویلفیئر ایسوسی ایشن کے بھی چیئر مین تھے۔ پھر انہوں نے سب کمیونٹی کو ساتھ ملا کر ایتھنک منارٹی پروجیکٹ شروع کیا، جس کا میں خزانچی تھا، اس کا دفتر سپیٹل ہل میں بنایا، اس میں چار ورکر کی گرانٹ ملی تھی۔ سب سے پہلے ایک انگریز لڑکی کو ورکر رکھا گیا، پھر اس کے علاوہ مزید ورکر بھی رکھے گئے۔ یہ کمیٹی تین چار سال چلتی رہے، پھر ختم ہو گئی۔ افریقن کمیونٹی نے اپنا سنٹر بنالیا جو کہ صداقہ کے نام سے تھا، اور پاکستان ویلفیئر ایسوسی ایشن نے اپنا دفتر سٹار ورک ڈارنل میں کھول لیا۔

پھر چوہدری محمد ولایت نے Police Minority Liaison Panel کے نام سے ایک اور کام شروع کیا، اس میں پولیس اور کچھ مزید لوگ بھی شامل تھے۔ اس پینل میں ان مسائل کو اٹھایا جاتا تھا جو ہمیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے تھے۔ جیسا کہ انگریز پڑوسی تنگ کرتے تھے، یا دوکان میں نوجوان لڑکے تنگ کرتے تھے یا پھر ٹیکسی میں لوگوں کو کافی تکلیف ہوتی تھی تو اس پلیٹ فارم پر بہت سے لوگوں کے مسائل حل ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کوئی بندہ اچھا کام کر رہا ہوتا ہے تو ہمارے لوگوں میں حسد فوراً آجاتا ہے، اور اس کی ٹانگیں کھینچنے لگتے ہیں۔ یہی کام چوہدری محمد ولایت کے ساتھ ہوا۔ ان کے خلاف ایک امیدوار کھڑا کر کے اُس کے ذریعے چوہدری محمد ولایت کو ہرایا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پلیٹ فارم پھر اس طرح سے فعال نہ رہا۔

پھر جب 13 ستمبر 1983ء کو پاکستان ویلفیئر ایسوسی ایشن کے الیکشن ہوئے تو اس میں چوہدری محمد رفیق کو چیئر مین بنایا گیا، اور غلام نبی صاحب اور خواجہ محمد لطیف صاحب وائس چیئر مین اور میں خزانچی بنا۔ اور سیکرٹری چوہدری محمد ولایت کو مقرر کیا گیا، اور سٹار ورکر میں کام شروع کیا گیا۔ ولایت صاحب بہت اچھا کام کر رہے تھے، مگر کچھ لوگوں نے ان کی مخالفت شروع کر دی، اور اس وجہ سے چوہدری صاحب نے کام چھوڑ دیا اور کہا کہ آپ

جانیں اور آپ کا کام ۔اس دن کے بعد سے پاکستان ویلفیئر ایسوسی ایشن کا نام نہیں سنا۔

ایشین ویلفیئر ایسوسی ایشن

اب کچھ ذکر ایشین ویلفیئر ایسوسی ایشن کا بھی کر دوں ۔اس کے کوآرڈینیٹر (Coordinator) محمد اختر کیانی صاحب تھے، اور ان کے دست راست راجہ قربان صاحب تھے انہوں نے بھی مل ہاؤس کے علاقے میں بہت اچھا کام چلایا ہوا تھا۔ان کی سٹی کونسل میں اچھی انڈرسٹینڈنگ تھی۔سٹی لیڈر اور مختلف اتھارٹی کے ساتھ اچھے تعلقات بنائے ہوئے تھے۔اگر کسی کو پولیس یا ایم، پی یا کونسل کے حوالے سے کوئی کام ہوتا تو اختر کیانی صاحب سب سے آگے ہوتے تھے۔

جب مکی مسجد میں انگریز لڑکوں نے کچھ شرارت کی تھی تو اس موقع پر جو جلسہ منعقد کیا گیا تھا اس میں وہ پیش پیش تھے۔نہایت ہی شریف اور اعلیٰ اخلاق کے حامل انسان تھے۔کونسل میں لوگوں کے حقوق کے لئے لڑائی لڑتے۔تو دوسری طرف دینی حوالے سے دیکھا جائے تو مدینہ مسجد بنانے والوں میں بھی وہ صف اوّل میں تھے۔

1983ء میں جب لوگوں کے پاس کام نہیں تھا تو حکومت نے مختلف سکیمیں شروع کیں تو ان کو معلوم ہوا کہ یورپین گرانٹ جاری ہوئی ہے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آپ میرا ساتھ دیں، اور ہیلی باتھ میں جو زمین بیکار پڑی ہوئی ہے وہ ہم لے لیں، اور وہاں سپورٹس ہال اور کمیونٹی کے لئے مختلف سنٹر بنا سکتے ہیں ۔ اور حکومت اس کے لئے لاکھوں پاؤنڈز دینے کے لئے تیار تھی تا کہ ہر کمیونٹی کو فائدہ ہو،لیکن اس میں بھی گروپ بندی ہوگئی۔ایک کشمیری گروپ اور دوسرا پاکستانی گروپ۔

پاکستانی گروپ حاوی ہوگیا مگر پھر ان سے یہ کام نہ ہوسکا۔پھر راجہ شفیق صاحب چیئرمین بنے اور چوہدری شوکت صاحب خزانچی اس کے بعد یہ ایسوسی ایشن بھی گوشہ نشینی

میں چلی گئی۔

ماسٹر راجہ محمد نذیر

ایک شخصیت جن کا میں ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی وہ ماسٹر راجہ محمد نذیر صاحب ہیں وہ ایک عوامی نمائندہ تھے۔ کوئی فارم پُر کرنا ہو، یا کسی بھی دفتر کو کوئی خط لکھنا ہو تو وہ ہر وقت خدمت کے لئے تیار رہتے تھے۔ پھر وہ مختلف مسجدوں کے بھی ممبر تھے۔ ابھی بھی مدینہ مسجد کے ٹرسٹی ہیں۔ جب سیکشن گیارہ کے تحت تعلیم بالغاں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت انہوں نے بطور ٹیچر بھی خدمات سرانجام دیں۔ سٹی کونسل میں کونسلر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ وہ نہایت ہی خوش اخلاق اور ملنسار انسان ہیں۔ کہیں کسی کے ہاں کوئی فوتگی ہو جائے تو ان کی خدمت کے لئے فوراً حاضر ہو جاتے ہیں، پورے شفیلڈ میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

1990ء سے ہمارے لوگ کونسلر سے آگے ایم، پی اور لارڈ کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ چوہدری سرور گلاسکو سے ایم، پی بن گئے۔ برمنگھم سے خالد صاحب اور ڈیوز بری سے سعیدہ وارثی اور آہستہ آہستہ اور لوگ بھی اسمبلی میں پہنچنا شروع ہو گئے۔ پھر مختلف کونسل میں ہمارے لارڈ میئر بھی منتخب ہوئے۔ بریڈ فورڈ سے عجائب صاحب پہلے پاکستانی لارڈ میئر بنے۔ پھر شفیلڈ سے راجہ محمد قربان اور چوہدری طالب صاحب لارڈ میئر بنے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اور برطانیہ کے بڑے بڑے شہروں جن میں برمنگھم، نوٹنگھم وغیرہ شامل ہیں میں کئی پاکستانی لارڈ میئر منتخب ہوئے۔

لارڈ نذیر احمد

1998ء میں ایک اور نوجوان ہاؤس آف لارڈ میں پہلے پاکستانی اور کشمیری نوجوان منتخب ہوئے، میری مراد ہے" لارڈ نذیر احمد"۔ ان سے میری پرانی شناسائی ہے۔ وہ

میر پور میں میرے پڑوسی تھے، اور یہاں رادھرم میں بھی ان کے بزرگ میرے دوست تھے۔ چوہدری محمد مالک اور حاجی کرم الٰہی صاحب سے میرے بڑے اچھے تعلقات رہے ہیں۔ میں نے نذیر صاحب کو ایک مذہبی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پہلی بار سنا تو اسی وقت میرے دل میں یہ پختہ یقین ہو گیا کہ یہ نوجوان آگے چل کر کوئی بڑا کام کرے گا۔

پھر ایک دفعہ میں میر پور گیا تو ہم نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو میر پور دعوت دی ہوئی تھی، وہاں نذیر صاحب بھی موجود تھے، ہم نے ان کی ملاقات نذیر صاحب سے کروائی۔ پھر شفیلڈ میں اکثر ان سے ملاقات رہتی تھی۔ جب وہ لارڈ بن گئے تو بہت مختصر عرصہ میں دنیا بھر کے مظلوموں اور بالخصوص کشمیر کے مظلوم بھائیوں کی آواز بن گئے۔ برطانیہ میں بھی وہ مسلمانوں کے لیڈر کی حیثیت سے نمایاں ہو گئے، انہیں ہر فورم پر بلایا جانے لگا اور وہ وہاں ضرور پہنچتے۔ پھر شفیلڈ میں ان کے ارد گرد چار پانچ لوگوں کا گروپ بن گیا، جو سائے کی طرح ان سے چپک گئے۔ کچھ ان کی وجہ سے اور کچھ وہ بڑے بڑے گروپ اور حکومتیں جن کو وہ بے نقاب کرتے تھے ان کی مخالفت اور دشمنی کی وجہ سے وہ انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ اکثر اس میں سرخرو ہوئے، لیکن بالآخر وہ لوگ اپنی سازشوں میں کامیاب ہو گئے، اور ان کو لارڈ کی حیثیت سے استعفیٰ دینا پڑا، جو کہ ہم سب کے لئے بہت بڑا نقصان ہے کہ مسلم دنیا ایک نڈر لیڈر سے محروم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

2000ء میں کچھ اور ترقی ہوئی اور ہمارے شہر شفیلڈ میں لیبر پارٹی کے علاوہ لب ڈیم میں کچھ لوگ شامل ہوئے جن میں تین نام قابل ذکر ہیں:

علی قدر صاحب

(1) علی قدر صاحب وہ بارہ سال کونسلر رہے ہیں، وہ ایک کم گو آدمی ہیں۔ کمیونٹی

کے لئے تو کوئی اہم کام نہیں کئے لیکن اپنی پارٹی میں کافی فعّال رہے ہیں۔ وہ ایک دفعہ ہار گئے، پھر ان کی خواہش تھی کہ پارٹی ان کو ایم ۔ پی منتخب کروائے جو کہ کافی مشکل تھا، اس پر انہوں نے لب ڈیم چھوڑ کر لیبر جوائن کر لی، حالانکہ لب ڈیم میں ان کو کافی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی پارٹی کو ان کے اس رویئے سے کافی افسوس ہوا کہ ہم نے ان کو اتنی عزت دی، لیکن وہ ہمیں چھوڑ گئے۔

محمد عظیم

(2) دوسرے کونسلر محمد عظیم ہیں جو لمبا عرصہ تو کونسلر نہیں رہے، اور میٹنگ وغیرہ میں بھی جانا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے مگر ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنا دفتر کمیونٹی سنٹر بنایا ہوا ہے، جسے بھی پاسپورٹ بنانا ہو، یا اور کوئی کاغذی کاروائی کروانی ہو تو وہ ہر وقت حاضر رہتے ہیں۔ ہر آدمی سے دوستی رکھی ہوئی ہے، اور خدمت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

کونسلر محمد شفق

(3) تیسرے نوجوان راہنما کونسلر محمد شفق ہیں۔ وہ ایک پروفیشنل آدمی ہیں، اپنی پارٹی کے وفادار ہیں، اور پاکستانی اور انگلش کمیونٹی میں ایک پُل کا کردار ادا کر رہے ہیں وہ کونسلر سے اپنی جماعت کے شیڈو لیڈر بن گئے ہیں، اگر لب ڈیم کی اکثریت ہوتی ہے تو وہ شفیلڈ میں سٹی لیڈر بن سکتے ہیں۔ ابھی جب یورپین الیکشن ہوئے تھے تو پورے یارک شائر اور ہمبر سائیڈ کے ممبر آف یورپین پارلیمنٹ منتخب ہوئے، اور اس الیکشن میں 90 فیصد ووٹ گوروں کا تھا۔ اگر آپ کام کریں تو یہ لوگ آپ کو صلہ بھی دیتے ہیں، اس مختصر عرصہ میں انہوں نے اپنے ملک کی بھرپور نمائندگی کی، اور ساتھ ہی کشمیر کے حوالے سے انہوں نے کافی کام کیا۔ اور انڈیا کی قرارداد کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میری ان سے ایک

ہی التماس ہے کہ پاکستانی سیاست سے دور رہیں اور یہاں کے لوگوں کی خدمت کریں۔

کونسلر ابرار خان

ہمارے ایک اور نوجوان کونسلر ابرار خان ہیں۔ وہ بھی یہاں شفیلڈ میں لوگوں کی خدمت کے لئے بڑے فعال ہیں۔ ان کی کوششوں سے سب مساجد والے اکھٹے ہوئے اور طویل جدوجہد کے بعد اس مقصد میں کامیاب ہوئے کہ اگر کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کی میت جلد از جلد ریلیز ہو سکے، جس سے ہم سب کو بہت سہولت حاصل ہوئی۔ وہ اس سے زیادہ بھی کرنا چاہتے تھے لیکن کچھ لوگوں نے انہیں وہ کام کرنے نہیں دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہماری ایک جنازہ گاہ ہو مگر اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

ڈاکٹر شاہ نواز

محبت علی ڈاکٹر شاہ نواز کے ہمراہ مینار پاکستان پر

اب میں ایک اور ہیرے کی بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہیں جناب ڈاکٹر شاہ نواز جو کہ سرجن پروفیسر ہیں۔ ان سے میری سب سے پہلی ملاقات مکی مسجد میں ہوئی۔ وہ کافی عرصہ شفیلڈ کے ایک دوسرے علاقہ ٹینز لی میں رہتے تھے۔ پھر جب وہ ہمارے علاقہ میں آباد ہوئے تو ان سے مستقل ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن ہیں

، چار مہینے لگا چکے ہیں۔ ہر سال چالیس دن با قاعدہ جماعت کے ساتھ لگاتے ہیں۔اور دیگر مذہبی معاملات میں بھی پیش پیش ہوتے ہیں۔لیکن میں یہاں ان کا تعارف دوسری حیثیت سے کروانا چاہتا ہوں ۔میرے بہت سے دوست ڈاکٹر اور جاننے والے ہیں،مگر ان کی زندگی بڑی مختلف ہے وہ سب اپنے لوگوں کی آبادی میں نہیں رہتے بلکہ امیر امیر ایریاز کا انتخاب کرتے ہیں۔ دوسرا وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں،لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے ،بس اپنے ایک محدود و مخصوص حلقے میں رہتے ہیں۔عام عوام سے دور دور رہتے ہیں ۔اگر ان سے کوئی مشورہ لیا جائے ،تو کم ہی دیتے ہیں،اور اگر بامر مجبوری بحیثیت ڈاکٹر کے آپ کو انہیں اپنے گھر بلانا پڑے تو بہت مشکل ہے کہ وہ آپ کے گھر آئیں۔

لیکن ڈاکٹر شاہ نواز کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہونے کے باوجود ان تکلفات سے کوسوں دور ہیں ہر سوال کا تسلّی بخش جواب دیتے ہیں،اگر آپ کا کوئی رشتہ دار بطور وزٹر یہاں آجائے تو اس کے لئے بغیر معاوضہ کے نسخہ لکھ کے دیتے ہیں،اور اگر کسی کو ہسپتال داخل کرنے کی نوبت آجائے تو اس کے لئے اپنی پوری کوشش اور مدد کرتے ہیں ۔کوئی آدمی کہیں بھی تکلیف میں مبتلا ہو تو فوراً حاضر ہوجاتے ہیں ۔ ہر آدمی سے بے تکلّفانہ گفتگو کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگوں کو ان کی سادگی سے یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ یہ ڈاکٹر ہیں بھی کہ نہیں۔

اگر آپ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کسی گروپ میں ہوں تو انہیں خدمت کے اندر صف اوّل میں پائیں گے،آپ یہ گمان نہیں کر سکتے کہ یہ ڈاکٹر ہیں۔پھر جتنے نئے ڈاکٹر ہیں ان کے لئے آپ رول ماڈل ہیں ۔ ہر ایک نوجوان کی مدد کرتے ہیں،ان سے محبت کرتے ہیں ، اور بالخصوص چھوٹے بچوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے ہیں ،اور ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ میرا ایک پوتا عمیر اکثر میرے ساتھ

ہوتا تھا تو ڈاکٹر صاحب اس کے ساتھ ہمیشہ تعلیم کے بارے میں باتیں کرتے اوراس کو کچھ بننے کا جذبہ دلاتے تھے ۔ایک دفعہ ہمارے ایک پاکستانی لیڈر آئے ہوئے تھے ،اور پاکستان سنٹر میں ایک پروگرام تھا،ڈاکٹر صاحب نے اسے اتنا شوق دلایا کہ اس نے کہا آج میں تقریر کروں گا ،لیکن سٹیج سیکرٹری نے باوجود ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے اسے موقع نہ دیا کہ آگے جا کر کہیں یہ میری جگہ نہ لے لے۔

خیر بات ڈاکٹر صاحب کی ہورہی تھی ،انہیں بڑا شوق تھا کہ کس طرح پاکستان میں لوگوں کی خدمت کی جائے ۔میر پور میں بریڈ فورڈ کے کچھ ساتھیوں نے مل کر ایک ہسپتال قائم کیا تھا جن میں ایک نمایاں نام محمد امین صاحب کا تھا،انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے مینجمنٹ بورڈ میں رکھ لیااور ڈاکٹر صاحب جب بھی پاکستان جاتے اس ہسپتال کو اپنا ٹائم دیتے تھے اور لوگوں کی خدمت کرتے تھے ۔ایک دفعہ میں اور ڈاکٹر صاحب اکٹھے پاکستان گئے ،انہوں نے میر پور کے تمام ڈاکٹرز حضرات کو جمع کیا اور انہیں بہت مفید مشورے دیئے پھر راولپنڈی گئے اور وہاں پمز ہسپتال کے ڈاکٹروں سے ملے ۔ڈاکٹر صاحب نے میر پور کے لوگوں کی مشکلات کا ذکر کیا،جس پر انہوں نے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔وہاں راجہ محمد ثقلین صاحب کی دعوت میں جب ڈاکٹر صاحب نے یہ بات رکھی کہ جس میڈیکل شعبہ سے میرا تعلق ہے اس کے پاکستان میں بہت کم ہسپتال ہیں ،اور ڈاکٹر بھی بہت کم ہیں ،جس پر ایک کرنل صاحب نے بڑی حیرت کا اظہار کیا،ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک رفاہی جماعت کے وفد کے ساتھ پاکستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا،جس میں راولپنڈی ،لاہور،اور کراچی شامل ہے ۔وہ جہاں بھی گئے انہوں نے کہا کہ ہم آپ کی ہر طرح کی لاجسٹک سپورٹ کرنے کے لئے تیار ہیں ،لیکن انہیں اس بات پر سخت مایوسی ہوئی کہ وہ جہاں بھی گئے لوگوں نے ان سے نقد امداد کا مطالبہ کیا،جس

سے دلبرداشتہ ہوکرانہوں نے پاکستان کا نام لیناہی چھوڑ دیا۔

اب ڈاکٹر صاحب نے ایک اور آرگنا ئیزیشن بنائی ہے جس میں برطانیہ، پاکستان اور UAE کے وسکلر سرجن ڈاکٹرممبر ہیں جس کے وہ چیئر مین ہیں۔اوران کی یہ بھر پور خواہش ہے کہ کسی طرح پاکستانی بھائیوں کی مدد کرسکیں، کیونکہ یہ شعبہ بہت مشکل میں ہے۔بہت تھوڑی مشینیں ہیں اور معلومات بھی بہت کم ہیں۔حکومت پاکستان کو چاہئے کہ ان جیسے مخلص لوگوں سے مشورہ لے جولوگوں کی خلوص دل سے خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔یہ لوگ پیسوں کے بھوکے نہیں بلکہ صرف انسانی جذبہ سے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

میئرصادق خان

اب میں ایک اور بہت بڑے لیڈر کی بات کرنے لگا ہوں اور وہ ہیں میئر صادق خان جوکہ برطانیہ کے سب سے بڑے شہرلندن کے میئر ہیں۔لندن دنیا کا ایک مشہور شہر ہے جو دنیا بھر کی سیاست کا مرکز ہے۔بے شمار لوگ اس کی سیر وتفریح کے لئے آتے ہیں ۔ملکہ برطانیہ کا گھر ہے۔اور ہاؤس آف لارڈ اور ہاؤس آف کامن بھی وہیں ہیں۔بے شمار کاروباراوراتنے بڑے شہر کا میئر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اگر میں کہوں کہ وزیراعظم کے بعد اگرکوئی اہم ترین منصب ہےتو وہ لندن میئر کا ہےتو بیجا نہ ہوگا۔اور پھرایک بس ڈرائیور کا بیٹا ہوکرسخت مخالفت کے باوجود میئر بن جانا بہت بڑا کارنامہ ہے،اوروہ بھی براہ راست انتخابات کے ذریعے،جہاں پاکستان کے موجودہ وزیراعظم عمران خان نے خود آکر ان کے مخالف غیرمسلم امیدوار کے حق میں انتخابی مہم چلائی اورلوگوں سے ووٹ مانگے،لیکن اس کے باوجود وہ میئر منتخب ہو گئے،اوراب تک بڑے اچھے طریقے سے نظام چلا رہے ہیں۔

ان کی بڑی اچھی خوبی یہ ہے کہ پاکستان کے سیاستدانوں اور بیوروکریٹ سے دور رہتے ہیں۔صرف لندن کے لوگوں کی خدمت کرتے ہیں،اور اس میں رنگ ونسل ، مذہب اور علاقائی تعصب سے بالاتر ہوکر ہرایک کے کام آتے ہیں،اورانہیں لیبر پارٹی کی بھرپورحمایت حاصل ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اپنی محنت اورلگن سے وہ اس ملک کے وزیر اعظم بھی بن سکتے ہیں۔بس اپنے آپ کو پاکستانی سیاست دانوں سے دور رکھیں۔

اور میری ان سے ایک اور بھی گزارش ہے کہ جتنے پاکستانی یہاں اپنی کرپشن چھپانے کے لئے پناہ لئے ہوئے ہیں۔جو یہاں مزدوری کے لئےنہیں بلکہ وہاں لوٹ مارکر کے یہاں آکر بینک بیلنس بناتے ہیں۔اور بڑی بڑی بلڈنگیں خریدتے ہیں،اوراپنے بینک اکاؤنٹ بھر کر رفو چکر ہو جاتے ہیں ،ان سب کا ڈیٹا جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کریں۔اوراس میں جوبھی ملوث ہوخواہ سیاستدان ہوں ، یا فوجی ،ججز ہوں یا پولیس والے، بیوروکریٹ ہوں یا بزنس مین سب کا ڈیٹا جمع کیا جائے ،تا کہ کم ازکم لوگوں کوان چوروں کی اصلیت معلوم ہوسکے۔

یہاں پر پاکستانی سیاستدانوں کو سیاسی سرگرمیوں کی بالکل اجازت نہیں ہونی چاہئے جو یہاں کھاپی کراور مال بٹورکر چلے جاتے ہیں۔اور ہمیں آپس میں لڑوادیتے ہیں، جب پیسے لینے کی باری آتی ہےتو ہم اورسیز پاکستانی بھائی ہوتے ہیں۔اور جب کچھ دینے کی باری آتی ہےتو ہم فارن نیشنل بن جاتے ہیں ۔میں تو یہ بھی کہوں گا کہ جسے پاکستانی سیاست کا شوق ہےتو وہ وہیں جا کردو چارسال رہ کراپنی سیاست کا شوق پورا کرلے۔اگر صادق خان صاحب ان میں سے کچھ کام کرلیں تو ہماری آنے والی نسلوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

ایم،پی ناز شاہ

اگر میں خواتین کے حوالے سے ایم۔پی ناز شاہ کی بات نہ کروں تو یہ بھی زیادتی ہو گی۔ کشمیر کی بیٹی ہونے کے ناطے وہ کشمیری بھائیوں کی آواز کو ایوانوں کے اندر اور باہر بلند کرتی رہتی ہیں۔اس کے علاوہ عورتوں کے حقوق کے حوالے سے بھی وہ ایک بہت مضبوط آواز ہیں،ہمیں ان پر فخر ہے۔

کونسلر معروف زمان

معروف زمان صاحب شفیلڈ کی معروف ومشہور سیاسی وسماجی شخصیت ہیں۔ وہ شفیلڈ ہی میں پیدا ہوئے اور اپنی تعلیم یہیں حاصل کی ،اس کے والد صاحب مکی مسجد کے بنانے والوں میں شامل تھے۔معروف صاحب نے اپنی دینی تعلیم مکی مسجد سے حاصل کی ، پھر مسلم یوتھ سنٹر کی کرکٹ ٹیم کے کیپٹن رہے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے شفیلڈ کونسل میں کام شروع کر دیا۔وہ کونسل پراپرٹی کے سیلز اینڈ پلاننگ ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے، کونسل میں ان کی بڑی قدر کی جاتی تھی ،بڑے بڑے پروجیکٹ کی منظوری وہی دیتے تھے، تمام کنٹریکٹروں سے اچھی طرح واقف تھے۔پھر کونسل نے تمام ورکر کو ایک کمپنی کے انڈر کر دیا تو معروف صاحب نے وہاں کام چھوڑ دیا اور شفیلڈ کی ایک بہت بڑی نجی کمپنی مارک جیکسن میں کام شروع کر دیا۔شفیلڈ میں پراپرٹی کی خرید وفروخت اسی کمپنی کے ذریعے ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ لب ڈیم کی طرف سے کونسلر بھی منتخب ہو گئے۔

ان کا حلقۂ انتخاب زیادہ تر انگریز کمیونٹی پر مشتمل ہے۔زبردست سپیکر ہیں، بہت ہی سمجھدار انسان ہیں۔اپنی پارٹی کی ہائی کمانڈ کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں،اپنی پارٹی کے ایڈوائزر بھی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آگے چل کر وہ ایم ،پی کے لئے بہترین چوائس ہونگے ۔ میرے ساتھ ان کی اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے،اور بزنس کے موضوع پر بھی

تبادلہ خیال ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک دن معروف صاحب سے کہا کہ کوئی مشورہ دیں کہ آرٹرکلف کے علاقہ کو کس طرح بہتر کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں پر انگریز کمیونٹی کی ایک کمیٹی کام کر رہی ہے جس کے چیئرمین ڈیوڈ ہیں۔ میں نے کہا کہ کیوں نہ ہم ایشین کمیونٹی کی ایک کمیٹی بنائیں کیونکہ وہاں زیادہ بزنس ہمارے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ بہت اچھا مشورہ ہے، آپ مجھے جو کام دیں گے حاضر ہوں۔ اس کے بعد میں نے شبیر مغل اور محمد ایوب صاحب سے بھی کہا کہ آرٹرکلف کا ایریا چالیس سال سے بیکار پڑا ہوا ہے، کافی سے زیادہ جگہ خالی پڑی ہوئی ہے، فیکٹریاں بند ہو گئی ہیں، ہماری دو کانیں بھی خالی ہیں کیوں نہ ہم شفیلڈ کونسل کو شامل کریں اور انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ اس ایریا کو ڈویلپ کرنے کے لئے اپنا کردار ادا کریں، وہ بھی اس کام کے لئے تیار ہو گئے۔

ہم نے ایک کمیٹی بنائی جس میں ساتھیوں نے مجھے چیئرمین، شبیر مغل صاحب کو وائس چیئرمین اور معروف زمان صاحب سیکرٹری بنے اور ایوب صاحب کو خزانچی بنایا گیا، اور اس تنظیم کو آٹرکلف ایشین بزنس کنکشن کا نام دیا گیا۔ انگریز کمیٹی کی آرگنائزیشن کے ساتھ مل کر اس کام کو آگے بڑھایا، پھر کونسل نے بھی ایک آفیسر دے دیا تاکہ اس پروجیکٹ کو آگے لے کر چلے۔ ہم نے اپنے ایریا کے ایم، پی کلاؤ بٹ کو بھی بلایا اور ان کے سامنے سارا پروجیکٹ رکھا اور سب نے مل کر دس سالہ پلان ترتیب دیا، جس کے تحت اس ایریا میں نئے مکان، سکول اور مختلف پروجیکٹ بنائے جائیں گے، ایک سکول کھل گیا ہے، اور نئے مکانات کا پلان بن رہا ہے، ایک چھوٹا کام جو ہم نے شروع کیا جو کہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ آرٹرکلف میں داخل ہوتے وقت ایک بڑی بلڈنگ پر لکھا ہوا ہے ویلکم ٹو آرٹرکلف اور دوسرے کونے پر میری دوکان پر بھی سلوگن کندہ ہے۔ ہم نے یہ ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے جس میں ہمارا کوئی کمال نہیں بلکہ معروف صاحب کا اہم رول ہے۔ اس

کے علاوہ شبیر مغل صاحب ایک بہت بڑا نام ہے کمیونٹی کا کام کرنے والے ہیں، ان کا میڈیا کی طرف رجحان ہے، ہر سال ریڈیو رمضان کے نام سے پورا مہینہ پروگرام کرتے ہیں، انہیں پورے سال کے لئے ریڈیو کی اجازت مل گئی تھی لیکن کسی غلط فہمی کی بنیاد پر لائیسنس واپس لے لیا گیا تھا، مگر انہوں نے اپنی کوشش جاری رکھی ہوئی ہے امید ہے ایک دن ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

باقی معروف زمان نے عثمانیہ ایجوکیشن سنٹر کے لئے نئی مسجد اور سینٹر کی پلاننگ پرومیشن لینے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے، اپنی ان سیاسی وسماجی خدمات کی وجہ سے انہیں شفیلڈ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مرتضیٰ اعوان صاحب

چند شخصیات اور ہیں جن کی سماجی خدمات کا میں معترف ہوں۔ان میں ایک مرتضیٰ اعوان صاحب ہیں جو کہ سٹی پولیس میں شامل ہوئے اور ایک اہل آفیسر بنے۔ان کی تعلیم مکمل ہوئی تو وہ پاکستان چلے گئے، اور وہاں فوج میں شامل ہو گئے۔پھر مختلف محاذوں پر خدمات سرانجام دیں جن میں سیاہ چین، کراچی، اور کشمیر بارڈر شامل ہیں۔پھر والدین کے واپس بلانے پر وہ برٹش پولیس کا حصہ بن گئے۔

ایک پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہت اچھے مسلمان بھی ہیں۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند، اور ہمہ وقت لوگوں کی خدمات کے لئے تیار رہتے ہیں۔میں نے بہت کم پولیس والے ایسے دیکھے ہیں جو ان کی طرح باجماعت نماز کی پابندی کرتے ہوں، اور اشراق تک مسجد میں پڑھنے کا اہتمام کرتے ہوں۔ہمیں ایسے آفیسر پر فخر ہے جو ہمارا روشن چہرہ ہیں۔

اگر میڈیا کی بات کروں تو طارق عزیز اور ان کی بیٹی نے 90 کی دہائی میں جو نام

کمایا ان کے بعد کوئی خاطر خواہ نام برطانیہ کی تاریخ میں سامنے نہیں آ سکا۔شفیلڈ میں ہمارے دونوجوان محمد یاسین اور شفقت مرزا کافی ایکٹیو ہیں۔فوج میں کوئی ایسا نام سامنے نہیں آیا جومشہور ہوا ہو،اور ہمارے لوگوں کی اس طرف توجہ بھی کم ہے۔

آخر میں دونوجوانوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے شفیلڈ میں مختلف تنظیموں سے مل کر بزرگوں اور کمیونٹی کے لئے خدمات سرانجام دینے والوں کونمایاں کرنے میں اہم کردارادا کیا ہے۔ان میں ایک شاہد صاحب ہیں اور دوسرے زاہد سلیم۔انہوں نے پائز اے شفیلڈ کے نام سے ایک پروجیکٹ کیا تھا جس میں ان لوگوں کی خدمات کوخراج تحسین پیش کیا گیا جوکمیونٹی کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

اہم واقعہ

یہاں میں اپنا ایک اہم واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی بنیاد پر ہم آگے چل کر فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں اور نقصان بھی۔ایک دن میں حفیظ الرحمٰن کے دفتر میں گیا تو وہاں ایک خوبصورت نوجوان کوآپریٹر روم میں کام کرتے ہوئے دیکھا،میں نے حفیظ الرحمٰن سے پوچھا یہ کون ہے اس نے بتایا کہ یہ پاکستانی آدمی کالڑکا ہے جس نے ایک انگریز عورت سے شادی کی ہوئی تھی اور پھران دونوں کے درمیان علیٰحدگی ہوگئی جس کی وجہ سے یہ نوجوان اداس اورڈپریشن کا شکار ہے کہ میرا والد ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور میں اکیلا رہ گیا ہوں جس کی وجہ سے میرے لئے زندگی گزارنا مشکل ہے۔میاں بیوی میں ناچاقی اوراس کی بنیاد پر علیٰحدگی کوئی بڑی بات نہیں بلکہ روز روز کی لڑائی سے بہتر ہے کہ دونوں اپنا اپنا راستہ لیں۔لیکن ایسی صورتحال میں نقصان اولاد کا ہوتا ہے۔عموماً بچے والدہ کے ساتھ چلے جاتے ہیں،جبکہ بعض والدکوترجیح دیتے ہیں ان کے لئے مشکل ہوجاتی ہے۔

عموماً پاکستانی لوگ علیٰحدگی کے بعد بھی اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں اوران سے

میل ملاپ کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کے حقوق پورے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ بالکل اپنا راستہ جدا کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے بچوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے جیسا کہ اس نوجوان کی تھی۔

دوسری طرف میرے بہت سے دوست ایسے بھی ہیں جنہوں نے یورپین یا دوسرے ممالک کی عورتوں سے شادی کی ہوئی ہے لیکن ان کی زندگی بہت اچھے طریقے سے بسر ہو رہی ہے۔ ان میں سے بعض کے بچے مذہبی سکالر بن گئے ہیں اور دین کے شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ اور کسی کی شادی نہیں بھی چل سکی تو پھر بھی اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

یہ یاد رکھیں کہ ہماری یورپین بیویاں اور انکی اولاد بھی ہماری جائیداد میں حصّے کی اتنی ہی حقدار ہیں جتنی پاکستانی، ایسا نہ ہو کہ جائیداد کے معاملے میں ہم ان کو اپنا انگوٹھا دکھا دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپین بیویوں سے ہونے والے بچوں کا ہم خیال رکھیں تاکہ وقت آنے پر وہ ہمارے لئے ڈھال بن جائیں۔

والدین کے لئے اپنی اولاد سے یکساں سلوک کرنا اسلامی تعلیمات کا بھی تقاضا ہے اور ہماری معاشرتی ذمہ داری بھی۔ آپ جس خوشی اور جذبہ سے شادی کرتے ہیں اسی جذبے سے اس کو نبھانے کی بھی کوشش کریں۔

مولانا رضاء الحق سیاکھوی کی دینی ورفاہی خدمات

مولانا رضاء الحق صاحب نوٹنگھم کی معروف دینی و مذہبی شخصیت ہیں، وہ مولانا منظور الحق مرحوم کے صاحبزادے اور مولانا ابراہیمؒ کے پوتے ہیں جنہوں نے آزاد کشمیر کے علاقے سیاکھ اور ڈڈیال میں دینی حوالے سے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ یوں مولانا رضاء الحق صاحب اپنے آباؤاجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے برطانیہ میں مختلف دینی

خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

نوٹنگھم کی مشہور مدنی مسجد جو کم و بیش 30 سال سے قائم ہے انہی کی سرپرستی میں قائم ہوئی اور ماشاء اللہ بہت آباد مسجد ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک چرچ کی عمارت خرید کر ایک مسجد بنائی ہوئی ہے۔ ان کا زیادہ رجحان دینی اداروں کی طرف ہے، چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے نوٹنگھم میں ایک بہت بڑے ہسپتال کی بلڈنگ خرید کر جامعہ الہدیٰ کے نام سے بچیوں کا ادراہ قائم کیا۔ اس بلڈنگ کو بڑی محنت سے تیار کیا گیا اور تب جا کر وہ تعلیمی سرگرمیوں کے قابل ہوئی۔ اس ادارہ میں یورپ بھر سے بچیاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتی ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایک نرسری بھی شروع کر دی۔

ہر سال کے اخیر میں امتحان کے بعد نتائج کی تقریب میں مختلف کمیونٹی کے افراد کو دعوت دی جاتی ہے، ہم شفیلڈ والوں کو بھی کئی مرتبہ مدعو کیا گیا ہے۔ ان کا رزلٹ کافی اچھا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے شفیلڈ میں ایک سکول کی بلڈنگ خرید کر بچوں کے لئے بھی بہت بڑا ادارہ قائم کیا جس میں زیادہ تر عرب اور بنگلہ دیشی کمیونٹی کے بچے پڑھتے تھے شفیلڈ میں ایک اور چھوٹی جگہ بھی لے لی تھی لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر چند ساتھیوں کو اس کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔

حکومت کی طرف سے کئی ایک پابندیوں کی وجہ سے انہیں کافی مشکلات بھی پیش آئیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمت سے کام کر رہے ہیں۔ انہیں انتظامی امور کا کافی تجربہ ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں۔ سیاسی حوالے سے وہ جمعیت علمائے برطانیہ کے دونوں دھڑوں سے اکثر کہتے رہتے ہیں کہ اتفاق کر لیں، لیکن جب ان کی نہ سنی گئی تو انہوں نے اپنا الگ گروپ بنا لیا جس کے امیر مرحوم مولانا شمس الحق تھے

۔ان کی وفات کے بعد اب وہ خود اس جماعت کے امیر ہیں۔

2018ء میں جب مرحوم قاری تصور الحق نے سب ساتھیوں کو مسجد علی میں مدعو کیا تھا تو وہاں یہ اتفاق ہوا تھا کہ ایک دوسرے کی مخالفت کئے بغیر اپنے اپنے پلیٹ فارم سے کام جاری رکھیں گے۔اب حضرت قاری صاحب کی وفات کے بعد مولانا رضاء الحق کیا کردار ادا کرتے ہیں یہ ان پر منحصر ہے۔

جمعیت کا ایک دھڑا چند علاقوں تک محدود ہو گیا ہے، جبکہ یہاں اکثریت میر پور والوں کی ہے۔اب ہمارے بہت سے نوجوان علماء بن گئے ہیں جو پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کو جمعیت میں شامل نہیں کیا جاتا۔

یہاں شفیلڈ میں ایک یونائیٹڈ ماسک کونسل بنی ہوئی ہے، شروع شروع میں ایک میٹنگ قاری محمد اسماعیل صاحب کے گھر ہوئی تھی، اس کے بعد 15 سال تک میں مکی مسجد میں خدمات سرانجام دیتا رہا ہوں لیکن مجھے کبھی کسی میٹنگ میں نہیں بلایا گیا، یہ بھی معلوم نہیں کہ کبھی میٹنگ ہوتی بھی ہے یا کہ نہیں، لیکن ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کے فیصلے ہو رہے ہیں، لیکن ہم کہاں ہیں کچھ معلوم نہیں۔

مولانا رضاء الحق صاحب سے میری گذارش ہے کہ آپ میر پور کے علماء میں ایک مقام رکھتے ہیں، آپ کا اور قاری تصور الحق مرحوم کا آزاد کشمیر میں ایک مذہبی گھرانے سے تعلق ہے۔آپ نہ صرف میر پور بلکہ آزاد کشمیر اور پاکستان بھر کے علماء کو اکھٹا کرنے کی کوشش کریں اور کوئی ایسا نظام بنائیں کہ سب ایک ہو کر کام کریں، یہ نہ ہو کہ ایک بزرگ بن گئے تو تا حیات وہی رہے گا، بلکہ یہ چلتا پانی ہونا چاہئے، پہلے والوں کے ساتھ نئے بھی آتے رہیں۔ اور پہلے والوں کی بھی عزت کرتے رہیں، اور ان کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔اگر آپ یہ کام کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک بہت بڑا

کارنامہ سرانجام دیں گے، اور یہ آپ کا آئندہ آنے والی نسلوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔

مولانا حیات خان صاحب کی دینی اور تبلیغی خدمات

مولانا حیات خان شفیلڈ کی مشہور ومعروف مذہبی شخصیت ہیں۔شفیلڈ میں شائد ہی کوئی شخص ہو جو ان کے نام سے واقف نہ ہو۔مولانا آج سے تقریباً چالیس سال قبل انڈسٹری روڈ مسجد میں امام بن کر آئے تھے، انہوں نے تقریباً بیس سال اسی مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیئے،لیکن ان کا اصل میدان تبلیغی کام تھا۔وہ اس وقت نوجوان آدمی تھے، اور دن رات دینی کام میں مصروف رہتے تھے۔کبھی ایک مسجد میں پروگرام رکھتے تو کبھی دوسری میں۔ ہر آدمی سے انفرادی ملاقات کر کے اسے دعوت دیتے۔

ایک میرے جاننے والے نے اپنا واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ سخت سردی پڑ رہی تھی کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔دروازہ کھولا تو دیکھا مولانا حیات خان ہیں۔اتنی سخت سردی میں بغیر جرابوں کے پشاوری چپل پہن رکھی تھی، مجھے دعوت دی کہ مسجد میں پروگرام ہوگا اور دین کی بات ہوگی آپ تشریف لایئے گا۔میں ان کے اس جذبے اور خلوص سے بہت متأثر ہوا کہ ایک بندہ جس کو سردی گرمی کی کوئی پرواہ نہیں، اس کا مقصد اللہ کے دین کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔اُس نے کہا کہ میں اسی وقت مولانا کے ساتھ ہولیا، اُس شخص کا نام منظور حسین ہے، اور وہ اُس وقت ایک بلڈر کے طور پر کام کرتا تھا۔

مولانا حیات خان ڈیوز بری کے بڑے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔وہ کسی نہ کسی جماعت میں ہوتے ہیں یا پھر ڈیوز بری مرکز میں۔ان میں ایک کمال کی بات یہ بھی ہے کہ جس سے ملتے ہیں وہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف میرے دوست ہیں۔ ہر وقت خوش مزاجی سے ملتے ہیں، حالانکہ پٹھان حضرات کا لہجہ اکثر کافی سخت ہوتا ہے لیکن اُن کی شخصیت میں یہ بات نہیں۔

ایک دفعہ ایک جماعت ان کے آبائی شہر کرک سے آئی تو انہوں نے بتایا کہ یہ جماعت کی برکت ہے کہ یہ ایسے ہیں، ورنہ ان کے گاؤں والے لڑائی میں بہت مشہور ہیں، لیکن جماعت کے ساتھ لگنے سے ان کا غصہ پیار و محبت و دوستی میں بدل گیا ہے۔

ایک اور بات جو میں نے نوٹ کی ہے کہ جب بھی دو پٹھان بھائی اکھٹے ہوتے ہیں آپس میں پشتو میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں ،لیکن وہ بہت ہی کم پشتو میں بات کرتے ہیں۔

انہوں نے ایک گرلز اسلامیہ سکول بھی قائم کر رکھا ہے ،اور شائد یہ ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے کہ جہاں بہت سے گرلز سکول بند ہو گئے ہیں ان کا ادارہ ابھی تک چل رہا ہے۔ان کی ان تمام خوبیوں کی وجہ سے سب لوگ ان سے محبت بھی کرتے ہیں اور ان کی عزت بھی کرتے ہیں۔

ان کی زندگی بہت ہی سادہ ہے، ہر کسی سے نیکی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں یہ بھی کہتا چلوں کہ اگر کسی دوست یا رشتہ دار سے نیکی کریں اور جواب میں آپ اس کے شر سے محفوظ رہیں تو آپ خوش قسمت انسان ہیں۔

مولانا میرے بہت اچھے دوست ہیں ،میں ان کی عزت کرتا ہوں ،امید کرتا ہوں کہ جن لوگوں سے ان کی دوستی ہے صدا قائم و دائم رہے۔

بین المذاہب ہم آہنگی اور مولانا عبدالقادر آزادؒ

جس وقت میں گوجرانوالہ میں مقیم تھا تو وہاں مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کے جو لوگ میں نے دیکھے وہ مسیحی تھے، قلعہ دیدار سنگھ ٹاؤن میں صفائی ستھرائی کا کام وہی کرتے تھے اُس وقت شہروں اور ٹاؤنز میں صفائی ستھرائی کے کاموں کا ٹھیکہ انہی لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ اور جتنا کوڑا کرکٹ نکلتا تھا، اس کے لئے بولی دی جاتی تھی، اور جو بھی آدمی زیادہ بولی دیتا تھا اس کو ٹھیکہ دے دیا جاتا تھا۔ یہ ٹھیکہ چھ ماہ کے لئے ہوتا تھا۔ اور رقم کونسل کو دینی پڑتی تھی۔ میں نے بھی ٹھیکہ لے لیا کیونکہ میری زمین کافی بنجر تھی، اور میرے دادا جان نے مجھے کہا تھا کہ اگر کہیں بھی گوبر ڈالو گے تو فصل بہت اچھی ہوگی، میں نے ان کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹھیکہ لے لیا۔ اس ٹاؤن کی صفائی کرنے والے سارے کونسل کے ورکر تھے۔ اور ٹاؤن کمپنی ان کو تنخواہ دیتی تھی۔ ان کو احکامات دیئے گئے تھے کہ ٹھیکیدار جہاں کہے گا وہیں کوڑا پھینکنا ہے، تو میں نے ان سے کہا کہ یہ سب میری زمین میں لے آئیں۔ کچھ لوگ کہنے لگے کہ محبت کے پاس انگلینڈ کے پونڈ ہیں اور رقم ضائع کر رہا ہے مگر میں نے اپنے دادا کی بات لے لی تھی پھر کیا تھا کہ جولائی اگست آ گیا اور میں نے اس زمین میں پہلی دفعہ ہی چاول کی فصل لگا دی اور پھر وہ اتنی زیادہ ہوئی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ پھر جب فصل تیار ہوگئی اور میرے گھر میں آئی تو اس خوشی میں جتنے پڑوسی اور کونسل کے ورکر تھے ان کو دعوت دی۔ وہ ورکر کرسچن تھے، کچھ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ان کے برتن علیحدہ ہونے چاہئیں۔ میں نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں اور سب مل کر کھائیں گے۔ میری زمین پر کام کرنے والے بھی کچھ مسیحی تھے، میں نے ان کو بتایا کہ جس ملک میں میں

رہتا ہوں وہاں سب قومیں آباد ہیں اور سب مل کر ایک ہی جگہ کھاتے ہیں اور یہاں جو بڑے لوگ ہیں وہ ایک برتن میں کھاتے ہیں، اس لئے فکر نہ کریں انسان سب برابر ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بیان کرتا ہوں کہ ایک دفعہ ہم لوگ رائے ونڈ تبلیغی جماعت کے ساتھ مارچ کے جوڑ میں شریک ہوئے۔ میں نے اور حاجی بوستان صاحب نے پروگرام بنایا کہ یہ جمعہ بادشاہی مسجد لاہور میں پڑھیں گے، کیونکہ مولانا عبدالقادر آزاد جب بھی انگلینڈ آتے تو وہ ہمارے پاس ٹھیرتے تھے۔ تو ان سے بہت اچھی شناسائی تھی، ہم جمعہ مبارک سے پہلے ہی وہاں ان کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے ہماری بہت عزت افزائی کی۔ پھر جب جمعہ کا وقت قریب آیا تو انہوں نے حاجی بوستان صاحب سے کہا کہ جمعہ کا بیان آپ نے کرنا ہے، میں نے بھی اس کی تائید کی۔ انہوں نے اپنا ایک جبّہ حاجی بوستان صاحب کو دیا، اور حاجی صاحب کو تقریر کے لئے مائک حوالے کر دیا۔ حاجی صاحب نے بیان کیا، اس کے بعد مولانا آزاد نے حاجی بوستان کا تعارف کرایا کہ کس طرح ایک دیہاتی لڑکے نے تبلیغ میں لگ کر اپنا نام پیدا کیا ہے۔ پھر وہ واپس اپنے گھر لے کر آئے اور کافی سارے لوگوں کو دعوت پر بلا لیا، اور کھانا کھانے پر انہوں نے تعارف کروایا ان میں کچھ خاکروب مسیحی بھی تھے۔ پھر انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہر جمعہ کو میں کسی نہ کسی غریب مسیحی کو ساتھ ضرور لاتا ہوں تاکہ لوگوں کو یہ پتہ چلے کہ انسان سب ایک ہیں۔ ان کی یہ ادا دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اگر ہمارے علماء، سیاست دان اور بیوروکریٹ سب اسی طرح کریں تو پھر دیکھا دیکھی اور لوگ بھی کریں گے، اور اس طرح ہم ایک قوم بن جائیں گے۔

پھر ایک دفعہ وہ علماء کا ایک وفد لے کر انگلینڈ آئے جس میں دوسرے مسالک کے علماء بھی شامل تھے، انہوں نے بتایا کہ ہم نے اتحاد بین المسلمین کے نام سے جماعت بنائی ہے جس میں مختلف مسالک کے علماء شامل ہیں۔ اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ اپنے اپنے

مسلک پر قائم رہتے ہوئے ہم کس طرح مل کر کام کر سکتے ہیں۔اس دورے میں انہوں نے شفیلڈ کے چرچ سٹریٹ کے ورکر سے ملاقات کی اور انہیں بھی اسی طرز فکر پر دعوت دی۔ انگلینڈ کے مختلف علماء کرام سے مل کر اس پیغام کو عام کرنے پر زور دیا۔وہ کئی دوسرے ممالک بھی گئے اور یہ دعوت ہر فرد تک پہنچانے کی کوشش کی۔

بین المذاہب ہم آہنگی کے پر چار کے ساتھ ساتھ وہ خانقاہی سلسلہ میں بھی بہت پیش پیش تھے۔جب بھی انگلینڈ آتے تو رادھرم اور شفیلڈ ضرور تشریف لاتے تھے۔ اپنے آخری دورے میں وہ کافی بیمار تھے،انہوں نے کہا کہ میں عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ خانقاہی لائن میں بھی ہوں تو میں آپ کو یہ درس دیتا ہوں کہ آپ بجائے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے اپنی زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھیں تو آپ کے دل کے اندر نورانیت آئے گی ،اور آپ کا تعلق اپنے رب سے مضبوط ہوگا۔اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ چلہ چار ماہ لگاتے ہیں اور لوگوں کو اچھے کام کرنے کا کہتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ ان کو اپنا خلیفہ بناؤں۔چنانچہ انہوں نے حاجی اللہ دتہ صاحب اور چند دیگر ساتھیوں کو اپنا خلیفہ بنایا۔

حاجی بوستان صاحب کو پہلے ہی اپنا خلیفہ مقرر کر چکے تھے۔آخری بار انہوں نے لوگوں کو دین پر قائم رہنے کی تلقین کی اور کہا کہ اسی میں تمہاری آئندہ نسلوں کی کامیابی ہے۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا خبیر آزاد ان کے مشن کو لے کر آگے چل رہے ہیں۔برطانیہ بھی آچکے ہیں،ابھی حال ہی میں ان کو رؤیت ہلال کمیٹی کا چیئرمین بھی بنا دیا گیا ہے۔اللہ ان کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔

تبلیغی جماعت

جب میں اس ملک میں آیا تو ایک ٹین ایج لڑکا تھا۔میری خوش قسمتی تھی کہ میرے والد ایک نمازی آدمی تھے اور پھر وہ جس گھر میں رہتے تھے اس میں بھی کافی لوگ نماز پڑھنے والے تھے، پھر کوئی سال بعد گھر کے قریب ہی ایک مکان میں چھوٹی سی مسجد بھی قائم ہوگئی میں نے وہاں حافظ عزیز الرحمٰن صاحب جو کہ امام مسجد تھے ان سے دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔میں فیکٹری میں ملازم بھی تھا اس لئے جب بھی فرصت ملتی سبق لے لیتا تھا، اور ایک دو نمازیں بھی مسجد میں پڑھ لیتا تھا۔

پھر مسجد میں تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں بھی شروع ہوگئیں، وہ لوگوں کو اللہ کے راستے میں نکلنے کی ترغیب دیتے تھے۔اس سے متأثر ہوکر میں اور حاجی بوستان صاحب دس دن کے لئے جماعت کے ساتھ لندن روانہ ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ہماری تشکیل ایسٹ لندن کی ایک مسجد میں ہوئی۔جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں پہلے ہی سے پاکستان سے ایک جماعت جناب حاجی عبدالجبار صاحب کی امارت میں پہنچی ہوئی تھی۔اس مسجد کے ذمہ دار حاجی تسلیم صاحب تھے جو کہ مشرقی پاکستان سے تھے۔باری باری سب کو یہاں موقع ملا۔ہمیں بھی کھڑا کیا گیا، حاجی بوستان صاحب نے مجھ سے بہتر چھ نمبر بیان کئے اور پھر وہ مجھ سے آگے ہوگئے، اور زیادہ جماعت میں جانے لگے۔

میں 1965ء میں پاکستان چلا گیا اور دو سال رہ کر واپس آیا، پھر دوبارہ ایک سال بعد پاکستان چلا گیا، اس عرصے میں حاجی بوستان صاحب جماعت میں مجھ سے بہت آگے نکل گئے۔

1972ء میں حاجی بوستان نے شفیلڈ میں اجتماع رکھ لیا، اور یہ یورپ میں سب سے پہلا اجتماع تھا جس میں تقریباً دس ہزار افراد شریک ہوئے، اور یہ اتنا منظم اجتماع تھا کہ مقامی انگریز لوگ بھی اس سے بہت متأثر ہوئے۔ اس کے بعد انڈیا اور پاکستان کے تبلیغی حلقے کے بزرگوں کی نظریں حاجی بوستان پر جم گئیں کہ یہ نوجوان آگے چل کر جماعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ پھر جماعت کے امیر مولانا انعام الحسن اور پاکستان سے حاجی عبدالوہاب صاحب حاجی بوستان سے بہت محبت کرنے لگے۔

مارچ 1980ء میں جوڑ تھا، ڈیوزبری سے حضرات تیار ہوئے تو حاجی بوستان صاحب نے مجھے بھی تیار کر لیا۔ ہم سب سے پہلے کراچی مکی مسجد میں گئے اور وہ مسجد مرکز تھی، بہت زیادہ لوگ تھے، اکثر پڑھے لکھے، انہوں نے ہمارا بہت اکرام کیا، رات کو ہم باہر صحن میں سوئے، صبح جب بیدار ہوئے تو دیکھا کہ رات کو مچھروں نے بھی ہمارا خوب اکرام کیا ہے۔ پورے جسم میں کوئی جگہ نہیں تھی جہاں انہوں نے اپنے حصے کا خون نہ چوسا ہو۔ وہاں سے پھر لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ لاہور سے تقریباً 30 میل کے فاصلے پر رائیونڈ قصبہ ہے، جب ہم وہاں گئے تو دیکھا کہ ایک سادہ سی مسجد تھی کوئی ایک ہزار افراد کے لئے اندر جگہ تھی۔ ہم یورپ والوں کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مسجد کے اندر تھا ہمیں وہاں ٹھیرایا گیا۔ پھر صبح تقریباً گیارہ بجے حاجی عبدالوہاب صاحب نے بیان شروع کیا، اسی دوران آندھی وطوفان شروع ہو گیا۔ صحن میں جتنے ٹینٹ لگے تھے سب گر گئے، لیکن اس کے باوجود بیان جاری رہا اور بہت زیادہ لوگ بیان سنتے رہے۔ بارش کے باعث سب بستر بھیگ گئے سب کے لئے بہت مشکل بن گئی۔ اس کے باوجود لوگ اپنے اعمال میں مصروف رہے۔

جب رات ہوئی تو سردی کی وجہ سے سب لوگ مسجد کے اندر سونا چاہتے تھے لیکن

ہزاروں کے مجمع کو اندر سمونا بڑا مشکل تھا، میں نے دیکھا کہ لوگوں نے ساری رات ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر گزاری ،لیکن کوئی گلہ وشکوہ نہیں کیا،اور نہ ہی ایک دوسرے کو تنگ کیا۔اس وقت میں نے یہ بھی دیکھا کہ نماز کے لئے وہاں لاؤڈ سپیکر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے وہاں دس دن گزارے اور واپس آ گئے،اس کے بعد بھی جماعت کے ساتھ تعلق رکھا کبھی دس دن اور کبھی تین دن کے لئے جماعت کے ساتھ جاتا رہا،اور مکی مسجد میں بھی اکثر جماعتیں آتی رہتی ہیں۔

ایک دفعہ ملتان سے پیدل جماعت آئی اور اس میں ایک بہت ہی غریب آدمی تھا جس نے تہہ بند باندھا ہوا تھا اور اس کی عمر بھی تقریباً ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔انہوں نے تین دن مکی مسجد میں گزارنے کے بعد آگے ڈرم فیلڈ جو کہ ایک ویلیج ہے کی طرف جانا تھا، میں نے انہیں کہا کہ باہر بہت برف باری ہورہی ہے آپ ایک دو دن اور ٹھہر جائیں ،مگر انہوں نے فرمایا کہ نہیں محبت ہمارا رُوٹ بزرگوں نے بنا دیا ہے،جو ہدایات ہیں ہم ان پر عمل کریں گے۔اب سوچنے والی بات ہے،ایک جماعت ہزاروں میل دور آتی ہے اور انہیں کوئی مالی فائدہ بھی نہیں مگر پھر بھی وہ اس قدر تکلیفیں اٹھاتے ہیں کس قسم کے آدمی تھے ۔جیسا کہ ہم نے سن رکھا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اگر امیر کوئی فیصلہ کر دیتا تو سب لوگ اس پر عمل کرتے تھے۔اور اسی وجہ سے پوری دنیا میں ان کے ذریعے سے دین پھیلا۔اور دوسری بات یہ ہے کہ جماعت میں چلنے والے عام لوگ ہوتے ہیں اور میرے خیال میں اصل کام وہی ہے جو عام عوام کرتی ہے۔

آپ دیکھیں کہ جماعت میں کروڑوں لوگ شامل ہیں،جس ملک میں بھی میرا جانا ہوا میں نے وہاں جماعت کا کام دیکھا جن میں اکثریت غرباء پر مشتمل ہوتی ہے۔اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کام پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کس جماعت کے

ساتھ غریب عوام ہے، جس کے ساتھ غریب عوام ہوگی وہ جماعت زیادہ کام کرے گی۔ تبلیغی جماعت کے علاوہ دنیا میں کوئی اور ایسی جماعت نہیں جن کا اس طرح منظّم کام چل رہا ہو۔ایک دفعہ جماعت کے امیر مولانا انعام الحسن صاحب انگلینڈ تشریف لائے تو حاجی بوستان صاحب نے کہا کہ ہمارے ساتھ دس دن کے لئے چلو تو میں بھی تیار ہو گیا اور اس طرح بزرگوں کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ پھر ہم لندن مرکز میں گئے جو کہ پہلے یہودیوں کی عبادت گاہ ہوا کرتی تھی پھر اس کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا،اس کے امیر ذوالفقار باجوہ صاحب تھے،اور باقی دن لندن میں گزارے۔میری خوش قسمتی کہ سارے بزرگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا،ان کے بیانات بھی سنے جن میں مولانا انعام الحسنؒ، حافظ پٹیل صاحبؒ اور دیگر حضرات شامل ہیں۔

حاجی بوستان صاحب یورپ کی شوریٰ کے سپوکس مین ہیں جو بھی بات کرنی ہو ان کی وساطت سے ہوتی ہے۔مولانا انعام الحسن صاحبؒ کی وفات کے بعد امارت والا نظام آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا،اور اس کی جگہ شوریٰ والے نظام نے لے لی۔ایک بندے کو ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے،اور کوئی پچھلے تیس سال سے یہ نظام اچھی طرح سے چل رہا تھا،لیکن پھر مولانا الیاسؒ کے پوتے مولانا سعد صاحب نے کہا کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ امیر کے بغیر کام چلایا جائے،اور وہ یہ مطالبہ کافی عرصہ سے کر رہے تھے۔ادھر حاجی بوستان صاحب ان کے ساتھ متفق تھے۔یہ بات انہوں نے مجھے کافی دفعہ بتائی،لیکن ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا،اور یہ کام نہیں ہو سکا۔پھر آہستہ آہستہ پرانے بزرگ ختم ہوتے گئے اور نئے حضرات اپنے کام میں آگے آتے گئے۔

پھر وہ ٹائم بھی آ گیا کہ انڈیا میں مولانا سعد صاحب نے اعلان کر دیا کہ اب دہلی میں میں امیر ہوں۔لیکن ہوا یوں کہ شوریٰ والے ان سے الگ ہو گئے اور انہوں نے بنگلور

میں الگ مرکز بنالیا۔ ادھر رائے ونڈ والوں نے بھی شوریٰ والوں کی حمایت کر دی، اور کئی ملکوں میں دوگروپ بن گئے، یہاں تک کہ انگلینڈ ڈیوز بری میں بھی دوگروپ بن گئے۔

اور یہ بھی بتا تا چلوں کہ جب سے مرکز بنا ہے انڈین مسلمانوں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔جیسا کہ مدینہ والے انصار تھے وہی کردار انہوں نے بھی ادا کیا۔ میں جب بھی ڈیوز بری گیا تو کمرہ نمبر 5 ضرور گیا۔جناب حافظ پٹیل صاحب ،حافظ شریف صاحب اسحاق بھائی ،عبدالمتین صاحب اور جناب شبیر داجی صاحب سب کو معلوم تھا کہ میں حاجی بوستان صاحب کا دوست ہوں، وہ سب میری بہت عزت کرتے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انڈین بھائی بہت ملنسار اور مددگار ہیں ۔اردو ان کی مادری زبان نہیں لیکن وہ اکثر ہمارے سامنے آپس میں اردو ہی میں بات کرتے تھے۔وہ پہلے ہماری خدمت کرتے تھے پھر دوسروں کی ۔ جمعرات کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری مختلف شہروں کی ہوتی ہے۔دوسرے شہروں والے تو اپنے اپنے شہر والوں کا خاص خیال رکھتے ہیں لیکن جب بھی ڈیوز بری والوں کی باری ہوتی ہے وہ ہم لوگوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

گروپ بندی کے بعد میں ایک دفعہ مرکز گیا اور حضرات والے کمرے میں بھی مجھے دعوت دی گئی لیکن اب وہ پہلے والا ماحول نہیں رہا۔ جماعتیں بھی نکل رہی ہیں، چلہ، چار مہینے اور سال والی لیکن وہ بات نہیں رہی۔

میں سمجھتا ہوں کہ شبیر داجی صاحب بہت حوصلے والے آدمی ہیں وہ انڈین بھی ہیں، بزنس مین بھی ہیں، اور پھر مرکز کے معاملات بھی دیکھتے ہیں۔ابھی نوجوان ہیں اور ان کو پاکستانی اور انڈین دونوں کمیونٹی پسند بھی کرتی ہیں اگر وہ کوشش کریں تو ممکن ہے کہ اس طرح یورپ میں جماعت پھر ایک ہو جائے۔

پاکستانی کرکٹ ٹیم

میں جب سے انگلینڈ آیا ہوں کرکٹ کا بہت شوقین رہا ہوں شروع ہی میں چند نوجوان ساتھیوں کو ساتھ ملا کر اپنی ٹیم بنائی تھی ،ہم سب رپن سٹریٹ کے باغ میں کھیلتے تھے ۔ہم دونوں بھائی ،راجہ شبیر ،ان کے بھائی جاوید جو کہ راجہ محمد شریف صاحب کے بھتیجے تھے ۔ باقاعدہ ہم سب نے کرکٹ کا سامان لیا ہوا تھا ،اور پورے شوق سے کرکٹ کھیلتے تھے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب پاکستانی اس کھیل کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔

میرے یہاں آنے کے بعد جو سب سے پہلی کرکٹ ٹیم پاکستان سے انگلینڈ کے دورے پر آئی اس کے کپتان حنیف محمد تھے ،ان جیسا بلے باز میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ انہوں نے اس سیریز میں ایک ٹیسٹ کی ایک انگز میں تین سو سے زائد رنز بنائے تھے، وہ ہمارے ہیرو بن گئے ۔اسی طرح 1974ء میں ظہیر عباس مشہور ہو گئے ،جب انہوں نے برمنگھم کے ایک میچ میں 276 رنز بنائے ،اس کے بعد محسن خان نے بھی ایک انگز میں دوسو سے اوپر سکور کیا۔پھر جب 50 اوورز والی گیم آ گئی تو بلے بازوں کی جگہ بالر نے لے لی ،اور سرفراز نواز ،عمران خان ، وسیم اکرم اور وقار یونس چھا گئے اور ہمارے ہیرو بن گئے ۔ جب ورلڈ کپ شروع ہوا تو ویسٹ انڈیز والے چھائے ہوئے تھے،ان کو کالی آندھی کہا جاتا تھا، ان کے آگے کوئی کھڑا نہیں ہوسکتا تھا مگر جاوید میانداد نے انہیں بہت تنگ کیا وہ اس سے بہت ڈرتے تھے کیونکہ وہ کسی وقت بھی رنز بنا سکتا تھا۔لیکن کپ ویسٹ انڈیز لے گیا،اس کے بعد اگلا ورلڈ کپ بھی وہی جیتے۔ پھر انڈیا کی ٹیم بھی چیمپئن بن گئی ، اور اس کے بعد اسٹریلیا کی۔

پاکستان کی باری 1992ء کے ورلڈ کپ میں آئی۔اس ٹیم کے کپتان عمران خان تھےلیکن یہ پوری ٹیم کی اجتماعی محنت تھی جس میں جاوید میانداد،وسیم اکرم،انضمام الحق، وقار یونس اور مشتاق احمد جیسے نوجوانوں کا بہت اہم کردار تھا۔اگر بلے بازوں کی بات کروں تو انضمام نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا جب انہوں نے ایک میچ میں چوکوں،چھکوں کی بارش کردی تھی۔تو ورلڈ کپ کی جیت پوری ٹیم کی کاوشوں اور محنت کا نتیجہ تھی،لیکن عمران خان نے ہر کام اپنے کھاتے میں ڈال دیا،کوئی غیبی طاقت انہیں آگے کرنا چاہتی تھی اس لئے میڈیا میں صرف عمران خان چھائے ہوئے تھے جیسے انہوں نے اکیلے ہی ورلڈ کپ جیتا ہولیکن کیا کیا جائے ہماری قوم بھی صرف لکیر کی فقیر ہے ایک آدمی کو ہیرو بنا دیا اور آج اس کا مزہ لے رہی ہے،باقیوں کو عزت دینے میں کنجوسی کا مظاہرہ کیا۔

شیعہ حضرات سے تعلقات

عنایت حسین شاہ کے ہمراہ گروپ فوٹو

جب میں اس ملک میں آیا تو اس وقت بھی کئی ایک لوگوں نے چھوٹے چھوٹے بزنس شروع کئے ہوئے تھے،ان میں سے ایک حجام کی دوکان تھی جو کہ جناب فتح محمد صاحب کی تھی ان کا تعلق گجرات پاکستان سے تھا جو کہ بڑے اچھے انسان تھے۔ بڑے

پر ایک آدمی سے ملاقات ہوئی، ان سے علیک سلیک ہوئی تو انہوں نے اپنا تعارف کروایا کہ میرا نام عنایت حسین شاہ ہے، اور میں راولپنڈی کا رہنا والا ہوں۔

وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے لیکن بڑی شفقت اور پیار سے اس طرح ملے جیسے کوئی اپنے حقیقی چھوٹے بھائی سے ملتا ہے۔ان کی گفتگو سے اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت چونکہ کام کاج کے سلسلہ میں مصروفیت زیادہ ہوتی تھی اس لئے میل ملاقات کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد ان کے بھائی نے آرٹر کلف میں ایک ریسورنٹ کھول لیا اور وہاں ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ پھر جب میں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور مسجد کے انتظام میں بھی لگ گیا اور وہ بھی سیاسی آدمی تھے تو کبھی ٹاؤن ہال اور کہیں نہ کہیں کسی جلسے میں ملاقات ضرور ہو جاتی تھی۔

وہ جہاں رہائیش پذیر تھے بڑا اچھا علاقہ تھا۔ یہ شفیلڈ یونیورسٹی کے ساتھ بروم ہال کا ایریا ہے، لیکن ہوا یوں کہ وہاں ایک نائٹ کلب کھل گیا، جس کی وجہ سے وہاں نا پسندیدہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں جس کی وجہ سے اُس علاقہ کے مکانات کی قیمت بہت گر گئی کیونکہ لوگ اس طرف جانا پسند نہیں کرتے تھے۔

اس ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہم بہت سے ساتھیوں نے مل کر کونسل کو درخواست دی کہ یہاں سے یہ دھندہ ہر فاہی بند ہونا چاہیئے، اور بالآخر کونسل نے بڑی کوشش کر کے اس کلب کو بند کروا دیا۔ جن لوگوں نے اس معاملے میں اہم کردار ادا کیا ان میں بندۂ ناچیز اور پھر عنایت حسین شاہ، چوہدری ولایت اور حاجی بوستان کے علاوہ کچھ اور ساتھی بھی شریک تھے۔ الحمدللہ اب وہ ایریا بہت صاف ستھرا ہے مسجد بھی بن گئی ہے۔

عنایت حسین شاہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا، مکی مسجد میں کوئی بھی پروگرام

ہوتا ان کو دعوت ملنے پر وہ ضرور حاضر ہوتے۔ ہم نے اسلامیہ گرلز سکول کھولا تو ان کی بھتیجی ہمارے سکول میں زیر تعلیم رہی۔ پھر ہر نیک کام میں وہ ساتھ رہے۔ پھر جب ہم بوڑھے ہو گئے اور قیادت نوجوانوں کے پاس آ گئی تو شفیلڈ میں کچھ نوجوان شیعہ حضرات نے پہلی دفعہ محرم میں جلوس نکالنے کا ارادہ کیا اور جماعت اسلامی اور کچھ اہل سنت کے حضرات کو بھی ساتھ ملا لیا۔

عنایت حسین شاہ نے مجھے فون کیا کہ محبت! ہم پچھلے پچاس سال سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ ہم لوگ ہر مسجد میں نماز پڑھ سکتے ہیں، اور کوئی جنازہ بھی ہو تو ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اب میں نے سنا ہے کہ ہمارے شیعہ حضرات کچھ سنی علماء اور لوگوں کے ساتھ مل کر جلوس نکالنا چاہتے ہیں، آپ اس کے رکوانے میں میری مدد کریں۔ میں نے کہا شاہ صاحب یہ مشکل ہے، کیونکہ جس عالم کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ میری مانتے نہیں، اور جس صاحب کا ذکر کر رہے ہیں وہ بھی ہر جگہ چلے جاتے ہیں۔ پھر کیا تھا کہ انہی حضرات کی زیر سرپرستی محرم کا وہ جلوس بھی نکلا، اور گھوڑا بھی۔

اس دن کے بعد سے آج تک ہر سال جلوس نکلتا ہے۔ میں نے ان حضرات کو منع بھی کیا لیکن انہوں نے کہا کہ اتحاد بین المسلمین کے لئے ہم ہر کسی کے پروگرام میں جاتے ہیں۔ لیکن میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اچھی بات ہے لیکن ہم عوام کو پھر کیوں بے وقوف بناتے ہیں۔ جب آپ خود کوئی کام کریں تو ٹھیک اور اگر کوئی اور کرے تو غلط۔ ہم عوام آپس میں لڑتے رہتے ہیں، اور اوپر اوپر سے سب ٹھیک۔ اللہ تعالیٰ سب کو سمجھ عطا فرمائے۔

یو کے اسلامک مشن

راجہ محمد جمیل اور چوہدری شوکت علی

یو کے اسلامک مشن ایک دینی اور سیاسی جماعت ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی جماعت ہے اور جب ضرورت پڑے تو یہ جماعت ایک سے زیادہ جماعتوں کی شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ کیونکہ میں اور حاجی بوستان صاحب دینی اور سیاسی حوالے سے متحرک تھے، جہاں کہیں بھی بالخصوص دینی کام ہوتا وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے، تو اس وقت میں نے اس جماعت کو بھی دیکھا کہ یہ بھی ہر کام میں آگے آگے ہوتے ہیں۔

تنظیمی حوالے سے بہت مضبوط جماعت ہے۔ ان کے جتنے سنٹر ہیں وہ ایک آفس سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ ہر سنٹر کے لئے ایک ناظم ہے اور جو بھی فنڈ آتا ہے اُس کا حساب و کتاب رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ممبر شپ کا سسٹم رکھا ہوا ہے۔ کسی سنٹر کا کوئی مالک نہیں بلکہ سب جماعت کے ہیں۔ ہر سنٹر کے ناظم کا ہر سال الیکشن ہوتا ہے، کوئی نیا بندہ بھی آسکتا ہے اور وہی دوبارہ بھی منتخب ہوسکتا ہے۔ مگر دو سال کے بعد وہ نہیں آسکتا، لیکن ممبر ہوگا تو ووٹ دینے کا اہل ہوگا۔ عام آدمی اس کا اہل نہیں۔ ممبر بننے سے پہلے وہ ایک نصاب دیتے ہیں اس کے پڑھنے کے بعد ممبر شپ ملتی ہے، اور ہر ماہ اس کی ادائیگی کرنا پڑتی ہے،

اور پھر جتنی میٹنگیں ہوتی ہیں اس میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

اگر میں رفاہی حوالے سے بات کروں تو اس میں بھی جماعت کافی متحرک ہے، ان کے اکثر نوجوان پڑھے لکھے ہیں، اور اچھی جگہ کام کرتے ہیں، اور اکثر جماعت کا کام رضا کارانہ طور پر کرتے ہیں، جس سے اس کا نظم اچھی طریقے سے چل رہا ہے، پاکستان میں بہت سے سکول چلا رہے ہیں اور اس کے علاوہ غرباء کے لئے بھی بہت کام کر رہے ہیں۔

یہاں شفیلڈ میں شروع شروع میں ان کی کوئی مسجد نہیں تھی، ایک دو ساتھی تھے، ان سے جب پوچھا جاتا کہ تم (UKIM) کے ممبر ہو تو کہتے کہ نہیں بس اس جماعت کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ تھی کہ اس وقت جماعت اسلامی اور دیو بندی علماء کا آپس میں کافی اختلاف تھا، اگر کسی کو معلوم ہو جاتا کہ یہ جماعت اسلامی کا بندہ ہے تو اُس کے لئے کافی مشکلات ہو جاتیں۔

غالباً 1989ء میں قاری عبد الحمید صاحب شفیلڈ میں آئے، اور انہوں نے مکی مسجد میں نماز پڑھنی شروع کی۔ جب اُن سے تعارف ہوا تو انہوں نے بتایا کہ کارڈف سے یہاں شفٹ ہوا ہوں، اور پاکستان میں چکوال سے تعلق ہے، اور جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی سینٹر میں سیکرٹری کا کام کرتا رہا ہوں۔ اب یہاں شفیلڈ میں مستقل قیام پذیر ہو گیا ہوں میں نے انہیں خوش آمدید کہا، پھر جلد ہی انہوں نے ایک مکان سینٹر کے لئے خرید لیا اور ان کے ساتھ راجہ محمد اکبر بھی تھے، اور وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے علی الاعلان کہا کہ

میں(UKIM) کا ممبر ہوں۔

پھر ایک نوجوان راجہ جمیل اختر ان کے ساتھ شامل ہو گئے، وہ ایک بڑی برادری والے تھے، انہوں نے زور شور سے کام شروع کر دیا۔ جماعت کی مرکزی شوریٰ نے شفیلڈ میں کانفرنس رکھنے کا فیصلہ کیا، اور 2001ء میں انہوں نے شفیلڈ سٹی ہال میں کانفرنس رکھی، جس میں جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد صاحب کو مدعو کیا گیا۔ کانفرنس میں تقریباً دو ہزار آدمی آئے۔ اس دن کے بعد سے راجہ جمیل اختر کا جماعت کے اندر قد کاٹھ میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اور اب جو بھی بزرگ پاکستان سے آتے ہیں وہ شفیلڈ میں آئے بغیر واپس نہیں جاتے۔

راجہ صاحب بڑے دل والے آدمی ہیں، دوسروں کو کھلانے پلانے میں بڑے دل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔ ان کا شفیلڈ کا سینٹر بہت اچھا چل رہا ہے ہر ہفتہ قرآن سرکل ہوتا ہے جس میں دس، پندرہ بندے ہوتے ہیں، میں بھی اس میں جاتا ہوں اور ہر آدمی اپنا حصہ ضرور ڈالتا ہے۔ دین کے حوالے سے بات چیت ہوتی ہے، مگر ایک بات اہم ہے کہ وہاں جو بھی کتاب پڑھی جاتی ہے مولانا مودودیؒ کی ہی پڑھی جاتی ہے اس سینٹر میں میرے بہت سے دوست ہیں، اگر میں سب کے نام لکھوں اور کسی کا رہ جائے تو مناسب نہ ہو گا۔ اور پھر جہاں جہاں میں نے کام کیا ہے وہاں بھی میرے دوست احباب ہیں تو یہ ممکن نہیں کہ ہر ایک کا نام لکھوں۔ آپ سب میرے بھائی اور دوست ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔

کچھ خوبیوں کے ساتھ کچھ ایسی کمزوریاں بھی (UKIM) میں ہیں جن کو میں نے اپنی زندگی کے تجربے سے مشاہدہ کیا ہے۔ سب سے بڑی کمزوری تو یہ ہے کہ یہ کسی کے ساتھ مل کر نہیں چل سکتے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہر جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرنا

چاہتے ہیں، اور اگر کوئی اور بھی محنت کرتا ہے تو کریڈٹ یہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر لکھ رہا ہوں، اور بطور ثبوت میں چند واقعات بھی لکھ رہا ہوں۔ ان کے آدمی بول چال میں بہت تیز ہیں، اور جہاں ہمارے ایک ہزار آدمی ہوں اور ان کے دس پندرہ بھی ہوں تو سٹیج پر ہزار والی جماعت کا کوئی ایک آدمی نمائندہ ہوگا اور یہ پانچ، چھ آدمی سٹیج پر پہنچ جائیں گے۔

مجھے یاد ہے کہ 1984ء میں ہم پورے انگلینڈ سے کوچیں بھر کر لندن میں کشمیر کے حوالے سے احتجاج میں شریک ہوئے۔ مگر ہوم ورک نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کوئی اجتماعیت نہیں ہوتی کوئی کہاں ہوتا ہے تو کوئی کہاں، اور پھر ہر آدمی اپنے آپ کو لیڈر سمجھتا ہے خیر ہم وہاں ہزاروں میں تھے اور ان کے کچھ لوگ تھے، لیکن جب یادداشت پیش کرنے کا موقع آیا تو یہ سب سے آگے تھے۔

پھر ایک دفعہ قاری تصور الحق مرحوم نے برمنگھم میں ایک جلسہ رکھا اور بہت سی جماعتوں کو اکھٹا کیا، قاری صاحب جمعیت علمائے برطانیہ کے پلیٹ فارم سے تمام لوگوں کو متحد کرنا چاہتے تھے، مگر جب ہال میں پہنچے تو (UKIM) والوں نے یہ کہہ کر کے یہ ہماری فلاں تنظیم کا بندہ ہے اور یہ فلاں کا اور اس طرح اپنے 5 / 6 آدمی سٹیج پر بٹھا دیئے۔ اور دوسری طرف صرف قاری صاحب اور ایک اور مولانا سٹیج پر جا سکے۔ اس کے بعد قاری صاحب نے کہا کہ اب میں کبھی بھی (UKIM) والوں کے ساتھ مل کر کام نہیں کروں گا۔ کام کوئی اور کرتا ہے اور میڈیا میں اگلے دن شہ سرخیاں ان کے نام کی لگی ہوتی ہیں۔

اسی طرح غالباً 2016ء میں چلڈرن ہسپتال شفیلڈ کے لئے ایک مشین چاہیے تھی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم مسلم کمیونٹی کو بھی اس میں حصہ ڈالنا چاہیے۔ یو کے اسلامک مشن کے دو ساتھی میرے پاس آئے مکی مسجد میں اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ سب مسجدوں

سے جمعہ میں چندہ کیا جائے اور پھر تمام کمیونٹی کی طرف سے وہ رقم چلڈرن ہسپتال کو دی جائے۔ میں چونکہ اس وقت مسجد کا خادم تھا، مولانا محمد موسیٰ شاکر صاحب بھی وہیں تھے، میں نے کہا کہ میں ضرور مدد کروں گا، لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ جو بھی رقم جمع ہو وہ پوری شفیلڈ کی مسلم کمیونٹی کی طرف سے ہونی چاہئے، دونوں حضرات نے وعدہ کیا کہ ہم ضرور اسی طرح کریں گے، لیکن مجھے خدشہ تھا کہ ایسا نہیں ہوگا، اور ایسا ہی ہوا، انہوں نے خاموشی سے وہ رقم ہسپتال کو دے دی اور پھر ہمیں میڈیا سے معلوم ہوا کہ (UKIM) نے چندہ کر کے ہسپتال کو دیا ہے، اور اپنے سینٹر کی ہر جگہ تشہیر کی گئی کہ (UKIM) کمیونٹی کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اپنا نام اونچا کرنے کی خواہش ہر ایک کو ہوتی ہے، لیکن انصاف سے کام لینا چاہئے، جو لوگ آپ کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور عام عوام ان کا بھی تو کہیں نام ہونا چاہئے۔ کام جمہور کرے اور نام کوئی اور بنائے یہ کہاں کا انصاف ہے۔

اور آخر میں ایک بات اور میں کہنا چاہتا ہوں شائد میرے چند ساتھیوں کو تلخ لگے لیکن معذرت کے ساتھ آج جماعت اسلامی پاکستان کی منظم ترین جماعت ہونے کے باوجود اگر عوام میں اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکی تو میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ ان کا یہی رویہ ہے جس کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں مل رہی۔

والد صاحب کی وفات

میرے والد صاحب 1954ء کے لگ بھگ برطانیہ آئے تھے۔جس وقت وہ آئے اس وقت حکومت پاکستان (1100) گیارہ سو روپے ضمانت لیتی تھی ،اور لوگوں کو آنے کی اجازت دیتی تھی ،جس وقت میرے والد صاحب آئے اس وقت تک میر پور کے کافی لوگ آ چکے تھے ،ان میں زیادہ تر ان پڑھ اور مزدور طبقہ تھا ،اس وقت جو لوگ زیادہ ہوشیار و چالاک تھے وہ خود آنے کے بجائے دوسروں کو انگلینڈ بھیجتے تھے ،اور اس طرح کافی رقم بنا لیتے تھے ،اور ان کو ایجنٹ کہا جاتا تھا ، بزنس مین اور سرکاری ملازم بھی انگلینڈ آنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے ۔ جو لوگ یہاں برطانیہ آتے تو وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس آ جاتے جو ان کی کافی مدد کرتے تھے ، یہاں آنے کے بعد سال سال تک بعض کو کام نہیں ملتا تھا مگر جو رقم حکومت سے ملتی تھی اس سے بچا کر گھر والوں کے لئے بھیجتے تھے مگر وہ بھی اتنی ہوتی تھی کہ پاکستان میں کام کرنے پر بھی اتنی نہیں بنتی تھی ۔ یہاں کام بھی اکثر فیکٹریوں کا ہوتا تھا مگر ٹوائیلٹ کی صفائی کے علاوہ باقی ہر کام وہ لوگ کرتے تھے ۔اُس وقت ان کو کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا ، انہیں اپنے نمبر کے بارے میں بھی معلوم نہیں ہوتا تھا اور اکثر لوگ تو سو تک کی گنتی بھی نہیں جاتے تھے ،بس کوئی نشانی رکھ کر اس سے اپنا کام نکال لیتے

تھے۔

پاکستان میں ہر آدمی کا اپنا گھر تھا تو یہاں پر بھی انہوں نے بھر پور کوشش کی کہ ان کا اپنا گھر ہو۔ اکثر لوگ چار پانچ سال لگا کر اپنا گھر لینے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر جب پاکستان جاتے تو ان کے پاس اتنی رقم ہوتی کہ وہاں پر بھی اپنا گھر بہتر کر سکیں۔ اب ان ہوشیار لوگوں نے دیکھا کہ یہ تو ہم سے آگے نکل گئے ہیں تو پھر 1960ء کے بعد ہر آدمی کو خواہش تھی کہ وہ انگلینڈ پہنچ جائے، مگر ان حالات کو دیکھ کر 1962ء میں انگریز حکومت نے ویزا پالیسی شروع کر دی۔

خیر میں والد صاحب کی بات کر رہا تھا وہ اس وقت درمیانی عمر کے تھے، فیکٹریوں میں سخت کام کرنے، اور سردی کی زیادتی کی وجہ سے اکثر ان کی طبیعت خراب رہتی تھی، نزلہ زکام کی شکایت بہت تھی۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹوں میں سے مجھے یہاں بلوا لیا، پھر دو سال کے بعد میرے بڑے بھائی کو بھی، اس طرح ان کے لئے آسان ہو گیا کہ وہ پاکستان واپس جائیں، پھر انہوں نے زیادہ وقت پاکستان ہی میں رہنا شروع کر دیا۔ کبھی یہاں آ کر چھ ماہ یا سال کام کرتے اور پھر واپس چلے جاتے، پھر ہم نے ان سے کہا کہ آپ کو کام کرنے کی ضرورت نہیں۔

1976ء کے بعد انہوں نے انگلینڈ آنا چھوڑ دیا اور وہیں سے پنشن کی درخواست دی اور ان کی پنشن ہو گئی۔ پھر 1990ء میں میں نے ان سے کہا کہ آپ کے کہنے پر ہم اپنے بال بچوں کو لے کر آپ کے پاکستان آئے، اب آپ بھی مہربانی کر کے انگلینڈ آ جائیں جس پر وہ راضی ہو گئے اور اس کے بعد وہ یہیں رہے، اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ وہ انگلینڈ نہیں بلکہ نیا انگلینڈ ہے۔ پھر 86 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وہ آخری دن تک چلتے پھرتے رہے، اپنا کام خود کرتے تھے، اور نماز بھی اچھے

طریقے سے پڑھ سکتے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی کبھی بھی سست روی میں نہیں گزاری۔
ان کی وفات کے بعد ہم نے مشورہ کیا کہ ان کی تدفین یہیں پر کی جائے کیونکہ ہماری ساری فیملی یہیں پر آباد ہے۔لوگوں نے بہت باتیں کیں،مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے اپنی مرضی سے اس ملک میں رہنا پسند کیا ہے،اب ہمارے لئے پاکستان جانا مشکل ہے،اوراب آہستہ آہستہ اکثر لوگوں نے اپنے اعزہ واقارب کو یہیں دفنانا شروع کر دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم یہاں آباد ہو چکے ہیں، ہمارے گھر بار، بزنس اورمرنا جینا یہیں پر ہے،اگراب بھی ہم اس کو نہیں مانتے تو ہماری مرضی۔ہمارے لئے تو بہت آسان ہے کہ جب بھی دل کرتا ہے قبرستان چلے جاتے ہیں،اور والد صاحب کی قبر پر دعاء مانگ آتے ہیں۔

سفرحج

جب پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حج بیت اللہ کی سعادت نصیب فرمائی لیکن اس وقت میری اہلیہ میرے ساتھ نہیں گئی تھی،اب اس کا بار بار اصرار تھا کہ میں بھی حج کرنا چاہتی ہوں لیکن میری صحت کا مسئلہ تھا،مجھے دل کی تکلیف تھی،جس کی وجہ سے اکثر صحت خراب رہتی تھی،اور سفر کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا مگر پھر بھی میرا فرض تھا کہ میں ایک دفعہ اپنی اہلیہ کو

حج کراؤں ،اس کو بھی یہی کہتا تھا کہ انشاءاللہ ضرور جائیں گے،مگر جب 1997ء میں اللہ کی طرف سے حکم آ گیا تو میں نے ارادہ کرلیا کہ اس سال حج پر جاؤں گا۔

میں نے برمنگھم مولانا ارشد صاحب سے رابطہ کیا کہ آپ اس سال حج کا قافلہ لے کر جائیں گے؟ انہوں نے کہا کہ اس دفعہ قاری تصورالحق صاحب خود جائیں گے میں نے ان سے کہا کہ ہمارے بھی دوٹکٹ بک کروادیں،اور پھر وہ دن آ گیا کہ ہم دونوں سفر حج کے لئے روانہ ہو گئے۔

میری اہلیہ بہت خوش تھیں،ہم نے مصر ایئر لائن سے سفر کیا،اور ہمارے قافلہ میں برمنگھم سے چوہدری یعقوب صاحب اوران کے والداور گھر والے شامل تھے،یہاں شفیلڈ سے حاجی سلطان صاحب تھے اس کے علاوہ اور بھی کچھ ساتھی تھے۔ ہمارا یہ قافلہ قاری تصورالحق صاحب کی قیادت میں مصر سے ہوتا ہوا جدّہ پہنچا،اور وہاں سے مکہ مکرمہ۔سامان ہوٹل میں رکھ کر سیدھے بیت اللہ پہنچے اور عمرہ ادا کیا۔

کچھ دنوں کے بعد ہم مدینہ شریف چلے گئے اور وہاں ایک ہفتہ قیام کیا ،اور روضۂ رسول پر حاضری دی،درودوسلام کا نذرانہ پیش کیا،اور مسجد نبویؐ میں خوب عبادت کی ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد واپس مکہ آ گئے۔

8 ذی الحجہ کو منیٰ کے لئے نکل پڑے۔جب منیٰ میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ 1979ء میں میں جب حج کو گیا تھا تو بڑے بڑے ٹینٹ لگے تھے جو کہ اب چھوٹے ہو چکے تھے،اوران میں بجلی کا انتظام بھی کر دیا گیا تھا لیکن وہ اس قدر ناقص تھا کہ پلگ لگاتے وقت شارٹ لگتا تھا۔ہم اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔

پھر کیا تھا کہ دیکھا کہ مکہ کی طرف سے آگ نظر آ رہی ہے،اوراس کے ساتھ ہوا بھی بہت تیز تھی جس کی وجہ سے وہ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ظہر کا وقت تھا،ہیلی کاپٹر

آگ بجھانے کے لئے پانی پھینک رہے تھےلیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑ رہا تھا۔لوگ خوف کی وجہ سے ایک پہاڑ کی طرف بھاگ رہے تھے،جن کو راستہ کا علم تھا وہ ایک سرنگ سے گزر کر دوسری طرف چلے گئے،اور کچھ پہاڑ پر چڑھ گئے۔

بوڑھے بیچارے بھی پہاڑ کی طرف بھاگ رہے تھے،قیامت کا منظر تھا،کسی کو دوسرے کی خبر نہیں تھی ہر ایک اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا،آگ ایک سے دوسرے سرے تک پھیل گئی۔اکثر وہاں پر پہنچ گئے جہاں قربانی کی جاتی ہےلیکن کچھ دیر کے بعد آگ پر قابو پالیا گیا،اور لوگوں نے واپس آنا شروع کر دیا،اور شام تک واپس پہنچ گئے، ٹینٹ جل چکے تھے کھانے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا،ساری رات اسی طرح ذکر وفکر میں گزاردی۔

اگلے دن پھر تازہ دم ہوکر عرفات کی طرف نکل گئے اور وہاں دن بھر قیام کیا،اور تمام معمولات بجا لانے کے بعد شام کو مزدلفہ کے لئے روانہ ہو گئے ، اور رات وہاں گزارنے کے بعد صبح منیٰ پہنچ گئے اور وہاں سے رمی جمرات اور طواف بیت اللہ کیا۔بقیہ ارکان بھی بڑی خوش اسلوبی سے ادا کئے۔اور جو میری بیوی کا مجھ پر حق تھا اللہ کے فضل سے میں نے اسے پورا کیا۔

قاری صاحب کی سر براہی میں بہت اچھا حج ہوا اور اس سفر میں میرا برخوردار اشتیاق نجیب اور اس کی والدہ بھی ہمارے ساتھ تھیں۔وہ نوجوان آدمی تھا اس نے ہماری بہت مدد کی۔اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے اور قاری صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے مگر ان کی یادیں ساتھ ہیں،اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

سنگاپور کا سفر

محبت علی اور قاری تصور الحق

جناب قاری تصور الحق صاحب نے ایک دفعہ برمنگھم میں ایک میٹنگ رکھی کہ میں
جمعیت علمائے اسلام جموں وکشمیر کو فعال کرنا چاہتا ہوں، انہوں نے پورے برطانیہ سے علماء
اور مساجد کمیٹیوں کے ذمہ داران کو جمع کیا، میں بھی اپنے وفد کے ساتھ اس میں حاضر ہوا، کم
وبیش دوسو حضرات موجود تھے۔ قاری صاحب نے بتایا کہ میں اس جماعت کو اس لئے
فعال کرنا چاہتا ہوں کہ ہم آزاد کشمیر کے لوگ یہاں بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں ہمارا اپنا
ایک پلیٹ فارم ہونا چاہیے، میں چاہتا ہوں کہ اس کی ایک باڈی بنا کر الیکشن کروائیں، اور
جو بھی آگے آئے وہ لوگوں کی خدمت کریں، مگر مولانا رضاء الحق صاحب نے اعتراض کر دیا
کہ یہ آپ کس طرح کر سکتے ہیں، کیونکہ آزاد کشمیر جمعیت کا دستور اس کی اجازت نہیں دیتا
اور بات وہیں رہ گئی۔

کچھ عرصہ بعد میں نے قاری صاحب کو کہا کہ میں بزنس کے سلسلے میں بیرون
ملک جانا چاہتا ہوں آپ بھی میرے ساتھ چلیں بزنس بھی ہو جائے گا اور دینی حوالے سے
بھی کچھ کام کر لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں مولانا یوسف خان صاحب سے بھی

بات کر لیتا ہوں کہ میں اور محبت آرہے ہیں اور جمعیت علمائے اسلام جموں و کشمیر کے حوالے سے آپ کی خصوصی اجازت لینا چاہتے ہیں تا کہ یہاں برطانیہ میں کام کر سکیں ۔ جب ان سے بات ہوئی تو انہوں نے اس کے لئے حامی بھر لی ۔ چنانچہ ہم پہلے پاکستان گئے ۔ خصوصی طور پر پلندری ان کے پاس گئے ،انہوں نے کافی علماء کو جمع کیا ہوا تھا اور سب کی موجودگی میں انہوں نے کہا کہ قاری تصور الحق اور محبت علی جہاں چاہیں جمعیت کشمیر کی طرف سے بات کر سکتے ہیں، اور ہمیں ان کی طرف سے خصوصی اجازت مل گئی۔

پھر اس کے بعد ہم سنگا پور گئے ۔وہاں پر میرا ایک چینی بزنس مین دوست تھا،جس کے ساتھ میں بزنس کرتا تھا، میں نے اس کو بتایا کہ فلاں دن فلاں وقت میں اپنے دوست کے ساتھ آرہا ہوں، اور PIA کے ذریعے ہم سنگا پور گئے۔سفر بہت لمبا تھا،تقریباً 13 / 14 گھنٹے کی فلائٹ کے بعد ہم سنگا پور پہنچے تو وہ دوست باہر کھڑا تھا۔اس نے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہمیں ایک بہت اچھے ہوٹل میں ٹھیرایا، اور کہا کہ میں صبح شام آپ کے پاس آؤں گا ،آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو کسی بھی وقت آپ مجھے بلا سکتے ہیں۔ہم نے اس سے پوچھا کہ کوئی نزدیک مسجد ہے اُس نے ہمیں قریبی مسجد کا بتایا، جب ہم اس مسجد میں گئے تو دیکھا کہ وہ بڑی عالی شان مسجد ہے، اور اس کے ساتھ ایک سینٹر ہے، اور المصطفیٰ نام کا ایک بہت بڑا بزنس سینٹر بھی تھا جو کہ ایک انڈین مسلمان کا تھا۔اس میں دنیا کی ہر چیز موجود تھی ۔ بہرحال مسجد بہت خوبصورت تھی۔تبلیغی مرکز بھی وہیں تھا۔اور وہاں پر تبلیغی کام بھی بہت اچھا ہو رہا تھا۔

وہاں پر کچھ وقت گزارا اور دینی حوالے سے گفتگو ہوئی۔شام کو وہاں سے واپسی ہوئی ،اور پھر شہر کی سیر کو نکل گئے ، میں نے مشاہدہ کیا کہ وہاں کے لوگ اپنے آپ کو انڈین سے ذرا بڑا سمجھتے ہیں ۔ وہاں پر انڈین لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ البتہ پاکستانی نہ ہونے

کے برابر ہیں۔ ایک اور عجیب چیز دیکھی کہ اتوار کے دن ایک بہت بڑی روڈ جو میلوں پر محیط ہے وہاں انڈین ہی انڈین نظر آتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا چکر ہے؟ انہوں نے بتایا کہ انڈیا سے جو لوگ آتے جاتے ہیں وہ ہر اتوار کو یہاں جمع ہوتے اور ملتے ہیں، اور ہر گروپ نے اپنے لئے جگہ مخصوص کی ہوئی ہے، سارا دن آپس میں گپ شپ کرتے رہتے ہیں، اور پھر شام کو اپنے اپنے ڈیروں پر چلے جاتے ہیں۔ بڑی زبردست سوشل زندگی بنائی ہوئی ہے پھر مجھے بتایا گیا کہ یہ بہت منظم لوگ ہیں۔ ان کے اپنے ٹیلی ویژن سٹیشن ہیں، اور حکومت میں بھی ان کا کافی عمل ودخل ہے، اور ان کا ایک آدمی وزیر بھی ہے۔

میرے دوست نے سنگاپور کی سیر کرائی، میں نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا جزیرہ ہے اور ہر طرف سمندر ہے، اور انہوں نے صفائی کا بہت زبردست انتظام کیا ہوا ہے۔ وہاں پر بارش بہت ہوتی ہے، اس لئے انہوں نے سڑک کے کنارے بہت بڑا نالہ بنایا ہوا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو پانی اس میں جاتا ہے اور سڑکوں پر کوئی گندگی نہیں پھیلتی۔ وہاں پر سختی سے ہدایت ہے کہ کوئی بھی شخص کسی سڑک پر کوئی چیز نہیں پھینک سکتا اور نہ ہی تھوک سکتا ہے، ورنہ جرمانہ کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک اچھے طریقے سے چل رہا ہے، ان لوگوں کا رہن سہن ایشین ہی ہے۔ وہاں پر کھانے پینے کے بہت سینٹر ہیں اور مارکیٹیں بھی۔ ہم مسلمانوں کے ریسٹورنٹ میں گئے، لیکن ان لوگوں کے کھانے کی بو ایسی تھی جو مجھے اچھی نہیں لگی۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ رہ کر اُس سے مانوس ہو جاتے جیسے ہم یہاں فش اینڈ چپس کے عادی ہو گئے ہیں۔ پہلے اس سے بھی بو آتی تھی، اور اسی طرح ہماری کری سے ان کو، اب مزے سے وہ بھی کھاتے ہیں اور ہم بھی۔ ہم ہفتہ بھر وہاں رہے، میرا تجزیہ ہے کہ اگر قوم صفائی پسند نہ ہو تو کام نہیں چلتا، اگر ہر آدمی اپنا گند خود صاف کرلے تو تب کام بنتا ہے، چاہے بڑا ہو یا چھوٹا۔ اور اگر کوئی بڑا غلط کرے تو پھر تو بہت نظام کا چلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

مراکش کا سفر

دورۂ مراکش کے موقع پر گروپ فوٹو

دراصل بات یہ ہے کہ حاجی بوستان صاحب نے مراکش سے شادی کی ہوئی ہے اور انہوں نے کافی دفعہ مجھے دعوت دی کہ مراکش چلو، میں نے کہا ضرور ایک دن چلوں گا، پھر ہمارے ایک بہت اچھے دوست حسن الامین سوڈانی بھی وہاں پر آباد ہو گئے تھے، انہوں نے بھی کافی اصرار کیا، پھر کیا ہوا کہ حاجی عبدالرشید کے برخوردار محمد ابراہیم نے بھی وہاں شادی کرنی طے کر لی اور تاریخ بھی طے ہوگئی۔

اب ہمارے دو ساتھیوں جناب چوہدری یٰسین اور چوہدری یونس کا مراکش جانے کا پروگرام بن گیا، انہوں نے مجھے بھی کہا کہ آپ ساتھ چلیں۔ چنانچہ ہم تینوں ایئر فرانس کے ذریعے براستہ فرانس مراکش کے لئے روانہ ہو گئے۔ کاسا بلانکا ایئر پورٹ پر اترے، ہمارے پاس کوئی کسٹم والی چیز نہیں تھی۔ بہر حال انہوں نے چیک کیا۔ اب دیکھا کہ یہاں عربی کے ساتھ ساتھ فرنچ میں بات چیت کی جاتی ہے۔ اور یہ نوٹس کیا کہ تھوڑی بہت رشوت بھی چلتی ہے۔

ہم ایئر پورٹ سے سیدھے حسن الامین کے گھر پہنچے، اس کا گھر ماشاء اللہ بہت خوبصورت تھا۔ اس نے بھی وہاں مراکش عورت سے شادی کر لی تھی، حالانکہ اس کی پہلی بیوی جو کہ سوڈانی تھی اس سے دو بچے بھی تھے، اور آپس میں بڑی محبت بھی تھی، اور خوشگوار

زندگی گزار رہے تھے۔لیکن ہم نے دیکھا کہ اس کی یہ بیوی بھی بڑی سگھڑ ویزا اور فرمانبردار تھی، اس کی ہر بات پر عمل کرتی تھی اور اوپر سے خوبصورت بھی تھی۔

ہم تینوں جب تک اس کے گھر پہ رہے اس نے ہماری بڑی خدمت کی ، دوسرے دن حسن نے کہا کہ میں نے آپ کی دعوت رباط میں ایک اسمبلی ممبر کے ساتھ رکھی ہوئی ہے، پھر وہ ہمیں لے کر رباط کے لئے روانہ ہوا جو تقریباً 50 میل کی مسافت پر ہے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ہمارا تعارف کروایا، دعوت ایک ریسٹورنٹ میں تھی جو کہ بہت پر تکلف تھی، مراکش والے سب سے پہلے Olives سے کھانے کا آغاز کرتے ہیں اور ساتھ فش بھی ہوتی ہے، ہماری طرح سارا کھانا ایک ساتھ نہیں رکھ دیتے بلکہ بڑے آرام سے آدھا گھنٹہ سٹارٹر پر لگا دیتے ہیں، پھر دوسری چیزیں آتی ہیں اور کم وبیش دو گھنٹے میں کھانا مکمل ہوتا ہے، اور ساتھ گپ شپ بھی چلتی رہتی ہے۔جس طرح ہم پاکستانی کھانا خوب کھاتے ہیں اسی طرح مراکش اور ترکی کے لوگ بھی کھانے میں تگڑے ہیں۔

اس دعوت کے اگلے دن یاسین صاحب اور یونس صاحب حاجی بوستان صاحب کے پاس چلے گئے، اور میں حسن کے پاس رک گیا کیونکہ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں مراکش کی سیر کراؤں گا۔پھر انہوں نے مجھے کاسابلانکا کے نزدیکی شہروں کی سیر کروائی۔

مراکش کا بہت بڑا حصہ سمندر کے ساتھ لگتا ہے، بہت ہی صاف ستھرا ملک ہے۔ حسن جہاں بھی جاتا اپنے دوستوں کو فون کر دیتا کہ میرا ایک دوست انگلینڈ سے آیا ہوا ہے آپ کو اس سے ملواؤں گا، پھر وہ مجھے Tetouan شہر لے کر گئے جو کہ جبل الطارق سے پہلے آتا ہے، وہاں پر اس کے کافی دوست تھے۔ٹورازم کے چیئرمین سے میری ملاقات کروائی، اور ان کے گھر رات بھی بسر کی۔

اگلے دن مراکش کی آخری سرحد پر لے گئے، سامنے جبل الطارق ہے، اُسے دیکھ

کر پرانی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں کہ کس طرح مسلمانوں نے اس سمندر کو کراس کر کے سپین کو فتح کیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی، پھر سات سو سال وہاں حکومت قائم رہی۔

یورپ پر کوئی غیر حکومت نہیں کرسکا، یہ صرف مسلمان تھے جنہوں نے اتنا طویل عرصہ یہاں حکومت کی۔ پھر وہاں سے ہم نے متبادل راستہ اختیار کیا اور Tangier شہر سے ہوتے ہوئے فیض شہر کی طرف واپس لوٹے۔ Tangier بھی مراکش کا بہت اچھا شہر ہے اور اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ دنیا کا پہلا مقام ہے جہاں دو سمندر ملتے ہیں، یہاں پر لوگ کافی مذہبی ہیں۔ پھر فیض آ گئے۔ یہ شہر بھی ہمارے لاہور شہر کی طرح تاریخی ہے، یہاں حاجی بوستان صاحب کے سسرال کا قیام تھا۔

دورۂ مراکش کے موقع پر گروپ فوٹو

وہاں سے اگلے دن حاجی عبدالرشید صاحب کے بیٹے محمد ابراہیم کی شادی میں شرکت کے لئے گئے جو وہاں سے تقریباً 20 میل کی مسافت پر تھا۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ مراکشی شادی میں شرکت کر رہا تھا۔ امام صاحب اور ان کے ساتھی پودینے کو کاٹ کر ایک دیگ میں ڈال کر پکاتے ہیں اور قہوہ بناتے ہیں۔ دولہا دلہن ایک جگہ بیٹھتے ہیں، اور جب نکاح ہوجاتا ہے تو پھر مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، اور چند رسومات کے بعد شادی ختم ہو جاتی ہے۔

وہاں مراکش کا سفر کرتے ہوئے جو بھی چھوٹا یا بڑا شہر آیا انہوں نے بتایا کہ یہ

بادشاہ سلامت کا گھر ہے، یعنی ہر شہر میں بادشاہ کا ایک گھر ہے۔ آپ خود سوچیں کہ ہر شہر میں گھر کی کیا ضرورت ہے۔ یہی رقم اگر اپنے لوگوں پر خرچ کریں، اور ان کو مختلف سہولتیں دیں تو کیا ہی اچھا ہوتا، کیونکہ جو بھی انسان جس زمین پر پیدا ہوتا ہے اس کا اس پر اتنا ہی حق ہے جتنا ایک بادشاہ کا۔ زمین ساری اللہ کی ہے پر کیا کہئے گا کہ ہم نام تو اسلام کا لیتے ہیں لیکن کام وہ نہیں کرتے۔

ہم تینوں ساتھی جو یہاں سے گئے تھے سب کا ارادہ سیر سپاٹے کا بھی تھا۔ حاجی بوستان صاحب نے کہا کیوں نہ آپ کو ایک دریا کے منبع پر لے چلوں جہاں سے دریا نکلتا ہے، ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ ہمارے ساتھ حاجی صاحب کے بہت اچھے دوست جناب عبدالسلام صاحب بھی شریک ہوگئے، وہ تبلیغی جماعت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے، اور بڑے اچھے انسان تھے، وہاں سے تقریباً 15 میل سفر کیا ہوگا کہ ایک جگہ ٹھیرے اور وہاں چائے وغیرہ پی۔

وہیں پر ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جس کی وہاں سپئیر پارٹس کی دوکان تھی اس سے گپ شپ ہوئی اور اُسے بتایا کہ ہم اس طرح سیر کے لئے نکلے ہوئے ہیں، اور ہم نے کرایہ پر ٹیکسی لی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو اپنی گاڑی میں لے کر چلوں گا۔ ہمارے امیر حاجی صاحب تھے انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، اس نے اپنی دوکان بند کی اور ہمارے ساتھ چل پڑا، تقریباً (100) سو میل دور جنگلوں میں سے ہوتے ہوئے جہاں بہت سے جنگلی جانور رہتے تھے ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

یہ ایک بہت بڑا پہاڑ تھا، اُس کے درمیان سے پانی نکل رہا تھا جو بہت زیادہ مقدار میں تھا، جب وہاں سے نکل کر نیچے آتا تو یہ بڑے نالے کی صورت اختیار کر لیتا جس کا عرض کافی چوڑا تھا جس کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے کناروں پر بہت سے لوگ بڑے

سکون سے اس منظر کا نظارہ کر رہے تھے، ہم بھی کچھ وقت وہاں ٹھیرے۔

واپسی پر وہاں قریب ہی ایک گاؤں دیکھا جس کے لوگ کافی غریب تھے، اور ان کے بچے باہر کھیل رہے تھے۔ گاؤں کافی اونچی جگہ پر تھا، اور نیچے گہری کھائی، اور اگر وہاں سے کوئی نیچے گر جائے تو اس کا بچنا مشکل تھا، مگر میں نے دیکھا کہ ان کے بچے بلاخوف وخطر وہاں کھیل رہے ہیں، اور ان میں دو سال کا چھوٹا بچہ بھی تھا، میں سوچتا ہوں کہ یہ اللہ کا نظام ہے، جب کسی کا کوئی نہیں ہوتا تو اللہ اُس کا ہو جاتا ہے۔

ہم یہاں جس ملک میں رہ رہے ہیں ہمارے بچوں کو چھوٹی عمر سے ہر بات بتائی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود بغیر مدد کے روڈ بھی کراس نہیں کر سکتے۔ شام کو ہم اس سفر سے واپس آ گئے۔ ہمارے میزبان نے کہا کہ آج رات میں آپ کو نہیں جانے دوں گا، اور اس نے اپنی چیری کے باغ سے تازہ چیری لی، اور گھر پر بہت اچھی دعوت کی۔

انہوں نے بتایا کہ میں نے پاکستان میں چار ماہ جماعت کے ساتھ لگائے ہیں، پاکستانی لوگوں نے میری بڑی خدمت کی، اور خاص کر لاہور والوں نے بہت متأثر کیا۔ ہم دو دن وہاں مزید رہے جس میں حاجی صاحب اور ان کے دوستوں نے ہماری بہت ہی پر تکلف دعوتیں کیں۔

ہمارا یہ سفر بہت یادگار رہا، اور مراکش کے جو چند اہم باتیں میں نے نوٹ کیں وہ آپ سے بھی شیئر کرتا ہوں۔ پہلی یہ کہ وہاں بادشاہت کا نظام ہے، اور وہاں کے بادشاہ کا نام حسن تھا، جو کہ ایک اچھا آدمی تھا، سب لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے، اور عرب ممالک کی طرح لوگ اتنے خوف زدہ نہیں تھے۔ ریل کا نظام بہت اچھا ہے، انتارش نہیں تھا اور اپنے ملک کی صفائی بھی بہت اچھی رکھی ہوئی ہے۔ اُن کا بادشاہ کچھ نہ کچھ اپنے عوام کی خدمت کرتا ہے، اور ہر جگہ بادشاہ ہی کی بات ہوتی ہے۔

مراکش ایسا ملک ہے جہاں باقاعدہ ایک بجے دوپہر میں دو گھنٹے کی چھٹی ہوتی ہے، اور پھر دو گھنٹے کے بعد دوبارہ کام شروع ہوتا ہے۔ یہاں ہر صبح فجر کی نماز کے بعد اجتماعی قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس ملک میں پوری دنیا سے لوگ سیر وتفریح کے لئے آتے ہیں۔ یہاں کے مرد اور عورتیں بہت خوب صورت اور خوش اخلاق ہیں۔ بالخصوص پاکستانیوں کو بڑی عزت دیتے ہیں، اور انہیں اچھا سمجھتے ہیں۔ ہم نے کسی کو نہیں دیکھا جو ہمیں دیکھ کر خوش نہ ہوا ہو، ورنہ آپ جس ملک میں بھی جائیں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور مل جاتا ہے جس کے منہ پر بارہ بجے ہوتے ہیں۔

یہاں کا بڑا شہر کاسا بلانکا ہے جو ہمارے کراچی کی طرح ہے، اور یہاں ایک مسجد ہے جو سمندر کے کنارے بنی ہوئی ہے۔ ہمارے بہت سے لوگوں نے مراکش سے شادیاں کی ہوئی ہیں اور ان میں سے اکثر اچھی طرح سے چل رہی ہیں۔

یہ میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ چھٹیوں میں کہیں سیر کے لئے جانا چاہتے ہیں تو مراکش ایک دفعہ ضرور جائیں، کیونکہ سڑکیں بہت اچھی اور کشادہ ہیں، زیادہ تر موٹر ویز ہیں اور موڑ بھی بہت کم ہیں، اس وجہ سے لوگ گاڑیاں تیز چلاتے ہیں جس کو کنٹرول کرنے کے لئے ہر دس میل پر پولیس کیمروں کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے، اور اگر کسی کو پکڑ لے تو چالان بھی کرتی ہے۔

رشوت نہ ہونے کے برابر ہے، اور ایک اہم ترین بات کہ وہاں بلا خوف جہاں آپ چاہیں جا سکتے ہیں کسی کے پاس کوئی اسلحہ بندوق نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی بدمعاشی دیکھی جتنے بھی عرب ملک دیکھے ہیں وہاں لوگ اپنے حکمرانوں سے خوفزدہ رہتے ہیں، لیکن یہاں اس طرح کا کوئی ماحول نہیں ہے۔

سوڈان کا سفر

دورۂ سوڈان کے موقع پر صدر البشیر کے ساتھ گروپ فوٹو

چوہدری محمد ولائت اور حاجی بوستان صاحب کے ساتھ مل کر میں نے بہت سے رفاہی اور سیاسی کام کئے ہیں ، اور اسی سلسلہ میں میرا سوڈان کا سفر بھی ہوا۔سوڈان کی حکومت پر امریکہ نے کافی پابندیاں لگائی ہوئیں تھیں جس کے باعث وہ کافی مشکلات میں مبتلا تھے ۔ چنانچہ کچھ سوڈانی ساتھیوں نے کہا کہ آپ ہماری مدد کریں کہ ہم لوگ بڑی تکلیف میں ہیں ۔ہم ایک غریب قوم ہیں اور آپ اپنی حکومت کو یہ باور کرائیں کہ ہم کیسے امریکہ اور یورپ سے لڑ سکتے ہیں ۔ کیونکہ سیاسی طور پر چوہدری محمد ولائت صاحب بھی کافی ایکٹو تھے تو ہم نے مل کر ایک انگلوسوڈانی سوسائٹی بنائی جس کے چیئرمین چوہدری محمد ولائت صاحب تھے اور میں بھی اس کا ممبر تھا۔ پھر چوہدری صاحب نے کچھ کونسلروں کو تیار کیا جن میں کونسلر ٹونی ڈیم بل جوڈن ، اور مانک گیٹنگ شامل تھے ۔ چنانچہ یہ پورا وفد لے کر سوڈان کے لئے روانہ ہوئے جب خرطوم کے ہوائی اڈے پر اترے تو دیکھا کہ ان کے اپنے جہاز وغیرہ تو ہیں لیکن ہوائی اڈہ بہت ہی چھوٹا ہے جو کسی ملک کے شایان شان نہیں ۔ وہاں سے ہم ایک ہوٹل میں گئے جو کہ چینی حکومت نے بنایا ہوا تھا، وہ کافی صاف ستھرا اور اچھا ہوٹل تھا۔

پھر ہماری ملاقات کچھ وزرا سے کروائی گئی ،جس سے بھی بات ہوتی وہ یہی کہتا کہ

کہاں ہم اور کہاں امریکہ اور یورپ، ہم ان کے خلاف کیا کر سکتے ہیں، اور واقعی ایسی ہی بات تھی۔ میں نے اب تک جتنے ملک دیکھے ہیں سب سے غریب ترین ملک یہی دیکھا۔ ہاں ان کی خرطوم یونیورسٹی افریقہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے اور تقریباً سبھی لوگ انگریزی بول لیتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ عربی بھی بولتے ہیں، اور ان کی اپنی مقامی زبان بھی ہے۔

حاجی محبت علی سوڈان کے وزیر خارجہ کے ہمراہ

اس کے بعد انہوں نے ہمیں ساؤتھ سوڈان لیجانے کا پروگرام بنایا۔ وہاں پر عیسائی اور مسلمان رہتے ہیں، اور ان کی آپس میں کافی لڑائی رہتی تھی۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ بالکل بھی خوش نہیں تھے۔حکومت مسلمانوں کے پاس ہی ہے ہم ایک چھوٹے جہاز پر سوار ہو کر وہاں گئے، وہاں پہنچنے کے بعد ایک ایسے علاقے میں گئے جو اچھا زرخیز علاقہ تھا، اور وہاں پر زمینداری بھی اچھی تھی۔ ہم نے ایک غلہ منڈی دیکھی، وہاں لوگ کچھ صحت مند تھے ورنہ اکثر سوڈانی بہت کمزور دبلے پتلے ہی دیکھے۔ شائد دنیا میں سب سے کم یہی کھاتے ہیں۔ وہاں تیل کی ایک ایفائنری بھی دیکھی جو چائنا حکومت کی مدد سے بنائی گئی تھی۔ پھر ہم واپس خرطوم آ گئے۔

وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہے تھے کہ امریکہ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے ورنہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، انہوں نے ایک فیکٹری پر بم بھی مارے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے ملک ہیں ان کو غریب ملکوں کا جینا مشکل بنانے کے بجائے ان کی مدد کرنی چاہیئے۔

ہمارا وفد جب واپس آیا تو کچھ ایم ،پی ،ایز سے ملاقات کی اور وہاں کی اصل صورت حال سے ان کو آگاہ کیا ،اور انگریز کونسلر جو ہمارے ساتھ گئے تھے انہوں نے بھی کافی مدد کی خاص کر ٹونی ڈیم جو ایک بہت اچھا انسان ہے ،اور ہم پاکستانیوں کا بہت اچھا دوست ہے ،بہت ہی خوش اخلاقی سے ملتا ہے ،اب تک میری اس سے گپ شپ رہتی ہے۔

ہم جب سوڈان میں تھے ،اور جس ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے تو وہاں ایک آدمی ہم سے ملنے آیا ،اس نے اپنا تعارف ایک انڈین بزنس مین کے طور پر کرایا۔اُس نے بتایا کہ ہم تقریباً دو تین ہزار لوگ ہیں جو کہ ہر شہر اور دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ہماری چھوٹی بڑی دوکانیں بھی ہیں ،اور بڑے بزنس بھی ہیں ،ہم مل جل کر رہتے ہیں ،اور ہر سال جب عید آتی ہے تو صدر صاحب کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں ،اور ان کے لئے تحفے لے کر جاتے ہیں ۔اور ہم یہاں بڑی اچھی زندگی گزار رہے ہیں ۔اور واقعی وہاں دیکھا کہ اکثر چیزیں انڈیا کی بنی ہوئی تھیں ۔

اس ملک میں دریا نیل بہتا ہے ،اور پورے ملک کو کراس کرتا ہے ،مگر انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ،صرف انڈیا کے بنے ہوئے کچھ چھوٹے ٹیوب ویل لگائے ہوئے ہیں ،اور انڈین بائیسکل چلتی ہے ،اور باقی چیزیں بھی انڈیا کی ۔

وہاں لوگوں سے سنا کہ جو سیاست دان تھے کس طرح انہوں نے عوام کے ساتھ مل کر انگریز فوج کو روکا تھا ،اور مجاہدین نے کیا کیا کارنامے دکھائے ۔ہمیں ایک مقبرہ بھی دکھایا گیا کہ اس کی وجہ سے ہمیں آزادی ملی ۔مگر اب وہاں فوجی حکومت ہے ۔ان کے ملک میں اتنا بڑا دریا ہے اور پیچھے سے دو دریا آتے ہیں جو کہ خرطوم شہر کے پاس وہ بڑا دریا بن جاتے ہیں اگر ان کا بیس فیصد پانی بھی استعمال کیا جائے تو سوڈانی عوام کے لئے کافی ہے مگر جب ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ مصر کی حکومت ہمیں اس کی اجازت

نہیں دیتی۔

اگر عوامی حکومتی ہوتی اور عوامی طاقت اس کے ساتھ ہوتی تو وہ دوسرے ملکوں سے بات کر سکتی تھی ،لیکن فوجی حکومت کے پاس نہ تو عوامی طاقت ہے اور نہ ہی وہ کسی کے ساتھ بات کر سکتے ہیں ،اور نہ ہی کوئی ان کی بات سنتا ہے ۔دنیا نے ان کے ساتھ تجارت بند کی ہوئی ہے،حکومت کو تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن عوام بیچاری تو پس رہی ہے،غریب غریب سے غریب تر ہو رہا ہے۔یونائیٹڈ نیشن نے الگ سے پابندیاں لگائی ہوئی ہیں ۔کیا بہتر نہ ہوتا کہ یہ پابندیاں صدر صاحب اور حکومت کے وزرا پر لگائی جاتیں کہ وہ نہ تو کسی ملک جا سکتے اور نہ سرمایہ وہاں جمع کرا سکتے ،اور جنرل پبلک پر یہ پابندیاں نہ ہوتیں،اس طرح دباؤ سے فوجی حکومت جا سکتی ہے اور عوامی حکومت آ سکتی ہے، لیکن یہ کلچر مسلط قوموں بالخصوص انگریزوں کا مسلط کیا ہوا ہے کہ جہاں پر وہ گئے وہاں کے لوگوں کو فوج اور پولیس میں بھرتی کیا،انہیں زمین دی،اور ان کو ساتھ ملا کر حکومت کرتے رہے،اور ان سے اپنے ہی بھائیوں کو مروا کر انعامات بھی دیتے رہے۔اور ان کے مخالفین کو ملک دشمن اور غدار کا لقب دیا گیا۔

یہ غدار کہلانے والے جب جدوجہد کر کے ان غاصبوں سے اقتدار حاصل کرتے ہیں تو یہ لوگ پھر اپنے آلہ کاروں کے ساتھ مل کر ان کو غدار کہنا شروع کر دیتے ہیں،اور ان کو آپس میں لڑوا کر حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں۔میں نے ہر جگہ یہی دیکھا ہے کہ جہاں بھی فوجی حکومت ہے وہاں کے لوگ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے رہتے ہیں،اور کچھ بتانے کی کوشش نہیں کرتے ۔بہر حال سوڈان کا ملک اندورونی طور پر بہت کمزور ہے،جب تک آزادانہ الیکشن ون مین ون ووٹ کے اصول کے تحت نہ ہوں کام نہیں چلے گا۔

اسی سفر میں ہمارے دوست حسن الامین نے کہا کہ ہمارے ایک رشتہ دار کی

شادی ہے،اس میں آپ لوگوں نے شرکت کرنی ہے، جب ہم شام کواس شادی میں شرکت کے لئے پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع تھے ،میوزک بج رہا تھا ، اور ڈانس ہو رہا تھا ، جو بھی باہر سے آتا اسے اس ڈانس میں شامل ہونا پڑتا تھا ، وہ دس پندرہ منٹ ان کے ساتھ شریک ہوتا اور پھر اگلے آنے والے اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔گھر والے اور خاص کر دولہا اور دلہن مسلسل ڈانس میں شریک تھے۔

جب میں نے دیکھا کہ ایک مذہبی گھرانے کی شادی میں یہ ہو رہا ہے تو عام لوگوں کا کیا حال ہوگا۔مگر جب میں نے حسن صاحب سے پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں تو اس نے بتایا کہ ہمارے ہاں اگر ہماری خوشی میں کوئی ڈانس نہیں کرتا تو ہم اس سے ناراض ہو جاتے ہیں ، یہاں پر سب کو ڈانس کرنا پڑتا ہے ، اور یہ تو کچھ نہیں رات کو جب ہماری اپنی فیملی ہوگی اس وقت بہت زبردست قسم کا ڈانس چلے گا۔تو ڈانس افریقن قوم کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے ، اوران کی آواز بھی بہت سریلی ہے ، اور تیسرا ان کا قدوقامت دراز ہوتا ہے ، تمام تر مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود وہ ڈپریشن میں نہیں جاتے ، ہر وقت خوش وخرم رہتے ہیں۔

پھر وہ حاجی بوستان صاحب جو کہ تبلیغی جماعت یورپ کی شوریٰ کے سپوکس پرسن ہیں اور پوری دنیا کے بزرگ ان کو جانتے ہیں وہ ہم کو اپنے ساتھ اپنے تبلیغی مرکز میں لے گئے ۔وہاں پر تبلیغ کا کام بہت اچھا ہو رہا ہے اوران کے ساتھ ہم نے کچھ وقت گزارا اور دیکھا کہ وہاں بھی صوفی لوگ بہت ہیں۔

پھر چوہدری محمد ولائت صاحب کو وہاں ڈگری ملی تھی اس کے لئے بہت ہی پر وقار تقریب منعقد ہوئی ۔خرطوم یونیورسٹی کے بڑے بڑے سکالر اور پروفیسرز حضرات اس میں شریک تھے ، اس کے علاوہ حکومتی وزرا اور حکومت پاکستان کی طرف سے پاکستانی ہائی

کمشنر بھی موجود تھے۔ چوہدری ولائت صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ اور اُس دن سے وہ ڈاکٹر محمد ولائت ہو گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کی دین ہے کہ ایک مزدور سے جس نے ایک نیکی کا کام کیا تھا ڈاکٹر بن گئے۔ صرف اس لئے کہ غریب سوڈانی قوم کو کوئی سہولت مل جائے، اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کتنا بڑا آدمی ہے، کبھی کبھی ایک چھوٹے آدمی کو بھی اللہ بڑے بڑے کام کرنے کی ہمت عطا کر دیتا ہے۔ بہرحال اس ڈگری دلوانے میں حاجی بوستان صاحب اور حسن الامین نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

جاپان اور دوبئی کا سفر

18 ستمبر 1999ء کو میں قاری تصور الحق صاحب کے ہمراہ براستہ پاکستان PIA کی فلائٹ کے ذریعے جاپان کے سفر پر روانہ ہوا، ہم جب کراچی پہنچے تو وہاں ایک رات کا قیام تھا، اور اگلے دن دوسری فلائٹ سے جاپان جانا تھا۔ ایئرپورٹ سے ہمیں پی، آئی، اے، ہوٹل میں لے جایا گیا، یہ ایک کافی بڑا ہوٹل تھا، مگر اس کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ صفائی کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا، اور عملہ کا بھی مخصوص لباس نہیں تھا بس عامی سے لوگ لگتے تھے، حالانکہ ہوٹل سٹاف کی اپنی ایک الگ شناخت ہوتی ہے، گیسٹ سے کس طرح پیش آنا ہے، لیکن وہاں یہ بات نہیں تھی۔

ہم نے کراچی میں کچھ ساتھیوں کو اطلاع کی ہوئی تھی کہ ہم کراچی میں رکیں گے وہاں پر مولانا محمد یوسف صاحب تھے جن کا اپنا مدرسہ تھا وہ ہمیں اپنے مدرسے میں لے گئے وہاں پر انہوں نے اور علماء کو بھی مدعو کیا ہوا تھا، رات گئے تک ان سے گفتگو ہوتی رہی، پھر ہم نے ان سے اجازت چاہی کہ کراچی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، انہوں نے تسلی دی کہ حالات اتنے بھی خراب نہیں ہیں، بس مہاجر بھائی آپس میں لڑتے رہتے ہیں، عمومی حالات

ٹھیک ہیں۔

دوسرے دن ہم کراچی سے جاپان کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمارے جہاز کو منیلا (فلپائن) میں کچھ دیر کے لئے رکنا تھا۔ جب ہم ایئرپورٹ کے اندر ہال میں گئے تو دیکھا کہ وہ لوگ کافی غریب سے محسوس ہو رہے تھے۔ چھوٹے قد کے اور شکلوں سے کافی شریف لگتے تھے۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہمارے جہاز کا کپتان انہیں ڈانٹ رہا تھا میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ کوئی پاکستانی اپنے ملک سے باہر اتنا بہادر اور جرأت والا ہے، ورنہ پاکستانی جہاں بھی جاتے ہیں ڈرے اور سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ پھر وہاں سے جاپان کے لئے روانہ ہوئے اور رات کے وقت وہاں پہنچے۔ ایئرپورٹ سے نکلنے کے بعد ہمیں بذریعہ ٹرین اپنے دوستوں کے پاس نوگایا شہر جانا تھا جو وہاں سے تقریباً تین سو میل دور تھا، جو ٹرین ہم نے لینی تھی اس کا نام شن کن شین تھا جو کہ بلٹ سے زیادہ تیز تھی۔

جب ہم ریلوے سٹیشن پر گئے تو دیکھا کہ انہوں نے وہاں مختلف رنگوں کی لائٹیں لگائی ہوئی تھیں۔ ان رنگوں کو فالو کرتے ہوئے مسافر اپنے مطلوبہ پلیٹ فارم پر پہنچ جاتے تھے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا، ٹکٹ پر بوگی اور سیٹ نمبر درج تھا، ہم اپنی مطلوبہ سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں ٹرینیں وقت پر روانہ ہوتی ہیں اور چند سیکنڈ سے زیادہ لیٹ نہیں ہوتیں۔ ایک اور بات جو میں نے وہاں نوٹ کی کہ مسافر سوار ہونے کے بعد بہت خاموش رہتے ہیں اور اگر بات چیت کرتے ہیں تو بہت دھیمی آواز میں، اکثر کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔

جب گاڑی سے باہر آئے تو بیت الخلاء کی حاجت ہوئی وہاں دیکھا کہ انہوں نے ایشین اور انگلش دونوں قسم کی ٹوائلٹ کا انتظام کیا ہوا ہے اور صفائی کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ لوگوں سے بات چیت بھی بڑے اچھے طریقے سے کر رہے تھے۔ یہاں رشوت کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ ہم ٹرین سے باہر نکلے اور اپنے میزبانوں کو فون کیا تو وہ جلد ہی ہمیں لینے کے

لئے پہنچ گئے۔ ان میں جناب شیخ احسان، اور شیخ محمد اقبال صاحب تھے، یہ دونوں بھائی قلعہ دیدار سنگھ کے رہنے والے تھے، اور ان کے چچا خدا بخش کے ذریعے ہم نے بھی قلعہ دیدار سنگھ میں زمین خریدی تھی۔ میں ان دونوں حضرات کو پہلے نہیں جانتا تھا لیکن ہمارے ایک ساتھی میاں ممتاز صاحب نے ان کا تعارف کروایا تھا، وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور بہت اچھی مہمان نوازی کی، اور ہماری خوب عزت افزائی فرمائی۔ دوسرے روز ہمیں مختلف جگہوں کی سیر کروائی، شہر بہت خوبصورت تھا، جہاں وہ خود رہتے تھے وہ دیہات کی طرح تھا، آس پاس کی زمینوں پر چاول کی فصل لگی ہوئی تھی، انہوں نے بتایا کہ آس پاس کے لوگ اپنے گھر کے نلکے کھول دیتے ہیں تاکہ اس فصل کو پانی مل جائے، اور اس میں ان کا بھی حصہ پڑ جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر کسی کے گھر میں دو تین گز بھی جگہ ہو تو وہاں پر یہ لوگ کوئی نہ کوئی سبزی اگا دیتے ہیں۔ اور کونسل کے لوگ ہر گھر سے آ کر خود وہ سبزی وغیرہ خرید کر لے جاتے ہیں، چاہے تھوڑی سی مقدار میں ہی کیوں نہ ہو، یہ بھی بتایا کہ ہر آدمی جہاں کام شروع کرتا ہے اُس کا مالک بھی ساتھ میں کام شروع کر دیتا ہے، مالک اور نوکر میں کوئی فرق نہیں۔

میں نے ایک دن کے لئے ناگاسا کی جانا تھا، کیونکہ وہاں ایک آدمی جو گاڑیوں کا کاروبار کرتا تھا اور اس کا ایک نمائندہ مجھے انگلینڈ میں ملا تھا، اس نے اپنی کمپنی کا کارڈ دیا تھا میں نے اُس کمپنی کو فون کیا، اس کے مالک نے کہا کہ میں آپ کے لئے آ جاتا ہوں۔ پھر وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ آیا اور ہم اس کے ساتھ وہاں گئے، بڑا ہی اچھا بندہ تھا، ہمیں اپنے دفتر لے کر گیا، چائے وغیرہ پلائی، مجھے اور قاری صاحب کو کچھ تحفے دیئے، اور پھر اپنے شوروم پر لے گیا، اس نے بتایا کہ وہ پاکستان بھی کافی گاڑیاں بھیجتا ہے۔ اس کے کافی بڑے بڑے شوروم تھے، مجھے ایک شوگن پسند آئی، اس نے کہا اس کا سودا بعد میں کرتے

ہیں، پہلے تمہیں ایک پاکستانی ہوٹل سے کھانا کھلاتا ہوں، ہم جب ہوٹل پر گئے اور دیکھا کہ وہ ایک سکھ کا ہوٹل تھا جب میں نے اسے بتایا کہ یہ تو انڈین سکھ ہے تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ میں نے تو اسے پاکستانی سمجھا ہوا تھا، میں آپ کو کسی دوسرے ہوٹل پر لے کر چلتا ہوں، میں نے کہا کوئی بات نہیں ہم کوئی دال ساگ کھالیں گے۔

پھر اس کے ساتھ گپ شپ چلتی رہی، گاڑی کی قیمت کی بات ہوئی تو وہ جو مانگ رہا تھا میں اس سے کم بتا رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ ہم جاپانی ایک ہی قیمت بتاتے ہیں، میں نے اس سے مزاق میں کہا کہ ہم پاکستانی ضرور کم کرواتے ہیں، اس نے کہا کوئی بات نہیں سودا ہونا ضروری نہیں، میں نے آپ کو جہاں سے اٹھایا تھا وہیں واپس چھوڑ کر آؤں گا۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو ہمارے ساتھ بھیجا اور اس نے ہمیں واپس اسی جگہ اتار دیا، اور مزے کی بات یہ کہ اس کے ماتھے پر کوئی شکن بھی نہ آئی کہ میں نے ان کے ساتھ اتنا کچھ کیا اور انہوں نے گاڑی نہیں خریدی۔

دوسرے دن اپنے میزبان شیخ صاحب کو بتایا کہ میں نے کچھ گاڑیاں خریدنی ہیں، وہ ایک جگہ لے کر گئے لیکن وہاں سودا نہ ہوسکا۔ پھر انہوں نے ایک اور ساتھی چوہدری احسان صاحب کو بلایا، انہوں نے کہا کہ میرے پاس چار گاڑیاں ہیں وہ لے لیں۔ اُن سے بات طے ہوگئی، پھر شیخ صاحب نے اپنے دوستوں کو اپنے گھر بلایا، اور کافی بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔ مختلف دوستوں سے ملاقات ہوئی، جب گپ شپ ہوئی تو کسی نے بتایا کہ میں 20 سال سے یہاں رہ رہا ہوں اور کسی نے کہا 15 سال اور کوئی دس سال سے وہاں رہ رہے تھے، لیکن اکیلے ہی وہ رہ رہے تھے، انہوں نے بتایا ہم جتنے بھی یہاں رہ رہے ہیں غیر قانونی ہیں، ہم چوری چھپے رہتے ہیں، جو لوگ شادی کر لیتے ہیں وہ قانونی طریقے سے رہ سکتے ہیں۔ کئی لوگوں نے شادیاں کی ہوئی ہیں، جاپانی عورتیں بہت اچھی ہیں، اور اپنے

مردوں کی بہت خدمت کرتی ہیں، اور یہاں تک کہ ان کے رشتہ داروں کو بھی منگوا کر دیتی ہیں۔ ان لوگوں نے بتایا کہ ہم چونکہ غیر قانونی طور پر مقیم ہیں اس لئے ہم میں سے کوئی جاپان سے باہر چلا جائے تو واپس نہیں آ سکتا، اور اگر کوئی غیر قانونی کام کرتا ہوا پکڑا جائے تو اسے بھی نکال دیتے ہیں۔ ہم نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ یہاں شادیاں کیوں نہیں کر لیتے، اور پھر تین چار سال بعد پاکستان چلے جائیں، جیسے ہم انگلینڈ والے شروع میں کرتے تھے، ویسے بھی میں نے دیکھا کہ جن پاکستانیوں نے وہاں شادیاں کی ہوئی تھیں ان کی جوڑی بہت اچھی لگتی تھی۔ پاکستانی تھوڑا اونچے قد کا اور جاپانی قدرے چھوٹے قد کی، بچے بھی بڑے پیارے نظر آتے تھے، لگتا تھا پاکستانی ہی ہیں۔ دوسرا جاپانی جتنے بھی ایڈوانس ہو جائیں ان کا اپنے کلچر کے ساتھ بہت لگاؤ ہے۔ ان کی عورت مرد کی خوب خدمت کرتی ہے، اور نظر آتا ہے کہ ان کا کلچر بھی یہی تقاضا کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں جن لوگوں نے شادیاں پاکستان میں کی ہوئی ہیں اور وہاں زندگیاں گزار رہے ہیں وہ اپنے پر بھی اور ان پر بھی ظلم کر رہے ہیں۔ جن بھائی بہنوں کے لئے وہ یہاں محنت کر رہے ہیں جب یہ بوڑھے ہو کر واپس جائیں گے تو وہ بھول جائیں گے کہ انہوں نے ان کے لئے کچھ کیا ہے۔ ان کا پہلا سوال ہوگا کہ کیا لائے ہو؟ جو پہلے دیا تھا وہ سب کھوہ کھاتے جائے گا۔ اور آپ نے اپنے خاندان کی زندگی بہتر کرتے کرتے اپنی زندگی ضائع کر دی، انسان کو زندگی ایک بار ملتی ہے، اس کو اس طرح برباد نہیں کرنا چاہیئے، اس کو اچھی طرح سے بسر کرنی چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جاپان والوں کو ضرور شادی کرنی چاہیئے، آگے ان کی اپنی مرضی ہے۔

باقی جاپانی قوم کے حوالے سے میں بات کروں تو یہ بہت محنتی قوم ہے، اور بہت ہی ڈسپلن کے ساتھ رہتے ہیں، بہت ہی صاف ستھرے ہیں کسی کو نہیں دیکھا کہ زمین پر

تھوک رہا ہو، یا کوئی کوڑا کرکٹ زمین پر پھینک رہے ہوں، آپس میں لڑائی جھگڑا بھی نہیں کرتے، اور بڑے اخلاق سے ملتے ہیں، میں کہتا ہوں نمبر 1 قوم ہے۔

شیخ صاحب کے گھر آنے والوں سے قاری صاحب نے پوچھا کہ یہاں کوئی مسجد بھی ہے تو انہوں بتایا کہ یہاں کوئی با قاعدہ مسجد نہیں، لیکن تبلیغی کام بہت اچھا ہو رہا ہے، ایک گھر میں اکھٹے ہوتے ہیں اور وہاں اجتماعی اعمال ہوتے ہیں۔ قاری صاحب نے تمام ساتھیوں کے ساتھ دینی حوالے سے بات چیت کی جو انہوں نے بہت غور سے سنی۔

جاپان ایک امیر ملک ہے لیکن دوسرے ملکوں کے لوگوں کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے، اپنا مال جس میں کاریں اور دوسرا سامان شامل ہے پوری دنیا جس میں یورپ، امریکہ، اور افریقہ شامل ہے وہاں فروخت کرتے ہیں لیکن ان کے مزدوروں کو قبول نہیں کرتے۔ میں نے کوئی افریقی آدمی وہاں نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی اور ملک کا، ممکن ہے جہاں میرا جانا ہوا وہاں نہ ہوں، لیکن جس طرح پاکستانیوں کا حال دیکھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ باقیوں کا بھی یہی حال ہوگا، انڈین لوگ تو ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں لیکن وہاں کوئی انڈین بھی نہیں دیکھا۔

جاپانی لوگ پھولوں کے بہت شوقین ہیں جہاں ان کو خالی جگہ ملتی ہے وہاں پھول اگاتے ہیں، ان کے روڈ، گلیاں اور راستے پھولوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جاپان کا سفر مکمل کر کے ہم واپس روانہ ہوئے، جب ایئر پورٹ پر پہنچے تو جس آدمی کے پاس شوگن دیکھنے گئے تھے اس کا فون آیا کہ مسٹر علی اپنی قیمت پر گاڑی لے لیں، میں نے اُن سے معذرت کی کہ اب میں ایئر پورٹ پر ہوں اور واپسی کا سفر ہے۔ اُس نے کہا کوئی بات نہیں پھر ہم چین کے راستے واپس پاکستان آرہے تھے۔ بیجنگ ایئر پورٹ پر اترے تو اتنا رش نہیں تھا۔ لیکن جاپان کی نسبت غریب نظر آرہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے جہاز سے باہر

آنے کی اجازت نہ دی، اس لئے یہ نہیں بتا سکتا جاپان اور چائنہ کا کیا فرق ہے۔ وہاں سے پاکستان آئے۔ کچھ دن وہاں رکنے کے بعد اگلا سفر دوبئ کا تھا۔

دوبئ کا سفر

محبت علی، قاری تصور الحق اور محمود دوبئ میں

ہمارا دوبئ میں قیام پانچ دن کا تھا۔ جب میں اور قاری صاحب دوبئ ایئر پورٹ پر اترے تو جناب محمود صاحب اور مختار صاحب ہمارا پہلے سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہمیں ایک تھری سٹار ہوٹل میں لے کر گئے جس میں زیادہ تر روس کے لوگ ٹھیرتے ہیں۔ محمود صاحب کی اپنی وین تھی، ان کا ہوٹل کے ساتھ کنٹریکٹ تھا۔ ہوٹل میں آنے جانے والے مسافروں کو وہی سروس فراہم کرتے تھے، اور ان کا بزنس بہت اچھا تھا۔ مختار صاحب دوبئ پولیس میں آفیسر تھے۔ محمود صاحب نے ہمیں دوبئ کی مختلف جگہوں کی سیر کرائی، وہاں کی بڑی بڑی بلڈنگیں دکھائیں، جو ابھی زیر تعمیر تھیں، اس کے علاوہ بڑی بڑی مارکیٹیں بھی دکھائیں۔ وہ دوسری ریاست رأس الخیمہ بھی لے کر گئے۔

عرب امارات کی جو ریاستیں ہیں وہ بہت بڑی نہیں ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ ایک دو گھنٹے میں آپ اگلی ریاست میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ سمندر بہت صاف اور کم گہرے ہیں، اور جو بلڈنگیں بن رہی ہیں وہ بھی سمندر کے اندر بن

رہی ہیں، حالانکہ ان کے پاس زمین کی کمی نہیں لیکن یہ ان کی اپنی سوچ ہے۔خوب پیسہ خرچ کر رہے ہیں ۔دوسری ان کی جتنی بھی مارکیٹیں ہیں وہاں ہر طرف انڈین چھائے ہوئے ہیں،کوئی بھی بزنس لے لیں وہی مالک لگتے ہیں۔سونے کی دوکان ہو یا فوڈ کی، کپڑے کی ہو یا سپئیر پارٹس کی سبھی جگہ وہی بیٹھے ہوئے ہیں ، اور پورا دوبئ ان کے قبضے میں ہے ۔ حکومت کے معاملات میں ان کا بہت عمل دخل ہے۔آپ شلوار قمیص میں جائیں تو آپ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے ۔ان کی بزنس بہت بڑے لیول کی ہے،اور وہ تقریباً ایک قسم کے مالک ہی ہیں۔

دوبئ پوری دنیا کے لئے ٹریڈ سینٹر بن گیا ہے ، اس سے آزاد ہونے والی ریاستوں اور پوری دنیا سے لوگ یہاں خریداری کے لئے آتے ہیں ۔جس کا سب سے زیادہ فائدہ انڈین اٹھا رہے ہیں ۔دوسری طرف انہوں نے باقاعدہ اپنے مندر بنا لئے ہیں ۔انڈیا کی فلمیں خوب چلتی ہیں ، ان کے ایکٹرز یہاں آتے ہیں اور خوب پیسہ کماتے ہیں ۔ان کی عزت پاکستانیوں سے بہت زیادہ کی جاتی ہے۔ پاکستانی بھائیوں کا یہ حال ہے کہ زیادہ تر مزدور ہیں ۔جتنی بلڈنگیں بنائی جا رہی ہیں ان میں زیادہ تر یہی لوگ کام کرتے ہیں ۔ہوٹل کا چھوٹا سٹاف یا ٹیکسی ڈرائیور کوئی پاکستانی ہوگا۔ بزنس اگر ہیں بھی تو چھوٹے لیول پر، جیسے ٹیلر ماسٹر، حجام اور مکینک وغیرہ ۔ پھر ان کی ملکیت بھی نہیں۔ اگر ایک حجام دوکان کرایہ پر لیتا ہے یا اس کی اپنی ہے تو وہ پوری قیمت ادا کرے گا، ہر ماہ کرایہ بھی ادا کرے گا،بل بھی دے گا،مگر وہ دوکان پھر بھی آدھی ایک عربی کی ہوگی جس نے کوئی قیمت نہیں ادا کی ،اور نہ ہی کوئی بل دیا،لیکن ہر ماہ کے اختتام پر آ کر حساب کتاب کر کے آمدن کا نصف لے لے گا، اگر کسی وجہ سے انکار کیا تو دوکان سے نکال دیا جائے گا،اور جیل بھی بھیج دیا جائے گا، یا ملک بدر کر دیا جائے گا۔اس لئے ہمارے پاکستانی بھائی بہت خوف زدہ

رہتے ہیں مگر اگر ان سے کہا جائے کہ یہ ظلم ہے تو کہتے ہیں کہ نہیں ہمارا مالک بہت اچھا ہے جتنا دیتے ہیں لے لیتا ہے۔

اب سوچیں پوری دنیا میں جہاں بھی آپ کام کریں وہ سب آپ کا ہوگا مگر ہمارے پیارے عرب بھائی جہاں سے اسلام چلا ہے ان کو دیکھیں کہ انہوں نے ہمیں ماڈرن غلام بنایا ہوا ہے کہ کام بھی ہم کریں، کرایہ اور بل بھی ہم ادا کریں اور مفت میں رقم لے کر وہ چلے جائیں۔اس وقت جو غلام ہوتے تھے ان سے صرف کام لیا جاتا تھا اب کام بھی لیا جاتا ہے اور مفت میں رقم بھی لے رہے ہیں۔

پھر میں نے پوچھا کہ اپنے عربوں کو کیا سہولت دے رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ ہر قبیلہ کی خدمت بھی کرتے ہیں اس لئے ان کی عوام خوش ہے۔اب دیکھیں ہم پاکستانی اپنے آپ کے دشمن ہیں کوئی پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان کہلاتا ہے، اگر سنی ہے تو عربوں کی حمایت کرتا ہے اور شیعہ ہے تو ایران کی حمایت کرتا ہے۔اور جب ان کے ملک میں جاتا ہے تو اس کو صرف پاکستانی سمجھ کر اس کا استحصال کرتے ہیں، اور ہمارے بڑے چاہے جو بھی ان کے ساتھ ان لوگوں کی دوستیاں ہیں، اور ہر آدمی بڑھ چڑھ کر ان کی خدمت کرتا ہے، مگر عام پاکستانی کی کون مدد کرے گا۔

دوسرا میں نے دیکھا کہ انہوں نے کوئی بڑے کارخانے نہیں لگائے، اور نہ ہی ان کے پاس کوئی قابل کاشت زمین ہے نہ ہی جنگل ہیں اور نہ ہی دریا ہیں نہ کوئی کوئلہ کی کان یا نمک یا سنگ مرمر کی۔ہاں ان کے پاس تعلیم یافتہ لوگ ہیں، پھر بھی دنیا کے لحاظ سے انہوں نے پاکستانیوں کو غلام بنا رکھا ہے۔اور ہمارے ملک میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم غلام ہیں، جس کا حق ہے اس کو کام نہیں کرنے دیتے اور لوگوں کے لئے کام کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں اگر ہمارے بزرگوں نے آزادی لے کر دی تھی اس کی قدر کریں،

اپنے آپ میں پاکستانی قومیت پیدا کریں تب جا کر آپ کو عزت ملے گی۔

جرمنی کا سفر

میں ہر دو سال بعد بزنس کے سلسلہ میں جرمنی کے شہر فرنکفرٹ جاتا تھا کیونکہ وہاں ایک مشہور بزنس سینٹر ہے جہاں پر دنیا کی مختلف کمپنیوں کی ایگزبیشن لگتی ہے کبھی کپڑے کی، کبھی گاڑیوں کے سپیئر پارٹس کی، اور کبھی کسی اور چیز کی اور پوری دنیا سے کمپنیوں کا مال آتا ہے، اور اسی طرح سے پوری دنیا سے بزنس مین یہاں اکھٹے ہوتے ہیں، اور کروڑوں اربوں کے سودے ہوتے ہیں۔ میرے بیٹے امجد اور مجھ میں باری ہوتی تھی ایک سال وہ جاتا تھا اور ایک سال میں۔ میں نے اپنی باری پر اپنے دیرینہ دوست قاری تصور الحق صاحب سے کہا کہ چلیئے آپ کو جرمنی کی سیر کراتا ہوں وہ اس کے لئے تیار ہو گئے۔

اُدھر حاجی بوستان صاحب کے دوست راجہ نواز صاحب جن کا تعلق کوٹلی آزاد کشمیر سے ہے اُن کو فون کر دیا کہ اس طرح ہم دو ساتھی آرہے ہیں، انہوں نے کہا کہ فکر نہ کریں میں بندوبست کر دوں گا۔

مانچسٹر ایئرپورٹ سے ہم فرنکفرٹ کے لئے روانہ ہوئے، اور ایئرپورٹ سے ہی ہم نے راجہ نواز صاحب کو فون کیا تو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی راجہ محمد شفیق کو بھیج دیا اور وہ تھوڑی دیر میں ہمیں لینے کے لئے آ گئے۔ راجہ نواز صاحب جرمنی میں تبلیغی جماعت سے

وابستہ ہیں اور وہاں پر جماعت کے امیر ہیں ہم ان کے گھر میں پہنچے جو فرنکفرٹ شہر سے باہر ایک دیہات میں تھا۔ بہت زبردست مکان تھا، انہوں نے خاص طور پر مہمانوں کے لئے ایک علیحدہ جگہ بنائی ہوئی تھی۔

ان کی اہلیہ نومسلم جرمن ہیں، مگر صوم وصلوٰۃ کی بڑی پابند، ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ڈیوزبری کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں۔ اُن کی والدہ وہاں پر مسلم عورتوں کو دینی تعلیم دیتی ہیں، ان کا گھرانہ بہت مذہبی ہے۔

راجہ صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہاں جرمنی میں ترک مسلمان کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ اُن کی ایک مسجد بالکل قریب میں ہے وہاں آپ کے وزٹ کا پروگرام رکھا ہوا ہے۔ شام کو ہمیں لے کر وہاں چلے گئے، وہ ایک نئ تعمیر شدہ مسجد تھی اور اس کے ساتھ ہی امام مسجد کا گھر بھی تھا۔ اور یہ سب ترکی کی حکومت نے تعمیر کیا تھا اور اخراجات بھی وہی برداشت کرتی تھی۔ شام کو مغرب کی نماز کھڑی ہوئی تو دیکھا کہ امام صاحب نے اپنا جبہ، اور عمامہ جو کہ وہیں پر رکھا ہوا تھا وہ پہنا، اور نماز شروع کروادی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو پیچھے مؤذن نے بلند آواز سے کچھ ذکر کیا اور لوگوں نے اس کی پیروی کی۔ جو بھی ذکر وہ بتاتا سب پڑھنے لگتے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر ہم درمیان والے ہال میں آ گئے، اس میں ایک فوڈ سٹور تھا جس میں سے لوگ خریداری کر رہے تھے۔ پھر ساتھ ہی ایک کمیونٹی ہال تھا، جس میں ٹیلی ویژن لگا ہوا تھا، لوگ وہاں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہے تھے، اور گپ شپ بھی کر رہے تھے۔

امام صاحب نے راجہ نواز صاحب سے کہا کہ میں سب ساتھیوں کو جمع کرتا ہوں اور قاری صاحب کا دینی حوالے سے کوئی بیان ہو جائے۔ پھر قاری صاحب نے وہاں تقریر کی، اور کافی ساتھی جمع ہو گئے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کھانے کی دعوت

رکھ دی۔ ہمیں اسی مسجد کے بیسمنٹ میں لے گئے، وہاں پر ایک عمدہ کچن بنا ہوا تھا، اُس میں مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ ہال بنے ہوئے تھے۔ بڑا صاف ستھرا ماحول تھا، کھانا بھی کھایا، اور ان سے بات چیت ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ ترکی کے لوگ جرمنی میں ایک دو سال کے لئے رہتے ہیں، کام کاج کرتے ہیں اور پھر واپس ترکی چلے جاتے ہیں۔ اور اسی طرح ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے، مگر انہوں نے جرمن نیشنلٹی نہیں لی ہوئی، اور وہ جرمنی کی سیاست میں کوئی خاص رول ادا نہیں کرتے۔ اس لئے اُن کے ہماری طرح کوئی زیادہ کاروبار نہیں، اور نہ ہی کوئی زیادہ سیاستدان۔ مگر لوگ پڑھے لکھے ہیں، اُن میں ایک پروفیسر صاحب بھی تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میرا ایک بھتیجا ہے جو انگلینڈ دیکھنا چاہتا ہے، کیا آپ اس کا بندوبست کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ بالکل فکر نہ کریں، پھر وہ لڑکا بعد میں میرے پاس شفیلڈ میں دو ہفتے رہ کر گیا۔

اگلے دن ہم محمدی مسجد میں گئے وہاں پر مولوی مشتاق صاحب نے بھی پروگرام رکھا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد اگلے دن ہم پاکستانی ساتھیوں کی ایک مسجد میں گئے جہاں مولانا احسان صاحب تھے یہ مسجد ابھی نئی نئی بنی تھی، اور نمازیوں کی تعداد کم تھی، مولانا صاحب نے ہمیں وہیں قیام کی دعوت دی کیونکہ وہ بزنس سینٹر کے بھی قریب تھی ہم نے راجہ نواز صاحب سے اجازت مانگی تو وہ راضی ہو گئے، وہیں قیام کیا پھر اپنے بزنس کے حوالے سے جو کام کرنا تھا وہ کیا اور فارغ ہو کر واپسی کا ارادہ کیا۔ راجہ شفیق صاحب سے گزارش کی کہ ہمیں ایئرپورٹ تک چھوڑ دیں انہوں نے ہمیں ایئرپورٹ چھوڑ دیا۔

جرمن قوم ایک اچھی قوم ہے بات چیت دھیمے انداز میں کرتے ہیں، اکثر پڑھتے رہتے ہیں، راستے میں زیادہ کھل کر بات نہیں کرتے اور انگلش میں بات کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔ جرمن ہمیں نہیں آتی تھی، اگر راستہ پوچھنا پڑ جاتا تو کافی مشکل پیش آتی تھی۔

اگر آپ کسی انگریز سے راستہ پوچھیں تو وہ کھڑے ہو کر بڑی تسلی سے راستہ بتا ئے گا، اور آپ کی پوری مدد کرے گا، لیکن یہ چیز وہاں نہیں دیکھی۔

ان کے روڈ بہت اچھے ہیں، ریل کا نظام بہت اچھا ہے وہاں آپ سارا دن ریل پر سفر کرتے رہیں کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا۔ وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ٹکٹ چیک کرنے کے لئے کبھی کبھی کوئی آتا ہے، اگر کسی کے پاس ٹکٹ نہ ہو تو پورے مہینے کا ٹکٹ اس سے بطور جرمانہ کے وصول کرتے ہیں، اس لئے یہ غلطی کوئی نہیں کرتا کہ بغیر ٹکٹ کے سفر کرے، اور اگر کرلے تو پھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

پاکستانی وہاں بہت کم تعداد میں رہتے ہیں، اور ایک جگہ نہیں رہتے، اور کاروبار بھی ان کے کم ہیں، زیادہ تر انگلینڈ سے سامان لے کر تجارت کرتے ہیں، ترکی کے لوگ زیادہ تعداد میں ہیں۔

اسپین کا سفر

اسپین یورپ کا بہت اہم اور خوبصورت ملک ہے، یہ وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں نے طویل عرصہ تک حکومت کی۔ میں نے جہاں اور کئی ممالک کی سیر کی ہے وہیں سپین کا سفر بھی کیا ہے، اسپین کے اس سفر میں میرے ہمراہیوں میں چار افراد میرے علاوہ شامل تھے، ڈاکٹر شاہنواز صاحب، رضوان صاحب، محمد عظیم صاحب اور چوہدری شوکت صاحب۔

شفیلڈ سے رضوان صاحب کی کار پر سوار ہو کر مانچسٹر ایئر پورٹ پہنچے، گاڑی وہیں پارک کی اور ہر ینا ایئر لائن کے ذریعے اسپین کے شہر مالاگاہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ دن کے تقریباً 2 بجے وہاں پہنچ گئے، رضوان بھائی نے پہلے ہی سے وہاں سے کار بک کروائی ہوئی تھی، اس پر سوار ہو کر ہم جبرالٹر (جبل الطارق) کی طرف روانہ ہوئے۔ دن کے تقریباً 2 بجے وہاں پہنچ گئے۔ رضوان بھائی چونکہ اس سفر کے منتظم تھے اور سارے امور انہی کی نگرانی میں طے ہو رہے تھے، اس لئے ہم نے پہلے ہی ان کو امیر قافلہ مقرر کر دیا تھا۔

موٹر وے پر جاتے ہوئے ہمیں ایک مسجد کا سائن ملا، ہم اس طرف مڑ گئے جو کہ ایک اونچی جگہ پر آباد گاؤں میں واقع تھی جو کہ موٹر وے سے تقریباً تین کلومیٹر دور تھا۔ بہت ہی خوبصورت مسجد سمندر کے کنارے ایک حسین منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ مسجد سعودی بادشاہ نے بنوائی ہوئی ہے کیونکہ سعودی حکمران اور شہزادے جب بھی چھٹیاں گزارنے یہاں آتے ہیں تو اپنی دیگر مشغولیات سے فارغ ہو کر نماز کے لئے یہاں آتے ہیں۔ اس مسجد کا سب خرچہ سعودی حکومت برداشت کرتی ہے۔ ہم نے یہاں نماز پڑھی، ڈاکٹر شاہنواز صاحب جو گھر سے پراٹھے لائے تھے ہم سب نے مل کر کھائے، اور خوب انجوائے کیا۔

پھر آگے سفر پر روانہ ہو گئے ،سب ساتھی چونکہ دینی شغف رکھنے والے تھے تو یہی باتیں ہوتی رہیں کہ کس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ان علاقوں میں آئے اور دین کو دنیا کے اس کونے تک لانے میں مشکلات اٹھائیں ۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے تو زیادہ تر علاقہ غیر آباد تھا اور سبزہ بھی کم تھا۔ مالاگاہ کے قریب سڑکوں کی حالت بہت اچھی تھی لیکن آگے چل کر وہ بات نہ تھی۔ شام کے بعد ہم جبرالٹر کے نزدیک پہنچ گئے ،وہاں پہلے سے ہوٹل بک کیا ہوا تھا، وہاں رات بسر کی اور صبح جبرالٹر کے لئے روانہ ہو گئے۔

یہ علاقہ حکومت برطانیہ کے زیر اثر ہے جب اندر داخل ہوئے تو سڑک پر برٹش پولیس کھڑی تھی ،اورلوگوں کی چیکنگ کررہی تھی ،ہم نے بتایا کہ ہم انگلینڈ سے آئے ہیں تو وہ بڑے اچھے طریقے سے پیش آئے ،اس کے بعد ہم اس علاقے میں داخل ہو گئے ۔ یہ تقریباً 15 مربع میل علاقہ ہے، اور یہاں باقاعدہ انگلش بولی جاتی ہے،کرنسی بھی پونڈ ہے، ہر چیز انگلینڈ کی ہے ۔زیادہ تر مراکش کے عرب آباد ہیں اور اکثر چھوٹے موٹے کام وہی کرتے ہیں ۔سامنے ایک پہاڑ ہے جس طرف سے طارق بن زیاد داخل ہوا تھا۔آخری کنارے پر مسلمانوں نے ایک بہت بڑی مسجد بنائی ہوئی ہے۔ہم نے اس مسجد میں ظہر،عصر اور مغرب کی نمازیں ادا کیں ۔ ہمارے امام ڈاکٹر شاہ نواز تھے ، وہ جماعت میں اکثر جاتے رہتے ہیں ۔انہیں احساس تھا کہ جب آدمی سفر میں ہوتا ہے تو تھکاوٹ محسوس کرتا ہے تو وہ ہلکی نماز پڑھاتے تھے ،مگر ہمارے دو ساتھیوں نے اعتراض کیا کہ آپ بہت جلدی نماز پڑھاتے ہیں تو انھوں نے مغرب کی نماز تھوڑی لمبی کر دی ۔اب پھر اعتراض ہوا کہ آپ نے لمبی نماز پڑھا دی ۔ بات میرے پہ آئی کہ آپ بتائیں کیا کیا جائے ، میں نے کہا کہ میں بھی اکثر تبلیغ پہ جاتا ہوں تو سنا ہے کہ امیر کی اطاعت کرو، اور امام کا احترام کرو، اب امام کو اپنا کام کرنے دیں اس کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہر آدمی کی سنے اور اس پر عمل کرے ،شائد وہ سمجھے ہوں کہ

میں ڈاکٹر صاحب کی طرف داری کر رہا ہوں لیکن میں ایک اصول کی بات کر رہا تھا۔

رات کو ہم نے انگلش فش اینڈ چپس کھائی، قیام وہیں ایک ہوٹل میں تھا، شام کو میں اور رضوان بھائی سمندر کے کنارے گئے، اس کا پانی بالکل ہوٹل کے ساتھ آجاتا ہے، بڑی زبردست شام تھی۔ صبح جب ناشتہ کر کے بل دینے لگے تو انہوں نے بتایا کہ آپ کے ایک ساتھی پہلے ہی چائے وغیرہ پی گئے ہیں۔ خیر بل ادا کیا اور آگے چل پڑے راستے میں دیکھا کہ بہت بڑا علاقہ ہے اور ہر طرف زیتون کے درخت میلوں پر پھیلے ہوئے ہیں، انہوں نے باقی سب فصلوں کو چھوڑ کر صرف زیتون کاشت کی ہوئی ہے جس سے ان کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی قوم کوئی کام کرنا چاہے تو کوئی مشکل نہیں۔ روڈ بھی بہت بڑے بڑے تھے۔ نظر آتا تھا کہ نواز شریف اور ان کی سوچ ایک ہی ہے کہ جب تک آمدورفت کا نظام نہیں بنائیں گے ترقی نہیں کر سکتے۔ وہاں بیل کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس طرف بھی نگاہ دوڑائیں ہر بورڈ پر بیل کی تصویر نظر آئے گی۔ پھر جب سمندر کا نظارہ کیا تو دیکھا کہ انہوں نے سمندر کو کافی صاف رکھا ہوا ہے اب آگے ہمارا جو قیام تھا وہ ایک اپارٹمنٹ تھا، اس میں دو کمرے تھے اور ایک کچن ہر کمرے میں دو آدمیوں کی جگہ تھی، اور کچن کے ساتھ ایک بیڈ لگی ہوئی تھی۔ عظیم صاحب کہنے لگے یہاں نہیں رہیں گے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا، جب اندر گئے تو ہم بھی سوچ میں پڑ گئے کہ کون کہاں سوئے گا لیکن عظیم صاحب نے فوراً ایک بیڈ پر قبضہ کر لیا، اس سفر میں عظیم صاحب کی پھرتیاں قابل دید تھیں۔

اسپین میں حلال کھانا ملنا مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے وہاں طویل عرصہ حکومت کی ہے، اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انہوں نے نتیجہ نکالا کہ مسلمان تین چیزوں سے نفرت کرتے ہیں، ایک سور، دوسری شراب، اور تیسرا زنا، انہوں نے یہ تین چیزیں عام کی ہوئی ہیں، اور آسانی سے دستیاب ہیں، ہمیں وہاں جانے سے پہلے اس کا علم

نہیں تھا، ہم سوچ رہے تھے کہ انگلینڈ کی طرح حلال آسانی سے مل جائے گا لیکن وہاں حلال حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ ہمارے دو ساتھی رضوان اور شوکت صاحب کھانا لینے گئے تو ان کو بہت زیادہ ٹائم لگا جس پر ہمیں کافی تشویش ہوئی، پھر جب وہ واپس آئے تو بتایا کہ بہت دور ایک مسلمانوں کا ریسٹورنٹ ملا اس لئے دیر ہو گئی۔ رات کو دو دو ساتھی سوئے اب کچھ ساتھیوں کو خراٹوں کا مسئلہ ہوتا ہے جس سے ہم دو چار ہوئے، لیکن عظیم صاحب مزے سے سوئے رہے۔

اس شہر میں پانچ چھ سٹوریاں بلڈنگ تھیں، گلیاں تنگ لیکن صاف ستھری تھیں۔ میرے ساتھی کہہ رہے تھے یہ بلڈنگیں مسلمانوں نے بنائی تھیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اس دور کی ہوں لیکن جب عرب ممالک کو دیکھتا ہوں تو مجھے نہیں لگتا کہ انہوں نے بنائی ہیں۔ سمندر کے کنارے بڑی بڑی دیوارایں، کشادہ سڑکیں اگر یہ مسلمانوں نے بنائی ہیں تو پھر یہ ان کا شاندار کارنامہ تھا۔ دوسری طرف دیکھیں انگریز نے انڈیا پر حکومت کی تو انہوں نے وہاں کے لوگوں پر بھی لگایا اور وہاں سے لا کر انگلینڈ کو بھی بنایا، جب کہ ہمارے حکمران صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں انہیں عوام کی فکر نہیں ہوتی۔

اب ہمارا اگلا سفر قرطبہ کی طرف تھا، صبح سویرے ہم نکل پڑے، سب سے پہلے ایک کافی شاپ پر رکے تا کہ ناشتہ کر لیں، ڈاکٹر شاہ نواز صاحب نے سب کے لئے چائے کا بندوبست کیا اور ساتھیوں کو پیش کی، تمام ساتھی ڈاکٹر صاحب کی خدمت سے بہت خوش ہوئے۔ وہاں ایک پاکستانی سے ملاقات بھی ہوئی جس نے اپنی بیوی کے ساتھ فروٹ سٹال لگایا ہوا تھا، جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم بھی پاکستانی ہیں تو انہوں نے ہماری کافی آؤ بھگت کی۔ ہم مختلف جگہوں پر پڑاؤ ڈالتے ہوئے چار بجے کے قریب قرطبہ پہنچ گئے۔ اور سیدھے اس ہوٹل میں گئے جو پہلے سے ہم نے بک کروایا ہوا تھا، یہ ہوٹل بہت ہی اچھا اور صاف

ستھرا تھا، کچھ دیر آرام کرنے کے بعد باہر سیر کے لئے نکل گئے، وہاں قریب ہی ایک بہت بڑا باغ تھا۔ یہ باغ مسلمان حکمرانوں نے بنایا تھا اور وہ وہاں اپنا وقت گزارتے تھے، پھر صبح اسی ہوٹل میں بھرپور ناشتہ کیا۔

پھر رضوان صاحب کے کزن ان سے ملاقات کے لئے آئے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ساری جگہوں کی سیر کراؤں گا، اور کھانا بھی میری طرف سے ہے، وہ اپنی ایک بڑی گاڑی میں ہمیں مسجد قرطبہ کی طرف لے کر چل پڑے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی وہاں حکمرانی، ان کی ذاتی زندگی، ان کی بیگمات کے قصے، ان کی محبت کی داستانیں سناتے ہوئے مسجد قرطبہ لے گئے۔ جس طرف سے ہم آئے تھے وہاں ایک سڑک علامہ اقبالؒ کے نام سے منسوب تھی۔ اس سے آگے ہم نے ایک دریا کو پل کے کے ذریعے سے پاس کیا تو آگے مسجد آ گئی۔ انتظامیہ نے ہمیں بتایا کہ آپ یہاں نماز نہیں پڑھ سکتے، وہ ہر آدمی پر نظر رکھتے ہیں تاکہ کوئی ان کے اصول کی خلاف ورزی نہ کرے۔

پھر میں نے دیکھا کہ یہ ایک شاندار مسجد ہے جو بہت ہی کشادہ ہے، سینکڑوں ستونوں پر مشتمل ہے اور جس طرف سے بھی دیکھو وہ ایک لائن میں نظر آتے ہیں، اور قرآنی آیات ابھی تک وہاں کندہ ہیں۔ لیکن وہاں ان لوگوں نے اس مسجد کے اندر بہت سے چرچ بنا دیئے ہیں، یہ دیکھ کر ہر آنے والے مسلمان کا دل اداس ہو جاتا ہے، مگر ایک فخر بھی محسوس ہوتا ہے کہ کتنی تکلیفیں برداشت کر کے مسلمان یورپ تک آئے اور کتنی شاندار تاریخ چھوڑ کر گئے، بہرحال اس شاندار مسجد کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ ہم ظہر کی نماز ادا کرنا چاہتے تھے، وہاں ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ وضو کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ پرائیویٹ طور پر وہاں ایک گھر والوں نے ایک کمرہ نماز کے لئے مخصوص کیا تھا، اور اپنے گھر کا باتھ روم استعمال کرنے کی سہولت رکھی ہوئی تھی۔

پھر اس گھر والوں نے بتایا کہ ہمارا ایک ریسٹورنٹ ہے،تو ہم لوگ وہاں چلے گئے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ رضوان صاحب کے کزن سے پوچھ کر جاتے جنہوں نے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔وہاں پہنچنے پر جب انہوں نے کہا کہ کیا کھانا ہے ؟ تو ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ جو کچھ ہے سب لے آؤ،اور جب وہ لے آئے تو وہ صاحب کہنے لگے کہ اس کی تو ہمیں ضرورت نہ تھی، میں نے کہا اب جو کچھ آ گیا ہے سب چلے گا،جب بل دیا تو ہمیں دن میں تارے نظر آ گئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر غرناطہ گرانڈ کے لئے چل پڑے وہاں پہنچ کر ہوٹل میں سامان رکھا،اور بادشاہ کا محل دیکھنے کے لئے چل دیئے ، جو کہ اس ہوٹل کے نزدیک ہی تھا۔وہاں انٹری کے لئے ٹکٹ لینا پڑتا ہے اور وہ ایک کارڈ دیتے ہیں جو واپسی پر آپ کو جمع کرانا پڑتا ہے۔جو دوسرے ملکوں کے لوگ سیر کے لئے آتے ہیں وہ باقاعدہ گروپ کی شکل میں جاتے ہیں ۔ہم سب دوست اکھٹے چل پڑے ، یہ بہت بڑا محل تھا اس کے ساتھ ایک بہت بڑا باغ تھا اور سمندر بھی، کسی جگہ عربی عبارت لکھی ہوئی تھی۔

یہ محل مسلم تعمیرات کا شاہکار ہے،اس کو بنانے کے لئے پانی اور مٹیریل کا انتظام اس وقت کتنا مشکل تھا لیکن ان لوگوں نے کر کے دکھایا،اور آج سینکڑوں سال بعد بھی لاکھوں لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔اور جو قلعہ تھا وہ بھی بہت بڑا تھا میرے لئے چلنا مشکل ہو رہا تھا ، کیونکہ میں دل کا مریض تھا، اور کچھ ماہ پہلے ہی اسٹنٹ پڑا تھا، پھر بھی ہمت کی اور ساتھیوں کا ساتھ دیتا رہا،اس کو دیکھنے کے لئے لمبا ٹائم چاہئے اور پھر ہر آدمی اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔میں نے جو دیکھا ہے کہ ہمارے مسلم حکمران بڑی عمارتیں ہی بناتے رہے ہیں، جس طرح انڈیا میں انہوں نے تعمیریں کیں، وہ عیاشیاں ہی کرتے رہے ہیں، ممکن ہے اور بھی کام کئے ہوں، بہر حال ان کے جانے کے بعد اسپین والوں نے وہ کلچر ختم کر دیا۔ یہ

لوگ جواب وہاں ہیں ہماری طرح کے دِکھتے ہیں، ان سے بات کریں تو اچھی طرح سے بات کرتے ہیں، اور مدد کرنے والے ہیں، مگر مسلمانوں کو اتنا اچھا بھی نہیں سمجھتے۔

وہاں مراکش کے بھی کافی لوگ ہیں کیونکہ سمندر کی دوسری طرف مراکش ہے۔ اور درمیان میں بہت کم فاصلہ ہے۔آخری رات ہم غرناطہ شہر میں گئے، وہاں ہم نے ایک پیزہ لیا اور ہوٹل میں آکر کھایا، بہت زبردست تھا، رات گزارنے کے بعد صبح ہوٹل سے مالاگاہ ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہونا تھا، ہوٹل تو جلدی چھوڑ دیا لیکن فلائٹ دوپہر کی تھی۔ وہاں سے ایئرپورٹ گئے اور پھر مانچسٹر واپس آ گئے۔

ہمارا یہ سفر بہت شاندار تھا جس میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا، ایک تو یہ کہ جہاں بھی جائیں جماعت والا اصول اپنائیں امیر سفر مقرر کریں، اور پھر ان کی مان کر چلیں، کم از کم دو ساتھی ضرور جائیں ۔ ہر کام مشورہ سے کریں، کوئی غلط کام ہو جائے تو دوسرے پر الزام تراشی کے بجائے اپنی غلطی کو تسلیم کریں۔

بہرحال ہمارا یہ سفر بہت شاندار رہا جس میں رضوان بھائی اور ڈاکٹر شاہنواز نے بہت خدمت کی ۔ چوہدری شوکت صاحب شعر و شاعری سے محظوظ کرتے رہے، عظیم صاحب نے خوب ذکر وفکر کیا، سب سے کمزور میں ہی رہا، گاڑی میں بھی فرنٹ سیٹ پر میرا ہی قبضہ تھا کیونکہ مجھے سردی زیادہ لگتی تھی، ساتھیوں نے خوشی سے اس کو قبول کیا ان کا شکریہ، باقی میرا ایک ہی کام اچھا تھا کہ بیگم کے ہاتھوں سے بنی ہوئی کھجور سے سارے راستے میں ساتھیوں کی خدمت کرتا رہا، اس طرح ہم جیسے دوستی میں گئے تھے ویسے ہی واپس آئے۔

بریلوی اہل سنت والجماعت

مذہبی معاملات بہت ہی نازک ہیں ان پر بات کرنا بڑا مشکل کام ہے کسی کو غلط نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہر آدمی نے اللہ کو جواب دینا ہے اس لئے میں یہاں صرف چند ایک تاریخی واقعات جو شفیلڈ میں رونما ہوئے ان کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

شفیلڈ میں آباد پاکستانیوں میں سے 75 فیصد کا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے ہے، اکثر کی ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں۔ نہ بھی ہوں تو ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں والے تعلقات ہیں۔ 1970ء تک سب ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، اور کوئی فرقہ بندی کا تصوّر نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے پیر معروف صاحب نے یہ کام شروع کیا کہ ہم ایک نہیں ہیں، اس لئے یا تو مسجد پر قبضہ کرو، نہیں تو اپنی بنالو۔

سب سے پہلے یہ کام رادھرم میں شروع ہوا۔ وہاں پر سب ایک ہی برادری کے لوگ اور آپس میں رشتہ دار تھے، مگر جب لوگوں کو بتایا گیا کہ دیوبندی ہی اصل ہیں، اور دوسری طرف بتایا گیا کہ بریلوی اصل ہیں، تو پھر لڑائیاں شروع ہوگئیں، اور دو گروپ بن گئے۔ یہ سب آپس میں رشتہ دار تھے، مگر ایک طرف کے علماء آتے تو ان کو جوش دلاتے اور دوسری طرف کے دوسری طرف والوں کو جوش دلاتے۔ اور اس پر ہر روز کی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ اب کسی کے گھر کسی کی بہن ہے اور کسی کی بیٹی بیاہی ہوئی ہے، اس سارے چکر میں گھروں کا سکون برباد ہوگیا، بچے الگ سے سہمے ہوئے تھے۔

اتنی بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں کہ اللہ کی پناہ۔ پولیس مسجد میں آجاتی، پھر کچھ لوگ درمیان میں آگئے اور کہا کہ ایک جماعت مسجد لے لے اور دوسری رقم لے کر اپنی الگ سے

مسجد بنالے۔ 17 مارچ 1982ء کو فیصلہ ہوا کہ ایک پارٹی دوسری کو (5000) پانچ ہزار پونڈ دے اور وہ اپنی مسجد لے لیں، پھر ایسا ہی ہوا، انہوں نے کالج روڈ پر نئ مسجد لے لی اور اس طویل لڑائی کا انجام ہوا۔ اب اللہ کا فضل ہے کہ ایک دوسرے کی مسجد میں جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی مرگ، اور شادی بیاہ میں بھی شریک ہوتے ہیں۔

دوسری لڑائی غوثیہ مسجد فرتھ پارک میں ہوئی، وہاں بھی دونوں طرف چوہدری تھے۔ ایک طرف جٹ چوہدری اور دوسری طرف آرئیں چوہدری۔ دونوں گروپ ایک دوسرے کے ساتھ میرپور میں صدیوں اکھٹے رہے۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپس میں لڑائی جھگڑا ہوا ہو، دونوں کے بزرگوں کی آپس میں اتنی دوستیاں تھیں کہ آپ یقین نہیں کریں گے آرائیں برادری کے لوگ شروع سے کاروباری تھے اور لڑائی جھگڑے پر یقین نہیں رکھتے۔

جب 1962ء میں انڈسٹری روڈ مسجد بنی تو یہ لوگ بسوں میں آتے تھے، مجھے ابھی تک یاد ہے محمد یونس صاحب کے والد نور دین اور ان کے چچا الف دین اور اس کے علاوہ کافی لوگ نماز کے لئے وہاں آتے تھے، لیکن کیا ہوا کہ یہاں بھی دو گروپ آمنے سامنے آگئے۔ اور ان کی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ ایک پارٹی ایک مولوی صاحب کو بلاتی اور دوسری طرف دوسری کسی پیر صاحب کو۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ علماء عوام کی لڑائی میں نہ پڑتے، اور کہتے کہ آپ آپس میں صلح صفائی کرلیں، پھر ہم آئیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ خیر طویل جنگ کے بعد ان کی آپس میں صلح ہوگئی۔

اب باری باری دونوں گروپوں کی طرف سے چیئرمین بن جاتا ہے، اور مسجد اچھی طرح سے چل رہی ہے۔ وہاں امام بھی میرپوری ہیں، لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں، اللہ سب کو اس کی توفیق دے۔

میں یہاں اس بات پر ضرور زور دوں گا کہ علماء اور پیران عظام کا یہ فرض منصبی

ہے کہ وہ عوام کے جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے ان میں صلح وصفائی کروائیں، جب مختلف ذہن کے لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو اختلاف کا خدشہ ہمیشہ رہتا ہے، اورتو اور ایک گھر میں سگے بھائی آپس میں لڑ پڑتے ہیں ،لیکن پڑھے لکھے لوگوں کا فرض منصبی بنتا ہے کہ وہ آگ بھڑکانے بجائے بجھانے کا کردار ادا کریں۔

مناظرہ شفیلڈ

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ 1970ء تک سب مسجدوں میں امام یا تو علاقہ چھچھ کے تھے یا انڈیا کے، مگر پھر بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والے علماء بھی آنا شروع ہو گئے سب سے پہلے جناب پیر معروف صاحب نے بریڈ فورڈ میں کام شروع کیا ان کا تعلق میر پور سے تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہاں اکثریت میر پور سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ہے، جبکہ امام دیو بندی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں تو انہوں نے بریلوی علماء کو بلانا شروع کر دیا۔ اور مختلف شہروں میں مساجد کے اندر پروگرام رکھے اور لوگوں سے بات کی کہ مساجد آپ لوگوں کی ہیں اور امام دوسرے مسلک کے رکھے ہوئے ہیں اپنے مسلک کے امام رکھیں۔ پھر کیا تھا لڑائیوں کی ابتداء ہوگئی ایک بھائی ایک طرف دوسرا دوسری طرف، اور پورے انگلینڈ میں یہ سلسلہ چل پڑا۔

پاکستان سے جو علماء بلائے گئے تھے ان میں مولانا عنایت اللہ صاحب کا نام سر فہرست تھا وہ جس شہر میں بھی جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ یہ دیو بندی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی والے وہابی ہیں ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، اور ان سے نکاح وغیرہ بھی نہ کریں اور اگر پہلے سے کسی نے ان سے کیا ہوا ہے تو پھر سے نکاح کریں۔ اس کی وجہ سے تمام شہروں میں رہنے والوں کے لئے مشکلات پیدا ہوئیں۔

اس وقت دین کے کام کرنے والوں میں انڈیا سے تعلق رکھنے والے لوگ سر

فہرست تھے، سب کی مسجدیں مشترکہ تھیں۔ سب سے پہلے بولٹن میں مولانا محمد اسماعیل اور مولانا موسیٰ قاسمی صاحب اور بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان مناظرہ رکھنے سے متعلق کوئی معاہدہ ہوا جو کسی وجہ سے نہ ہوسکا۔ شفیلڈ اور رادھرم میں بھی یہ سلسلہ چل نکلا تھا بریلوی حضرات اپنے علماء کو بلاتے اور دیوبندی حضرات اپنے علماء کو۔

ہم نے بھی مکی مسجد میں جلسہ رکھا، جس میں علامہ خالد محمود صاحب اور دیگر علماء کرام تشریف لائے، اس جلسہ میں علامہ خالد محمود صاحب نے درود ابراہیمی کو نماز سے باہر پڑھنے کے بارے میں مسئلہ بیان کیا اور مناظرہ کا چیلنج دیا۔ جلسہ میں موجود کچھ حضرات کہنے لگے کہ ہم مناظرہ کے لئے اپنے علماء کو بلائیں گے۔ علامہ صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے میں اپنے دو نمائندے مقرر کرتا ہوں حاجی محبت علی اور سید حسن شاہ صاحب کو آپ ان کے ساتھ انتظامی امور طے کرلیں۔

پھر کیا تھا ہم ٹیکسی کرتے تھے ٹیکسی رینکوں پر اسی موضوع پر بحث ہونے لگی۔ راجہ شبیر صاحب نے کہا کہ میں اپنے علماء کو بلانے کی ذمہ داری لیتا ہوں تو میں اور جناب ریاض بھٹی صاحب جن کا تعلق راولپنڈی سے تھا بھی آگے آگئے۔ راجہ شبیر نے ریاض بھٹی سے کہا کہ آپ ٹائم اور جگہ مقرر کرلیں اور پھر ہمیں اطلاع کردیں میں اپنے علماء کو لے کر آجاؤں گا۔

ہم نے 20، جولائی 1981ء کو مناظرہ کے لئے ہال بک کروالیا اور ان سے کہہ دیا کہ آپ اپنے علماء کو لے کر آجائیں۔ پھر انہوں نے سٹی ہال بک کروالیا۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے راجہ شبیر صاحب سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ اُس وقت تو آپ لوگوں نے کہا تھا کہ آپ ہال بک کروائیں تو وہ کہنے لگے کہ وہ ہال چھوٹا تھا اس لئے لوگوں نے الگ ہال بک کروایا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم تو پہلے دن سے اپنی بات پر کھڑے ہیں اور

آپ ہر میٹنگ کے بعد تبدیل ہو جاتے ہیں، اور اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہتے۔

آخر وہ دن آ گیا، ایک طرف ان کا ہال تھا اور اسی بلڈنگ میں ہمارا ہال بھی تھا، لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ان کے علماء نے مناظرہ تو کرنا نہیں تھا اس لئے وہ ہمارے ہال میں نہ آئے، ہمارے علماء ہمیں بتا رہے تھے کہ وہ بھاگ گئے ہیں ان کے ان کو بتا رہے تھے کہ وہ بھاگ گئے ہیں۔ جب وہ ہمارے ہال میں نہ آئے تو 3 بجے مولانا ضیاء القاسمی صاحب نے بریلویوں کی شکست کا اعلان کر دیا۔

ہم نے علامہ صاحب سے کہا کہ کیوں نہ ہم ان کے ہال میں چلیں، انہوں نے کہا کہ میں چلنے کے لئے تیار ہوں آپ ان سے بات کر لیں، ہم نے ان سے بات کی، اور ایک معاہدہ طے ہوا کہ دو نمائندے ہمارے ہوں گے اور دو ان کے۔ ہمارے دیوبندیوں کی طرف سے سید حسن شاہ صاحب اور حاجی محمد یوسف صاحب ہوں گے اور بریلوی حضرات کی طرف سے ماسٹر نذیر صاحب اور راجہ محمد شبیر صاحب ہوں گے اور ان کا کام یہ ہوگا کہ ہر پارٹی کو پانچ منٹ کا ٹائم دیں گے، تین مائک ہوں گے ہر فریق کے پاس ایک مائک ہوگا، اور ایک کمیٹی کے نمائندوں کے پاس۔ ہر ایک کا سٹیج الگ ہوگا۔

جب ہم اپنے علماء کے ساتھ ان کے ہال میں گئے تو دو سٹیج بنے ہوئے تھے ایک پر دیوبندی اہل سنت والجماعت لکھا ہوا تھا اور دوسری طرف بریلوی اہل سنت والجماعت لکھا ہوا تھا۔ جب ہم ہال میں داخل ہوئے تو انہوں نے وعدہ خلافی کی اور نعرہ لگایا کہ یہ گستاخ رسول ہیں، اور اور بھی بدتمیزیاں کیں، تو ہمارے نوجوانوں نے علماء دیوبند زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ خیر ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

وہاں پر مقامی انگریز بھی تھے، اور پولیس اور انتظامیہ کے لوگ بھی اور دیکھنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے علماء کس طرح مناظرہ کرتے ہیں، اور ہم لوگوں کو بھی بہت شوق

تھا کہ مناظرہ میں آج فیصلہ ہو جائے گا، اور روز روز کی لڑائی ختم ہو جائے گی۔ ہمارے صدر مولانا ضیاء القاسمی صاحب مقرر ہوئے اور مناظر علامہ خالد محمود صاحب۔ جب علامہ صاحب نے بات شروع کی اور مقررہ وقت پانچ منٹ میں اپنی بات پوری کر لی۔

اس کے بعد مولانا عنایت اللہ صاحب جو بریلویوں کے مناظر تھے نے بات شروع کی مگر انہوں نے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے اور بات شروع کر دی، اور پانچ منٹ سے زیادہ وقت لیا اور بار بار ایک ہی نعرہ لگانا شروع کر دیا "اپنا عقیدہ کھلّو" بجائے دلیل سے بات کرنے کے شور وشرابہ اور گالم گلوچ میں ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت گزر گیا۔ ہال کا وقت ختم ہوا تو انتظامیہ کے لوگوں نے کہا کہ اب برائے مہربانی پانچ منٹ میں ہال خالی کر دیں ہم نے دروازے بند کرنے ہیں ہم نے آپ کا مناظرہ دیکھ لیا ہے، پھر کبھی آپ کو اس مقصد کے لئے ہال نہیں دیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ بھائی بھائی تھے، پھر ان میں لڑائی ڈلوانی کی کیا ضرورت تھی، اور ثابت بھی کچھ نہ ہوا۔ ہر آدمی کو اپنی قبر میں جانا ہے اور اپنا حساب دینا ہے۔ مناظروں سے مسائل حل نہیں ہوتے، جب تک ہم ایک قوم بن کر نہ رہیں۔ ہمارا اللہ بھی ایک، رسول بھی ایک اور قرآن بھی ایک اور دین بھی ایک ہے، اب اس پر جو زیادہ عمل کرے گا وہ اللہ کے نزدیک زیادہ نیک ہوگا۔

مجھے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت

مناظرہ کے بعد یہاں شفیلڈ کے حالات کافی بگڑے ہوئے تھے، دیوبندی بریلوی چپقلش جاری تھی، ایک دوسرے کولوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اس دوران 7، اپریل 1983ء بروز جمعرات میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے نانا جان کے گھر دیکھا۔ میرے نانا جان اپنے گاؤں میں نمازی اور قرآن کی تلاوت کرنے والے جانے جاتے تھے۔ اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ہر جمعہ کو جمعہ کی نماز اپنے گھر سے تقریباً 5 میل دور میر پور شہر کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ گاؤں میں لوگ جھاڑ پھونک اور دم وغیرہ کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور ان سے دعاء کرایا کرتے تھے۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے نانا جی کے گھر کافی لوگ جمع ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ میں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی۔ آپ درمیانی قد تقریباً 5 فٹ نو انچ کے نظر آرہے تھے، اور سر پر بڑے بڑے بال تھے، جیسے زلفیں ہوتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فرنفرٹ پر کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ واللہ اعلم

آزاد کشمیر کی سیاسی و علاقائی جماعتیں

جب ہم لوگ اس ملک میں اچھی طرح سیٹل ہو گئے تو سب سے پہلے پیروں اور سیاسی جماعتوں کے لیڈروں نے یہاں آنا شروع کر دیا۔سب سے پہلے 1976ء میں چوہدری نور حسین صاحب انگلینڈ آئے اس وقت وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے ایڈوائزر تھے۔ان کا تعلق میر پور سے تھا اور یہاں بھی اکثریت میر پور والوں کی تھی، وہ اپنی جوانی ہی سے غریبوں کے لئے آواز اٹھانے کے لئے مشہور تھے۔اور لوگ اُن سے بہت پیار کرتے تھے۔ جب وہ یہاں آئے تو لوگوں نے ان کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ان کو بہت پیار دیا۔

پھر آہستہ آہستہ دوسرے لیڈر اور کارکن بھی آنا شروع ہو گئے اور سمجھدار رشتہ دار بھی۔ ہم ان کی دعوت کرتے اور ساتھ خدمت بھی۔ پھر ہر سال یہ تعداد بڑھنے لگی، پہلے کبھی کبھی آتے تھے اور پھر ہر سال آنا شروع ہو گئے، اور یہ سلسلہ میر پور سے نکل کر آزاد کشمیر کے دوسرے اضلاع تک پھیل گیا، اور یہ کام اب بھی جاری ہے۔

ایک دفعہ برگیڈئیر حیات خان آئے ،ان کی حکومت تازہ تازہ ختم ہوئی تھی ۔ انہوں نے انگلینڈ کے دورے میں ہمارے شہر کا بھی پروگرام رکھا جس میں انہوں نے اپنی جماعت بنائی، اُس کا خزانچی مجھے بنایا گیا، اُسی وقت چندہ جمع کیا گیا اور جو رقم جمع ہوئی تھی برگیڈیئر صاحب نے کہا مجھے دے دیں۔

میں نے کہا میں خزانچی ہوں یہ تو میرے پاس رہنی چاہیۓ ، انہوں نے کہا یہ تو مجھے دے دو بعد میں جو اکھٹی کرو گے وہ مجھے وہاں جماعت کے لئے روانہ کر دینا، اس کے

بعد میں نے کسی کو نہیں دیکھا، بہت سے لوگ اس کے گواہ ہیں۔

اس کے بعد چوہدری سلطان محمود صاحب نے آنا شروع کیا، لوگ ان سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی پارٹی آزاد مسلم کانفرنس کو پیپلز پارٹی میں شامل کر لیا پھر کیا تھا سب لوگ اس میں شامل ہونا شروع ہو گئے اور زیادہ تر جٹ، چوہدری اور گجر چوہدری کے نمائندے تھے۔ ویسے وہ ہمارے دوست چوہدری کرامت صاحب کے بڑے قریب سمجھے جاتے ہیں، اگر بیرسٹر صاحب آزاد مسلم کانفرنس میں ہیں تو وہ اس کے صدر ہیں، اگر پیپلز پارٹی میں ہیں تو اس کے صدر اور اب جب وہ تحریک انصاف میں گئے ہیں تو یہ بھی وہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی جان، مال اور وقت ان کے لئے وقف کیا ہوا ہے۔ مگر جب کام ہو تو کچھ نہیں ہوتا۔

جب بیرسٹر صاحب وزیر اعظم بنے تو میں نے چوہدری کرامت اور چوہدری محمد ولائت صاحب کو کہا کہ جناب حاجی بوستان صاحب کو علماء کی سیٹ پر منتخب کرائیں، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر یہ دونوں چوہدری یٰسین صاحب کے پاس گئے، انہوں نے وعدہ کیا کہ جب بیرسٹر صاحب انگلینڈ آئیں گے تو میں آپ کے سامنے کہوں گا۔ اور پھر جب وزیر اعظم صاحب برمنگھم آئے تو ہم بھی وہاں چلے گئے۔

ہم نے اپنی گزارش ان کے سامنے رکھی لیکن اُس پر کچھ جواب نہیں ملا، حالانکہ حاجی بوستان صاحب کو دنیا جانتی تھی مگر انہوں نے وہی کام کرنا تھا جو انہیں پسند تھا۔ چوہدری کرامت صاحب دونوں کو اپنا لیڈر مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ میری ہر بات مانتے ہیں لیکن اس معاملے میں ہم نے دیکھ لیا کہ وہ ان کی کتنی مانتے ہیں۔

اس کے بعد مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے بھی اپنے لوگوں کے پاس آنا شروع کر دیا جو کہ زیادہ تر راجہ برادری کے نمائندے تھے، ان میں سردار قیوم، اور سردار سکندر حیات

صاحب شامل تھے۔ جو بھی آتا وہ یہی کہتا کہ میں آپ کے لئے کام کرتا ہوں، اور اپنے گروپ کے لوگوں سے اپنی تعریف کرواتا، دوسرا اپنے گروپ سے۔ کبھی کبھار ان گروپوں میں لڑائیاں بھی ہو جاتیں۔

جب سردار عتیق صاحب وزیر اعظم بن کر انگلینڈ آئے تو انہیں ہیرو جیسا پروٹوکول دیا گیا۔ ہر شہر میں اُن کے جلسے ہوئے، ہڈرسفیلڈ، شفیلڈ، برمنگھم ہر جگہ ان کی عزت افزائی ہوئی۔

اس کے بعد ایک کام اور ہوا کہ ایک برادری کا ایک بڑا لیڈر آیا اور کہا کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں کیوں نہ ہم اپنی برادری کی یہاں جماعت بنائیں اور ہمارے جو غریب بچے، بچیاں ہیں ان کی تعلیم کا بندوبست کریں، اور ان کی مدد کریں۔ سب سے پہلے ایک صاحب نے آ کر آرائیں چوہدریوں کی جماعت بنائی، پھر مغل آئے انہوں نے اپنی جماعت بنائی، پھر انصاری اور جٹ اور راجے۔ ہم لوگوں نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں پاؤنڈ ان لوگوں کو دیئے کہ ہمارے قبیلے کے غریب لوگ فائدہ اٹھائیں مگر غریبوں نے کہاں فائدہ اٹھانا تھا مگر ان لیڈروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

یہاں ہر شہر میں اپنے کلکٹر بنائے وہ چندہ یا ممبر شپ جو بھی نام دیں اکٹھا کرتے، وہاں پر نہ تو کوئی سکول بنا اور نہ ہی کسی کو سکالر شپ ملی۔ ہم وہاں جاتے تو کسی کو کوئی علم نہیں تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ نہ ہی کوئی چیک اینڈ بیلنس کہ وہ رقم کہاں گئی؟ اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ تو ایک دوسرے کے سر پر تھوپ کر خود بری الذمہ ہو جاتے۔ اگر تھوڑا بہت کوئی کام ہوا تو وہ بھی برادری ازم کا نام اونچا کرنے کے لئے۔

اب آپ دیکھیں کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ صرف ہمارا نام پوچھ کر کام دے دیتے ہیں، سکول میں داخلہ مل جاتا ہے، حالانکہ ان کا رنگ بھی الگ، مذہب بھی الگ

ملک بھی الگ لیکن ہر ایک کو اس کا حق ملتا ہے۔جو چیز بھی ملتی ہے باری پر۔ہمیں انہوں نے شہریت بھی دی، سہولت بھی، اور دنیا کی عزت بھی، مگر ہم پھر بھی نہیں سمجھتے کہ ترقی کرنی ہے تو کس طرح کرنی ہے۔

یہاں کی سیاسی جماعتوں کے نظام کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو بندہ ایک پارٹی میں شامل ہوتا ہے تو اس کا ہو کر رہ جاتا ہے۔اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرے معیار کی نہیں تو الگ ہو کر خاموش ہو جاتا ہے۔مگر ہمارے ہاں دیکھیں تو ایک لیڈر آزاد مسلم کانفرنس سے ہوتے ہوئے، پیپلز پارٹی، پھر مسلم لیگ اور پھر پی، ٹی آئی میں آئے اور شائد کل کسی اور میں ہوں۔

دوسری طرف وہ لوگ جو مسلم کانفرنس میں تھے اور اپنے آپ کو نظریاتی کہتے تھے لیکن جب بڑے راجہ صاحب نے کہا کہ آج سے ہم مسلم لیگی ہیں تو سب انہی کے ہو گئے۔اس کا مطلب یہ کہ عوام بھیڑ بکریاں ہیں جہاں مرضی ہانک کر لے جائیں۔جو لوگ کچھ عرصہ قبل تک سردار عتیق پر جان نچھاور کرتے تھے آج وہی ان کو چور وڈا کو کہہ رہے ہیں۔

ہم لوگ جو یہاں رہ رہے ہیں ہمارا پاکستان یا آزاد کشمیر کی سیاست میں کوئی کردار نہیں ہے لیکن ہمیں صرف استعمال کیا جاتا ہے، اور پھر ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ہم نے اس ملک کو اپنی مرضی سے ملک بنایا ہے، کسی نے زبردستی نہیں کی، میرے جیسے لوگ جو ساٹھ سال سے اس ملک میں رہ رہے ہیں، اور پاکستان کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں، ان جگہوں سے پیار کرتے ہیں جہاں ہمارا بچپن گزرا ہے، وہاں کے لوگوں سے بھی واقفیت ہے، پورے کلچر کو سمجھتے ہیں۔لیکن وہاں میں جاتا ہوں تو دو چار ہفتوں کے لئے، اور مر بھی گیا تو قبر وہاں نصیب ہو مجھے نہیں لگتا۔

اب ہماری اولاد اور ان کی اولادیں تقریباً پانچ نسلیں ہو گئی ہیں، یہاں کے

ماحول میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ وہاں کے کلچر سے بہت کم ان کو شناسائی ہے، اگر وہاں جاتے بھی ہیں تو عام لوگوں سے میل ملاپ نہیں کرتے، وہاں بھی اب انگریزی کلچر عام ہوگیا ہے اور سوچ بھی انگریزی۔ اب ہم اپنی اولادوں کو کنفیوز کر رہے ہیں۔

پھر ایک اور بہت بڑا مسئلہ یہاں پر ہم نے اپنی نوجوان نسل کے لئے پیدا کیا ہے، ان کو بتایا ہے کہ ہم راجے، چوہدری، جٹ اور مغل ہیں، مزدوری کرنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ دوسری طرف بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دیتے، آج ایشین کمیونٹی میں سب سے کم تعلیم یافتہ پاکستانی ہیں۔ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اچھی نوکری نہیں ملتی، اور ذہنیّت راجہ اور مہا راجہ والی ہے۔ تو مزدوری کرنی نہیں، جس کے نتیجے میں بہت سے نوجوان غلط راستوں پر نکل گئے ہیں۔ آج منشایات کے کاروبار میں جیلیں پاکستانی نوجوانوں سے بھری ہیں یہ سب ہماری تربیت کا نتیجہ ہے۔

ہم خود جب یہاں آئے تو مزدوری کرنے میں عار محسوس نہیں کی۔ میں نے خود ایک عرصہ تک فیکٹری میں مزدوری کی، اور محنت کر کے اپنا نام بنایا۔ آج یہاں جو انگریز ڈگری ہولڈر نہیں تو وہ کسی بھی کام کے لئے تیار ہوتا ہے، اور اگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے کسی مقام پر پہنچا ہے تو اس کے اندر بھی عاجزی ہے، وہ اپنے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہے، دوسروں کو حقیر نہیں سمجھتے۔

میں نے مزدوری بھی کی، کمیونٹی ورک بھی کیا، میرا واسطہ ایم، پی، ایز وزراء اور کمیونٹی ممبروں سے رہا ہے۔ جب کبھی بات چیت کا موقع ملا تو میں نے معذرت کے ساتھ کہا کہ میری انگلش اچھی نہیں تو ہر دفعہ انہوں نے کہا کہ آپ کی انگلش بہت اچھی ہے اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ جہاں میں کام کرتا رہا، اگر کوئی اوپر والا آفیسر نہیں آیا تو نیچے والے کو اس کی جگہ لگا دیا جاتا ہے وہ کوئی بھی ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک نے ہمیں عزت دی، ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں اس کے بعد ہمیں برٹش ہونے پر فخر محسوس کرنا چاہئے۔ہم یہاں سے سو فیصد فائدہ اٹھا رہے ہیں، ہم خود یہاں ہیں اور ہماری اولادیں بھی۔اور جو وہاں رہ گئے ہیں ان کو بھی یہاں بلانے کی فکر میں ہیں۔ہم جن لیڈروں کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں انہوں نے بھی اپنی جائدادیں یہیں بنائی ہوئی ہیں،اور اولادوں کو بھی یہیں منتقل کر دیا ہے،اور خود بھی ریٹائیرڈ ہوکر یہاں آجاتے ہیں تو بہتر ہے کہ ہم بھی یہیں کا سوچیں۔

پاکستان کی سیاسی جماعتوں کا برطانیہ میں کردار

جب جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کیا تو اس کے بعد اس نے پیپلز پارٹی کو نشانے پہ رکھا ہوا تھا اور اسی کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ردعمل کے طور پر پیپلز پارٹی کے لوگوں نے جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ ادھر جنرل صاحب اسلام کا نام بہت لیتے تھے۔ پاکستانی میں جاری احتجاج کے اثرات یہاں انگلینڈ میں بھی ظاہر ہونا شروع ہوئے یہاں موجود چند این، جی اوز نے برٹش حکومت کو کہنا شروع کر دیا کہ ایک تو پاکستان میں فوجی حکومت ہے، دوسرا اسلامی قانون جس کی موجودگی میں وہاں لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو یہاں آنے دیں۔

پھر آہستہ آہستہ کچھ لیڈر یہاں آ گئے، کچھ عرصہ کے بعد عام لوگوں نے بھی آنا شروع کر دیا اور ان کو بھی پیپلز پارٹی کے کھاتے میں ڈال کر یہاں سیاسی پناہ دینے میں مدد کی گئی۔ پیپلز پارٹی کو سیاسی طور پر ایکٹو کیا گیا، اور مختلف شہروں میں اس کی برانچیں کھلنا شروع ہو گئیں۔ یہاں شفیلڈ میں انچارج ملک میاں صاحب تھے۔ پارٹی کو یہاں مضبوط کیا گیا، جلسے کئے گئے۔ اب پاؤنڈ بھی ملنا شروع ہو گئے اور عزت بھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے مسلم لیگ کے لوگ بھی آنا شروع ہو گئے، ان کی بھی ممبر سازیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں شفیلڈ میں راجہ ظفر الحق صاحب کے کافی رشتہ دار رہتے تھے اور علاقے والے بھی، انہوں نے راجہ جمیل اختر صاحب کو اپنا چیئرمین بنا لیا۔

ادھر پاکستان میں مذہبی جماعتوں کا الائینس MMA بھی بن گیا، ہمارے

علمائے کرام بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے لیڈروں کو بلانا شروع کر دیا مسلم لیگ والے نواز شریف صاحب کو اور ایم ، ایم ، اے والے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو۔ ہمارے ہاں مسلم سینٹر میں مسلم لیگ اور ایم ، ایم ، اے کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا، اس میں ہم میر پور والوں میں نہ محبت علی تھا اور نہ حاجی بوستان صاحب کیونکہ یہ پاکستانیوں کی جماعتیں تھیں۔

پھر ایک اور جماعت وجود میں آئی اور وہ ہے PTI جس کے چیئرمین عمران خان ہیں یہ نوجوانوں کی جماعت کے طور پر ابھری۔ اس میں پڑھے لکھے لوگوں کی کافی تعداد ہے، لیکن بہت جذباتی ہیں۔ اگر کوئی عمران خان کے خلاف بات کر دے تو اس کی شامت آجاتی ہے اور بات مرنے مارنے تک جا پہنچتی ہے۔ مانچسٹر میں ایک ٹی وی پروگرام کے اندر لائیو شو میں یہ منظر بھی دیکھا ہے۔

ادھر ایم ، کیو، ایم کے الطاف بھائی کی جماعت نے بھی اپنے لوگوں کو خوب یہاں سیٹل کروایا ، اور ممبر بنائے ۔ ان تمام پارٹیوں کے لیڈروں نے ہمیشہ یہاں کے لوگوں کو استعمال کیا۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو اکھٹا کر کے کبھی پارلیمنٹ کے سامنے اور کبھی کہیں اور پاور شو کئے۔ کبھی نواز شریف کو گالیاں دیں تو کبھی کسی اور کو۔

اُدھر پاکستان سے جو لیڈر آتا ہے تو اس کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے ہاؤس آف کامن لے چلو، تاکہ فوٹو سیشن ہو جائے ، یہاں رہنے والے لوگوں نے کبھی اِس کی تمنا نہیں کی لیکن اُن کا مطالبہ یہی ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں کے جو لارڈ میئر ہیں یا اسمبلی کے ممبر وہ پاکستان جا کر پروٹوکول لیتے ہیں، حکومتوں سے دوستیاں لگا کر اپوزیشن کو برا بھلا کہتے ہیں، پھر یہ لڑائیاں ہر گلی کوچے میں پہنچ جاتی ہیں۔ کبھی نواز شریف کے گھر کے باہر چند لوگوں کو اکھٹا کر کے گالیاں دی جاتی

ہیں اور کبھی عمران خان کی سابقہ بیوی جمائما کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر۔

یہ تماشا لگا ہوا ہے، اور اس سارے کھیل کا ایندھن ہم میرپور کے لوگ ہیں جن کا پاکستان کی سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ پاکستان کا سیاست دان ہو یا بیوروکریٹ، بزنس مین ہو یا کوئی اور وہ میرپور کے سادہ لوح لوگوں کو الّو بنا کر اپنے آگے لگا لیتا ہے، اور ہم سب اندھے، بہرے ہو کر ان کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ جلسہ ہم نے کرنا ہے، چندہ ہم نے دینا ہے، لیکن پاکستان کی حکومت میں ہمارا کوئی کردار نہیں۔

ہمارے گلے ان لیڈروں کے نعرے لگا لگا کر خشک ہو گئے ہیں لیکن بدلے میں ہمیں کیا ملا؟ اور تو چھوڑیئے ان پاکستانی لیڈروں نے آج تک ہم میرپور والوں کو ایک ایئر پورٹ تک نہیں دیا۔ ہر سال لاکھوں میرپوری PIA کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔ اربوں پونڈ پاکستان کو جاتے ہیں لیکن پاکستان کے کسی بڑے عہدے پر کوئی کشمیری نہیں ہے۔

ادھر ہماری آزاد کشمیر کی حکومت بیچاری بے بس اور لاچار ایک سیکرٹری صاحب ساری حکومت چلاتے ہیں۔ جتنے لوگ آزاد کشمیر میں رہتے ہیں اتنے ہی کشمیری برطانیہ میں آباد ہیں لیکن ان کی وہاں کوئی نمائندگی نہیں، حکومتی معاملات میں ان کو شامل نہیں کیا جاتا۔ افسوس ہم صرف ایندھن کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔

یہاں میں ایک شخص کا تذکرہ کرنا چاہوں گا اور وہ ہیں چوہدری سرور صاحب۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی۔ جس جماعت نے ان کو وہاں عزت دی وہ اسی کے خلاف ہو گئے، اور برادری ازم کی سیاست کے شکار ہو گئے میں ان سے اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے پاکستان والی سیاست کرنی تھی تو بہتر تھا کہ یہاں سے نہ جاتے۔ آپ نے کیا معیار مقرر کیا ہے ان لوگوں کے لئے جو برطانیہ کی سیاست کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر آپ الیکشن لڑ کر اسمبلی میں آتے تو مزہ تھا، لیکن

خرید وفروخت کی سیاست کر کے آپ نے اپنے وقار کو بہت زیادہ مجروح کر لیا ہے۔ اصولوں کی سیاست کریں تو آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ میں نے تو اپنے دل کی بھڑاس نکال دی ہے باقی جس کی جو مرضی چاہے کرے۔

بیرون ملک پاکستانیوں کو ووٹ کا حق برطانیہ میں آباد پاکستانیوں کو لڑانے کی سازش

میرے بہت سے دوست ایسے ہیں جو پاکستانی سیاست میں بہت زیادہ ملوث رہتے ہیں، انہی میں ایک محمد اشفاق کیانی بھی ہیں جو کہ پاکستان مسلم لیگ نواز کے شفیلڈ کے صدر ہیں۔ یہ 1980ء میں اپنے والد صاحب کے پاس یہاں انگلینڈ آئے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم یہیں پر مکمل کی اور اب سکول ٹیچر ہیں۔ کمیونٹی میں اچھی شناخت رکھتے ہیں۔ لارڈ نذیر صاحب اور پیر علاؤالدین صدیقی کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ اور مدینہ مسجد کے بھی ممبر ہیں۔

جب ڈیم فنڈ ہوا تھا، اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ گویا کہ وہ تمام سرگرمیاں جن کا پاکستانی معاملات سے تعلق ہو آگے آگے ہوتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں جس طرح ان کی تعلیم ہے، اور لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں وہ اپنا ٹائم ضائع کر رہے ہیں، ان کو یہاں کی مقامی سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ پاکستانی سیاست ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے زہر قاتل ہے۔

اب جو عمران خان کی حکومت بیرون ملک پاکستانیوں کو ووٹ کا حق دینے کے لئے زور لگا رہی ہے۔ میں ایک عام مزدور آدمی کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ ایک تو یہ کام مشکل ہے اور دوسرا اس کے ہمارے لوگوں بالخصوص برطانیہ میں آباد پاکستانیوں پر بہت منفی اثرات پڑیں گے۔ اس کی دو تین اہم وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ پاکستانی پوری دنیا کے اندر پھیلے ہوئے ہیں کہیں ہزاروں میں اور کہیں لاکھوں میں۔ زیادہ تر یورپ اور عرب ممالک میں ہیں یا پھر امریکہ میں یا فار ایسٹ میں۔ اگر عرب ملکوں کو لیں وہاں پر مقامی سرگرمیاں نہیں ہوسکتیں اور وہ اپنے لوگوں کو سیاست کی اجازت نہیں دیتے تو پاکستانیوں کو کس طرح دیں گے۔ اور اگر دیں بھی تو وہ کیسے ووٹنگ کے عمل میں شامل ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ ان کی اکثریت مزدور طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر یورپ کو دیکھیں تو یہاں پر اکثر ان ملکوں کی نیشنلٹی ہولڈر ہیں۔ اگر ان کو پاکستانی سیاسی عمل میں اتنا ہی شامل ہونے کا شوق ہوتا تو یہاں کی شہریت نہ لیتے۔

اور دوسری اہم بات یہ کہ اگر یہاں یورپ اور بالخصوص برطانیہ میں اگر ووٹ کا حق دیا گیا تو گھر گھر لڑائی ہوگی۔ جس کا ہمیں ہرگز فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ یہاں کے مقامی لوگ بھی ہم سے خفا ہوجائیں گے، اور لوگ یہاں کی مقامی سیاست سے بھی دور ہوجائیں گے۔ ہاں پاکستان کے کچھ لوگوں کو فائدہ ضرور ہوجائے گا جو یہاں چندہ کرنے اور چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔

ہمارے لئے یہاں بے شمار مسائل ہیں، خود مسلمان ہونا ہمارے لئے بہت بڑا چیلنج بنا ہوا ہے۔ پچھلے عرصہ میں ہم نے جو اپنا مقام بنایا ہوا ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہورہا ہے اور دوسرے لوگ اس کی جگہ لے رہے ہیں۔

ہاؤس آف لارڈ اور ہاؤس آف کامن میں بھی لڑائی ہورہی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ہمارے لوگوں کو آگے کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو ملازمت اور رہائیش کے حصول میں بھی مسائل درپیش ہیں۔ اگر یہاں پاکستانی ووٹ کا بھی چکر چل گیا تو یہ ہمارے لئے بڑی تباہی کا باعث ہوگا۔

امریکہ میں لوگ دور دور آباد ہیں، اور جاپان میں غیر قانونی طور پر مقیم، وہ

کس طرح ووٹنگ کے اس عمل میں شامل ہوں گے ۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر کچھ کرنا ہےتو حکومت بن کر کریں نہ کہ پارٹی بن کر۔ اگر ہم پاکستان آئیں تو ایئر پورٹ پر اس بات کا اہتمام کریں کہ وہاں ہمیں تکلیف نہ ہو۔ ہمیں سیاحت کے اندر پریشانی نہ ہو، ہماری جائیداوں پر کوئی قبضہ نہ کرے، اور لوٹ مار سے محفوظ رہیں۔

پاکستان میں فوج، پولیس انتظامیہ آپ کی اور پھر بھی ایک حلقے کا انتخاب نہیں کر سکتے اور دھاندلی کا شور شرابا ہوتا ہےتو بیرون ملک کیسے انتظام کریں گے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنے گھر کو ٹھیک کریں ۔ اور اور قوموں کی طرح ایسے قانون بنائیں جو ملکی مفاد میں ہوں۔ اپنے چندہ کے لئے قوم کو ذبح نہ کریں۔

انڈیا اور پاکستان کی آزادی

جو میں نے پڑھا اور بزرگوں سے سنا ہے اس کے مطابق 1860ء میں برٹش حکومت نے پورے انڈیا پر قبضہ کر لیا تھا۔اور انہوں نے پوری پلاننگ کر لی تھی کہ اب یہ ہمارا ملک ہے اور ہم یہاں ہمیشہ رہیں گے،اس کے لئے انہوں نے کچھ چیزوں پر فوری عمل شروع کر دیا مثلاً انگلش سکول اور یونیورسٹیاں بنانا، عدالتی نظام کے لئے کچہریوں کا قیام، باقاعدہ فوج، سول سروس اور پولیس کا قیام، ریلوے کا نظام، نہری نظام وغیرہ۔ان تمام چیزوں پر بہت تیزی سے کام شروع کر دیا۔ جتنے قانون بنائے ان میں ایک چیز مشترک تھی کہ یہ حکومت برطانیہ کے بادشاہ کے ماتحت ہوگی۔ جو بھی برٹش حکومت کے خلاف بات کرے گا وہ حکومت کا باغی ہوگا اور اسے سخت سزا دی جائے گی، اور اسے وطن دشمن قرار دیا جائے گا۔

برٹش گورنمنٹ نے بہت سے لوگوں کو ہزاروں ایکڑ زمین بھی الاٹ کی، کچھ لوگوں کو فوج میں بھرتی کر دیا اور کچھ کو پولیس میں اور کچھ کو سول سروس میں۔ کچھ سٹیٹ بنادیں کہ وہ بھی اسی طرح نظام چلائیں اور ہمارا حصہ ہم کو دیں۔ان میں سے ایک سٹیٹ ریاست جموں وکشمیر کو باقاعدہ فروخت کر دیا اور رقم برطانیہ کے خزانے میں جمع کروادی جو کہ بہت بڑا ظلم تھا۔ہم کشمیریوں کی قیمت ساڑھے سات لاکھ نانک شاہی مقرر کی گئی۔ یہ تو سنا تھا کہ افریقن لوگوں کو غلام بنا کر لائے تھے، مگر وہ دس بیس آدمی ہوئے ہوں گے، مگر ہماری تو پوری قوم کو غلام بنا دیا گیا۔ وہاں سے یہ اور بھی بہت کچھ لے کر آئے تھے جس میں کوہ نور ہیرا بھی تھا۔ بعد میں انڈیا پاکستان دونوں نے اس کا مطالبہ کیا لیکن کسی کو نہیں ملا۔

اب بھی ہم کشمیریوں کو ان سے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ آپ نے ہماری آزادی فروخت کی تھی اور مال اپنے خزانے میں لے کر آ گئے تھے، ہمیں ہماری آزادی واپس دلوائیں۔ ہمارے نوجوان جو یہاں وکیل اور بیرسٹر ہیں ان کو ضرور یہ مقدمہ عدالت میں لے کر جانا چاہیئے۔ ہمارا کیس بہت اچھا ہے، اس پر ہم سب کو غور کرنا چاہیئے۔ کبھی کبھی ایک چھوٹا آدمی کوئی قدم اٹھاتا ہے اگر اس کی نیت ٹھیک ہو تو اللہ کی طرف سے مدد آتی ہے۔

خیر جب ان کا قبضہ ہو گیا تو اکثریت نے اس کو قبول نہیں کیا، اس لئے وہ ان کے خلاف اعلان جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ جب بھی کوئی گروپ بغاوت کرتا تو اسے پکڑ کر یا تو انڈیا سے باہر کسی ملک میں بھیج دیتے، یا پھانسی دے دیتے۔ لوگوں کو سہولتیں بھی حاصل تھیں غریب آدمی کو انصاف ملتا تھا جس کی مثالیں اب بھی ہمارے بزرگ دیتے ہیں کہ انگریز کا انصاف بہت اچھا تھا جو جلد مل جاتا تھا۔ وہ زمینیں جو عرصہ سے بنجر پڑی ہوئی تھیں ان کو آباد کر دیا، ریلوے کا بہترین نظام بنا دیا، سڑکیں اچھی بن گئیں، ان پڑھ لوگوں کو مغربی تعلیم دے دی۔ لیکن اگر نہیں تھی تو قومی آزادی، عام لوگوں نے یہی کہا کہ آزادی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ یہ ہمارا ملک ہے اور اس پر راج بھی ہمارا ہوگا۔ وہ بیچارے سمجھتے تھے کہ آزادی کے بعد ہم خوشحال ہوں گے، لیکن انگریزوں نے جانے سے قبل اپنے نمائندے اپنے پیچھے چھوڑ دیئے۔

انگریزوں نے بڑی پوسٹیں ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔ انڈین کے لئے الگ معیار تھے اور انگریزوں کے لئے الگ۔ سیاسی جماعتیں بھی بنائیں اور مذہبی بھی، آپس میں لڑائیاں کروانے کا سامان بھی کیا۔ تاکہ لوگ ہمیں کچھ نہ کہیں لیکن حیلے بہانے نہ چل سکے اور بالآخر انگریزوں کو انڈیا چھوڑنا پڑا۔ انگریزوں سے پہلے تو مسلمان اور ہندو اکھٹے رہتے تھے لیکن اب ان کے درمیان نفرتیں بڑھ گئیں تھیں، جس طرح دو بھائی علیحدہ ہوتے ہیں تو

ایک کہتا ہے کہ یہ جائیداد میں لوں گا، یہ مکان میرا ہے اور کبھی کبھار تو بات قتل و غارت تک جا پہنچتی ہے مگر پھر بھی بٹوارہ ہو کر رہتا ہے، لیکن پھر ایک بھائی دوسرے کی زمین میں نہیں جا سکتا، اسی طرح انڈیا اور پاکستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ اب جو بٹوارہ انگریز کر کے آئے تھے اس کو تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ جن بزرگوں نے آزادی کے لئے قربانیاں دی تھیں حق تو یہ تھا کہ ان کو آگے کیا جاتا مگر انگریز اپنے مراعات یافتہ طبقہ کو ہم پر مسلط کر کے چلے آئے۔ جنہوں نے اپنی جان مال عزت کی قربانیاں دی تھیں ان کو گالیاں دی جاتی ہیں، سفید لوگ چلے گئے براؤن آ گئے، ان کے دور میں پھر بھی کچھ انصاف تھا اب وہ بھی نہیں۔

پاکستان بنانے میں پنجاب کے لوگوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں، انگریز کا ٹارگٹ بھی پنجاب رہا، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ روشن دماغ لوگ ہیں، اور یہاں کا غریب طبقہ جس طرف ہو جائے تو پھر حکومتوں کا ٹھیر علمائے کرام نا مشکل ہو جاتا ہے۔ پنجاب کے لوگ جنگ آزادی میں سب سے زیادہ متأثر ہوئے چاہے وہ مسلمان ہوں یا پھر سکھ۔ جب ہزاروں لوگوں نے جلیانوالہ باغ میں برٹش حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا تو جنرل ڈائر نے سیدھی گولی چلا دی، اور سینکڑوں لوگ شہید ہو گئے، لیکن ان شہداء کے وارثوں کو تو گالیاں پڑتی ہیں اور انگریز کے ایجنٹ آج بھی حکمران بنے ہوئے ہیں۔

پاکستان کا نظام ریاست

تعلیم

تعلیم کسی بھی ریاست کے نظام میں بنیادی اکائی ہے اس کے بغیر نہ کوئی ریاست چل سکتی ہے اور نہ ہی نظام حکومت۔ جب تک لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے ہر طرف جہالت، غربت اور افلاس پھیل جائے گی۔ تعلیم ہی انسانوں کو مہذب بناتی ہے۔ جاہل قومیں ہمیشہ بدامنی اور انتشار کا شکار رہتی ہیں۔ پاکستان کے نظام تعلیم کی اگر بات کروں تو

اس کا کوئی سر پاؤں نہیں ہے۔ پاکستان کے چار صوبے ہیں اور ہر ایک کی اپنی علاقائی زبان ہے۔ پنجاب کی ماں بولی پنجابی ہے مگر سکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی حالانکہ دس بارہ کروڑ لوگ سینکڑوں سالوں سے یہ زبان بولتے ہیں۔ اسی طرح سندھ میں سندھی، خیبر پختون خواہ میں پشتو، بلوچستان میں بلوچی اور کچھ علاقوں میں سرائیکی زبان بھی بولی جاتی ہے۔ یہ تو بڑی زبانیں ہیں اس کے علاوہ بھی بے شمار زبانیں ہیں جن کو کم از کم مڈل تک پڑھایا جائے تاکہ وہ زبان بھی برقرار رہے، اور ساتھ ہی بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں آسانی رہے۔

دوسری طرف اردو ہماری قومی زبان ہے لیکن اس کو دفتری زبان نہیں بنایا گیا، اور نہ ہی اس کو مکمل طور پر نافذ کیا گیا۔ ہے تو یہ حکمرانوں کی زبان جو کہ باہر سے ایکسپورٹ کی گئی ہے لیکن اب سینکڑوں سالوں سے ہمارے ہاں بولی جاتی ہے، لیکن حکومتوں کی طرف سے اس کی ترقی کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا۔ فارسی بھی ایک زبان تھی جو سکولوں میں پڑھائی جاتی تھی لیکن اب اس کا نام ونشان بھی مٹ گیا ہے۔ انگریزی زبان کو انگریزوں نے یہاں خوب رواج دیا، اور اس کے لئے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں بنائیں، اور حکومتی اداروں میں اس کو نافذ کیا۔ عدالتوں میں اس کو رواج دیا، پھر اعلیٰ تعلیم کی ڈگریوں کے لئے لوگوں کو برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں بھی بھیجا اور اپنا ایک نظام بنایا۔ برطانیہ اور امریکہ کی بہت سی یونیورسٹیوں کی شاخیں پاکستان میں کھل گئی ہیں، اور ہمارے لوگ کروڑوں روپے دے کر ان سے ڈگریاں لے رہے ہیں، اور یہاں سے فارغ ہونے والے لائق لوگوں کو وہ اپنے ملکوں میں لے جاتے ہیں، اور جن کو وہاں چھوڑ جاتے ہیں وہ ہمارے حکمران بن جاتے ہیں، حالانکہ ان کو پاکستانی معاشرے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

طبقاتی نظام تعلیم کو ختم کر کے جب تک یکساں نظام تعلیم نافذ نہیں کیا جاتا ملک

تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتا۔اور قوم تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی بین الاقوامی رابطہ کی زبان ہے،اور اس کے بغیر دنیا کے ساتھ نہیں چل سکتے،لیکن اس کے باوجود مقامی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہئے،جیسے چائینا نے چینی زبان کو بنایا ہے۔اس کے علاوہ دیگر بین الاقوامی زبانوں جیسے عربی،فرنچ اور جرمن وغیرہ بھی پڑھائی جائیں تاکہ باقی دنیا کے ساتھ اپنے تعلقات کو بنانے میں آسانی رہے۔

صحت کا نظام

پاکستان کا نظام صحت بھی طبقاتی تقسیم کا شکار ہے۔امراء کے لئے بڑے بڑے پرائیویٹ ہسپتال ہیں،حکمران وہاں اپنا مفت علاج کراتے ہیں اور امراء اپنا مال خرچ کر کے۔دوسری طرف متوسط طبقہ ہے جو سرکاری ہسپتال میں رشوت دے کر یا سفارش کروا کر کچھ علاج کی سہولت حاصل کر پاتے ہیں۔رہ گئے 75 فیصد غریب طبقہ تو وہ بیچارے صرف ہسپتال کا منہ دیکھ کر واپس آجائیں گے۔عورتیں رکشوں میں بچوں کو جنم دیں گی،اور بچے بیچارے سڑکوں پر اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔

عدالتی نظام

اب عدالتوں کا بھی یہی حال ہے،سب سے پہلے عدالتی زبان انگریزی ہے اور جتنا بھی کاغذی کام ہے وہ انگریزی میں ہوتا ہے جو وکیل کے بغیر نہیں ہوسکتا۔اور بڑی عدالتوں میں تو ہر وکیل پیش بھی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ وہاں سارا کام انگلش میں ہوتا ہے اور وکیل بھاری فیس وصول کرتے ہیں جو غریب کی پہنچ سے باہر ہیں۔دوسری طرف سالوں عدالتوں کا چکر کاٹنے کے باوجود غریب کو انصاف نہیں ملتا۔بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے،اور مجرم آزاد دندناتے پھرتے ہیں۔جج رشوت لے کر مجرم کو رہا اور بے گناہ کو قید کروا دیتے ہیں۔

کونسل

پاکستان میں بلدیہ کے نظام کا یہ حال ہے کہ اگر کسی نے نقشہ یا جائیداد ایک آدمی سے دوسرے کے نام پر منتقل کروانا ہو تو اس کے لئے وہی پرانا گھسا پٹا طریقہ ہے جس میں غریب کا کوئی کام نہیں ہوتا، اور اگر ہو بھی جائے تو کچھ عرصہ کے بعد اس میں غلطیاں نکال کر اس کو بے دخل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح محکمہ مال میں بھی کوئی کام بغیر رشوت کے نہیں ہوتا، اور چپڑاسی سے لے کر اعلیٰ افسر تک سب اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ کئی لوگ تو پچاس ساٹھ سالوں سے فائلوں کے چکر میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

میڈیا

پاکستان میں میڈیا مخصوص افراد کے ایجنڈے پر چلتا ہے، یہ معلوم نہیں کہ مال کون لگاتا ہے، لیکن یہ طے ہے کہ اکثر میڈیا سے لے کر ایک خاص سوچ کو پرموٹ کرنا ہے شام کو اگر ٹی، وی آن کریں تو ہر چینل پر ایک عدالت لگی ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے ایک آدمی کو بلا کر ایک دوسرے سے لڑواتے ہیں۔ میڈیا کا کام کسی سے حساب کرنا یا احتساب کرنا نہیں۔ وہ مہمانوں کو بلا کر ان سے وہاں بیٹھے بیٹھے پچاس، ساٹھ سالوں کا حساب مانگتے ہیں وہاں بیٹھے بیٹھے اس کا حساب کون دے سکتا ہے۔ پھر اس مقصد کے لئے ادارے موجود ہیں، وہ تحقیق کریں، عدالت میں لے جائیں، مگر ایسا نہیں ہوتا اور میڈیا ٹرائل کے ذریعے ایک باعزت شخص کو بدنام کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ برٹش میڈیا کی پوری دنیا میں اسی لئے عزت ہے کہ وہ احساسِ جوابدہی کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ لیکن وہاں اس کی کسی کو پرواہ نہیں۔ پرنٹ میڈیا میں کچھ اچھے لکھنے والے موجود ہیں جیسے عبد القادر حسن، عطاء الحق قاسمی، مجیب الرحمٰن شامی، سہیل وڑائچ، حامد میر، جاوید چوہدری، سلیم صافی اور طلعت حسین وغیرہ۔

فوج

فوج کسی بھی ملک کے دفاع کی ضامن ہے۔سرحدوں کی حفاظت اور غیر معمولی حالات میں ملکی سول اداروں کی مدد کرنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔کیا پاکستان میں بھی فوج کا یہی کردار رہا ہے یا حالات اس سے مختلف ہیں،آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔برطانیہ، امریکہ یا پھر انڈیا میں فوج کی حکومتی معاملات میں کتنی مداخلت ہے۔آپ بخوبی جانتے ہیں لیکن جس طرح پاکستانی فوج کے متعلق کوئی بات نہیں کر سکتا،میرا قلم بھی خاموش ہے۔

سیاست

سیاست نام ہے خدمت کا،کسی ملک میں اگر اصولوں پر سیاست کی جائے تو وہ عبادت بن جاتی ہے،لیکن افسوس کہ پاکستان میں سیاست لوٹ مار کا دوسرا نام ہے۔اچھی سیاست کرنا وہاں مشکل ہے،سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔وہ سیاست دان جو قوم کا درد رکھتے ہوں اور ان کے کام کریں نہ ہونے کے برابر ہیں۔جو نظام چل رہا ہے اُس کی قباحت یہ ہے کہ وہ خاندانی اور موروثی سسٹم پر چل رہا ہے۔جو خاندان دہائیوں سے سیاست میں ہیں،ان کا پورا خاندان کسی نہ کسی جگہ اپنی حیثیت منوا چکا ہے۔ایک بھائی فوج میں ہوگا تو دوسرا پولیس میں،ایک ایک پارٹی میں تو دوسرا دوسری میں، چچا ڈپٹی کمشنر ہے تو ماموں سیکرٹری۔ان کے پاس ہزاروں مربعہ زمین ہوگی ،فیکٹریاں ہوں گی، رئیل اسٹیٹ کا کاروبار۔جو بھی حکومت ہوگی اُس کا حصہ ہوں گے،فوجی حکومت ہو یا سویلین، پیپلز پارٹی کی ہو یا مسلم لیگ کی ،یا پھر پی، ٹی آئی کی۔اپوزیشن کو گالیاں دینے میں بھی آگے آگے ہوں گے،حالانکہ یہی اپوزیشن جب اقتدار میں ہوتی ہے تو یہ اس کے وزیر رہ چکے ہوتے ہیں۔یہ لوگ اپنے مال میں اضافہ کرتے رہتے ہیں،تعداد میں اگرچہ کم ہیں لیکن پورے سسٹم کو یرغمال بنا رکھا ہے۔

سب سے پہلے اگر پنجاب کی بات کروں تو یہ پورے انڈیا میں وہ جگہ ہے جہاں سے پورے ملک کو اناج اور ضروریات زندگی ملتی ہیں۔ یہاں کے لوگ محنت کش ہیں۔ جو بھی باہر سے آیا اُس نے پنجاب کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ اور جس کے ساتھ پنجاب ہو گیا اس کے لئے حکومت کرنا آسان ہو گیا۔ میں پیچھے نہیں جاتا 1947ء کے بعد کو ہی لے لیں جب پاکستان بنا اس کے بعد جتنے لیڈر آئے وہ باہر سے آئے، اور ان کے لئے پنجاب کے بغیر حکومت کرنا مشکل تھی۔ مسلم لیگ ہو یا پیپلز پارٹی، جماعت اسلامی ہو یا پی، ٹی، آئی جمعیت علماء اسلام ہو یا تبلیغی جماعت ان کی کامیابی میں پنجاب کا بہت بڑا کردار ہے، جب تک ان بڑی جماعتوں کو پنجاب سے سپورٹ ملتی رہی یہ کامیاب رہیں، جب انہوں نے پنجاب کو چھوڑا تو یہ پیچھے ہو گئیں۔ جب پاکستان بنا تو مسلم لیگ کے ساتھ پنجاب کی عوام تھی، لیکن جوں جوں مسلم لیگ نے پرانے لوگوں کو چھوڑ کر امیر خاندانوں اور وڈیروں کو آگے کیا مسلم لیگ ختم ہو گئی۔ جو بھی فوجی جرنیل آیا اس نے مسلم لیگ بنائی مگر وہ اس کے اقتدار کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ جب تک مولانا مودودی اور میاں طفیل صاحب حیات رہے جو کہ پنجاب سے تھے جماعت اسلامی کا اہم کردار رہا لیکن اب وہ محدود ہو گئی۔ جمعیت جب تک پنجاب میں متحرک تھی اس کا کردار آج کی نسبت بہت بڑھ کر تھا۔

پھر ذوالفقار علی بھٹو آئے تو سب سے زیادہ پنجاب نے ان کا ساتھ دیا، انہوں نے غریب کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور وعدہ کیا کہ انہیں تین چیزیں دوں گا۔ روٹی، کپڑا اور مکان اور پھر اس نعرے نے جادو دکھایا۔ میں اس وقت گوجرانوالہ میں اپنی زمینوں پر تھا۔ ایک طرف حامد ناصر چٹھہ تھے، اور دوسری طرف پیپلز پارٹی کے ایک غیر معروف آدمی ڈاکٹر ذوالفقار۔ چٹھہ کی برادری اور دیگر لوگ ان کے ساتھ تھے، لیکن دوسری طرف غریب لوگ ڈاکٹر ذوالفقار کے ساتھ تھے، اور وہ بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ لیکن حکومت بننے

کے بعد سب سے پہلا وار پنجاب پر ہی کیا، لوگوں سے زمینیں اور کارخانے لے کر قومیانہ شروع کر دیئے، لیکن جب دوسرے صوبوں کی باری آئی تو کچھ نہ کر سکے۔ بھٹو صاحب نے بھی پھر آہستہ آہستہ خاندانی لوگوں، وڈیروں کو ساتھ ملانا شروع کر دیا، اور باقی پارٹیوں کو کونے لگانے شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے بلوچستان کی حکومت ختم کی، اس کے بعد صوبہ سرحد میں مفتی محمودؒ کی حکومت کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور وہ بھی ختم ہوگئی۔ پھر اپنے ساتھیوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور ان کو الگ کر دیا، غریب بیچارے اس کے باوجود اس کے ساتھ تھے۔ کئی لوگوں نے اپنے آپ کو آگ تک لگا دی لیکن ان کو روٹی، کپڑا اور مکان نہ مل سکا۔ دوسری طرف وڈیرے مالدار ہوتے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بعد ان کی بیٹی بے نظیر کو بھی پنجاب کے عوام نے بہت محبت دی اور دو مرتبہ انہیں وزیر اعظم بنوانے میں پنجاب کا کردار سب سے اہم تھا۔ لیکن ان کی شہادت کے بعد جب پیپلز پارٹی زرداری صاحب کے ہاتھ آئی تو انہوں نے پنجاب کو بالکل مایوس کر دیا، انہوں نے آخری روٹی کا نوالہ بھی چھین لیا اور خود ہزاروں مربعوں کے مالک بن گئے، حالانکہ وہ بھٹو صاحب کے نام پر حکومت کر رہے تھے، مگر کام اپنا نکال رہے تھے۔ انہوں نے اپنی جماعت میں ایک غریب آدمی کو بھی نہیں چھوڑا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ راولپنڈی کے شاہ صاحب نے پارٹی کی خاطر اپنی دونوں ٹانگیں ضائع کرا دیں مگر زرداری صاحب نے ان کو بات کرنے کا موقع تک نہ دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ پنجاب کے ڈی، این، اے میں ہی نہیں کہ وہ کسی کے ساتھ نیکی کر سکے وہ ہر وقت حکومت کے ساتھ رہتے ہیں، اسی سوچ کی بنا پر انہوں نے اپنے پانچ سالہ دور حکومت میں پنجاب سے پیپلز پارٹی کا صفایا کرا دیا، اب جب تک زرداری صاحب ہیں انہیں وہاں سے ووٹ ملنا مشکل ہے۔

موجودہ پی، ٹی، آئی کی حکومت کا بھی یہی حال ہے۔ انہوں نے بھی پنجاب کو

بالکل ختم کر دیا ہے، میں ان کے متعلق زیادہ نہیں لکھ سکتا کیونکہ ان کے سپورٹر سب جو شیلے نوجوان ہیں جو کسی کا لحاظ نہیں کرتے ، اوران کے ہاں ادب واحترا اسپورٹرم نام کی کوئی چیز نہیں ۔ جناب عمران خان کا کہنا تھا کہ میں مدینہ کی ریاست بناؤں گا جہاں ہر آدمی کو انصاف ملے گا،لیکن اس نے سب جماعتوں کے لیڈروں کو چوروڈاکو کہنا شروع کر دیا،اور یہ کہ میں ان چوروں کو نہیں چھوڑوں گا۔تین سالوں سے یہ بیان دے رہے ہیں کہ میں ایسے کام کروں گا جس سے لوگ خوشحال ہو جائیں گے،مگر پاکستان بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے جارہا ہے۔،حالانکہ ان کو امریکہ، یورپ سمیت پاکستان کے تمام اداروں کی سپورٹ بھی حاصل ہے ٹائیگر فورس کے نام سے اپنی ذاتی ملیشیاء بنائی ہوئی ہے ، مڈل کلاس کی سپورٹ حاصل ہے لیکن اس سب کے باوجود وہ ملک نہیں چلا سکتے۔اگر آپ حکومت نہیں چلا سکتے تو اپنے ساتھ کرکٹ کے ان لوگوں کو شامل کر دیجئے جنہوں نے آپ کو ورلڈ کپ جتوایا تھا وہ اب بھی آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔خان صاحب خدارا ہر ایک کوڈاکواور چور کہنا چھوڑ دیں،احتساب کا عمل اُن اداروں کے لئے چھوڑ دیں جو اس مقصد کے لئے بنائے گئے ہیں،اور وزیراعظم بن کر حکومت کریں آپ کے لئے آسان ہوگا۔

میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور فصل کے اگتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ آگے چل کر یہ کتنا اناج دے گی ،مریض پر دوائی کے اثرات دس،بیس دنوں یا مہینہ میں واضح ہو جاتے ہیں،اسی طرح بزنس شروع کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں کامیاب ہوں گے یا نہیں ۔اس طرح کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ میری زندگی کا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جب خان صاحب کو پوری دنیا کی سپورٹ حاصل ہونے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتے تو انہیں فوراً فارغ کر دیا جائے ، ورنہ پاکستان کا اتنا نقصان ہوگا جسے پوری قوم مل کر بھی پورا نہیں کر سکے گی۔

نواز شریف

پاکستان کو ایسے لیڈر اور سیاسی رہنما بہت کم ملے ہیں جو دل سے پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہوں، اور غریب عوام کی فکر کر کے انہیں غربت سے نکالنے والے ہوں۔ میری سوچ سے کئی لوگوں کو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن میری رائے میں میاں نواز شریف ایک ایسا شخص ہے جو غریب عوام کا حقیقی نمائندہ ہے جس کے دل میں پاکستان کے لئے کچھ کرنے کا درد ہے۔

نواز شریف کا خاندان بنیادی طور پر بزنس مین ہے، ان کے والد کا سٹیل کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کو سیاست میں لانے والے جزل محمد ضیاء الحق تھے۔ انہی کی بدولت وہ پہلے پنجاب کے وزیر خزانہ اور پھر وزیر اعلیٰ کے منصب تک پہنچے، لیکن وہ اپنی صلاحیتوں اور گڈ گورنس کی وجہ سے پورے پاکستان اور بالخصوص پنجاب کے لوگوں میں مقبول ہوتے گئے۔ اسی طرح سول سروس والے بھی ان کے ساتھ تھے، چنانچہ وہ پنجاب سے آگے بڑھ کر مرکز میں حکومت بنانے کے قابل ہو گئے۔ ان کے مدّمقابل بے نظیر بھٹو تھیں جو ضیاء الحق کی سخت مخالف تھیں۔ جزل ضیاء الحق نے آئین میں ترمیم کر

کے 58/2B کے تحت صدر کو جو اختیارات دیئے تھے اس کے دونوں لیڈر شکار ہوئے۔ 1990ء میں نواز شریف وزیر اعظم بنے اور 1993ء میں ان کو فارغ کر دیا گیا۔ پھر بے نظیر آ گئی اور 1996ء میں ان کو فارغ کر دیا گیا پھر 1997ء میں دوبارہ نواز شریف آ گئے لیکن اس تمام عرصہ میں عجیب تماشا یہ تھا کہ اگر مرکز میں پیپلز پارٹی ہے تو پنجاب میں نون لیگ، اور اگر مرکز میں ن لیگ ہے پنجاب میں نا معلوم لوگوں کو حکومت دے دی جاتی، اور ان کا آپس میں جھگڑا چلتا رہتا۔ اب ان حالات میں پاکستان نے کیا ترقی کرنی تھی۔

1999ء میں جنرل مشرف نے ایک بار پھر نواز شریف کو حکومت سے نکال کر جیل میں ڈال دیا۔ ادھر بے نظیر پہلے ہی سے باہر تھی۔ جنرل مشرف نے نواز شریف کے خلاف بہت سے مقدمات بنائے جن میں سے اہم ترین جہاز کو ہائی جیک کرنے کا کیس تھا، وہ ان کو سخت سے سخت سزا دینا چاہتے تھے، لیکن کچھ دوست ممالک ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی دیکھ چکے تھے۔ اُس وقت بھی لیبیا وغیرہ نے کوشش کی تھی لیکن اُس وقت بڑی بڑی حکومتوں نے ان کو فارغ کرنے کا پلان بنایا ہوا تھا، اس لئے وہ نہ بچ سکے۔ مگر نواز شریف کا اتنا بڑا جرم نہیں تھا، اس لئے اس کو سزا ذرا کم دینی تھی، اس لئے ان کو سعودی عرب جانے کی اجازت مل گئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اُس وقت نواز شریف کو باہر نہیں جانا چاہئے تھا میں سمجھتا ہوں وہ غلط کہتے ہیں۔ جب انسان کی زندگی کو خطرہ ہو تو اس کو وہاں چلے جانا چاہئے جہاں اس کی زندگی محفوظ ہو۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب مکہ میں نعوذ باللہ قتل کرنے کا منصوبہ بن رہا تھا تو اللہ نے انہیں حکم دیا کہ گھر چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں، اور پھر جب طاقت آ گئی اور اللہ کا حکم شامل حال ہو گیا تو پھر فاتح کی حیثیت سے دوبارہ مکہ آ گئے۔

نواز شریف جب سعودی عرب گئے تو وہ سعودی بادشاہ کے مہمان تھے، اس کے

سارے اخراجات ان کے ذمہ تھے، لیکن نواز شریف کے والد نے کہا کہ ہم خرچہ نہیں لینا چاہتے ہمیں جگہ دیں تا کہ ہم وہاں فیکٹری لگا کر اپنے خاندان کی ضروریات کو پورا کر سکیں، اور انہیں یہ اجازت دے دی گئی۔ اکثر ملکوں میں سرمایہ کاروں کو فیکٹری اور کارخانہ لگانے کے لئے گرانٹ دی جاتی ہے، اور ٹیکس فری پیریڈ بھی۔ یہاں انگلینڈ میں بھی ایسا ہوتا آیا ہے۔ نواز شریف کے خاندان نے سعودی عرب میں سٹیل مل لگا کر کام شروع کر دیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد قطر میں بھی۔

یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ عرب ممالک میں زیادہ تر تجارت کیش میں ہی ہوتی ہے لہٰذا یہ تأثر کہ نواز شریف خاندان نے پیسہ پاکستان سے لیا درست نہیں۔ میاں محمد شریف پرانے تجربہ کار بزنس مین تھے، انہیں معلوم تھا کہ مال کی خرید و فروخت کیسے کرنی ہے، کئی ممالک کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ پوری دنیا نواز شریف کو جانتی تھی، اور عزت بھی دیتی تھی۔ اُن کی تجارت کا فائدہ ان ملکوں سمیت پاکستان کو بھی ہوتا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اپنے ہر دور حکومت میں انہوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، یلو کیب ٹیکسی اسکیم انہوں نے شروع کی جس سے لاکھوں لوگوں کو فائدہ ہوا۔ پاکستان میں موٹروے بنانے میں سب سے اہم کام انہوں نے کیا۔ ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے لگوائے، پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے والے بھی میاں نواز شریف ہی ہیں۔ نواز شریف کو پیسے کی ضرورت نہیں، اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اپنی محنت سے کمایا ہوا ہے۔ اسی لئے جنرل مشرف، زرداری اور عمران خان پورا زور لگانے کے باوجود ابھی تک کوئی چیز ان کے خلاف ثابت نہیں کر سکے۔ یہ یاد رکھیں کہ سچّے آدمی کی نشانی یہ ہے کہ جو بھی دوست ہے اس کا ساتھ آخر تک نبھاتا ہے۔ میاں نواز شریف کی جب بھی حکومت آئی ان کے وزراء اُسی طرح رہے اور اپنا اپنا کام کرتے رہے، ان کو نکالنے کی ضرورت نہیں

پڑی۔اور کہیں کسی نے غلط کیا تو اُس کو نکال دیا اور واپس نہیں لیا۔

تجارت ایک بہت بڑی نیکی کا کام ہے۔ایمان دار تاجر اللہ کا ولی ہے، اسلامی تاریخ میں بڑے بڑے بزنس مین رہے ہیں۔ایک دفعہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ ایک منڈی میں گئے انہوں نے ایک آدمی سے کہا کہ یہ جتنا غلہ تمہارے پاس ہے اس کی کیا قیمت ہے؟ انہوں نے قیمت بتائی تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا کہ یہ مال میرا ہو گیا جب واپس آؤں گا تو قیمت ادا کر دوں گا، اس طرح انہوں نے کھڑے کھڑے سودا کر کے تھوڑے سے وقت میں اچھا خاصا منافع کما لیا۔ہمارے نبی کے فرمان کے مطابق منافع اللہ نے رزق کے کل دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں رکھے ہیں اسی لئے اس کے اندر برکت ہے۔خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی تجارت کو پسند فرمایا ہے۔تنخواہ دار چاہے کتنا بڑا آفیسر ہی کیوں نہ ہو اس کی ایک محدود تنخواہ ہوتی ہے۔لیکن بزنس مین کئی دفعہ لاکھوں کروڑوں کما لیتا ہے۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ عرب ملکوں میں 20، تیس سال پہلے نواز شریف کے والد کے ساتھ مل کر عرب بادشاہوں نے تجارت میں شراکت داری کر لی تو کیا غلط ہوا؟ مال بھی ان کا، ملک بھی ان کا۔لیکن اس کے باوجود نواز شریف کی بات کو نہیں قبول کیا جا رہا، حالانکہ مشرف نے خود بھی سعودی بادشاہ سے بہت فائدہ اٹھایا لیکن اُس سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔

میرے غیر جانبدارانہ تجزیہ کے مطابق پاکستان میں بزنس مین کو چلنے ہی نہیں دیتے جب کہ یہاں برطانیہ میں ایسا نہیں، بلکہ اسے عزت دی جاتی ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو روزگار اور حکومت کو ٹیکس ملتا ہے۔اگر اس ملک میں کارخانے نہ ہوتے تو ہم کس طرح یہاں آتے۔مسلم ممالک نے کمیونسٹ نظام لانے کی وجہ سے اپنے ملکوں میں کارخانے ختم کر دیئے۔مصر میں جمال عبد الناصر، لیبیا میں جنرل قذافی اور پاکستان میں

ذوالفقار علی بھٹو نے کاروبار قومی ملکیت میں لے کر سب کچھ ختم کر دیا، اور اب کسی کو کاروبار کرنے بھی نہیں دیتے۔ اب یورپ، امریکہ اور آئی، ایم، ایف سے قرض لے کر کام چلا رہے ہیں، اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ جتنے بھی غیر اسلامی ملک ہیں ان میں کار خانے ہیں اور بزنس مین ارب پتی اور بڑے خوش ہیں۔ خدا کے بندو! ان ملکوں کو نہ دیکھو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات پر ہی عمل کر لو کہ تجارت میں اللہ برکت دیتا ہے۔

نواز شریف نے ہر دور میں غریب کی مدد کی ہے اور ایسی پالیسیاں لے کر آئے جس میں براہ راست غریب کو فائدہ ہوا۔ وہ زمینداروں کے لئے کھاد، بیج، ٹیوب ویل اور ٹریکٹرز وغیرہ کی سکیمیں لے کر آئے جس سے انہیں فائدہ ہوا۔ اسی طرح انہوں نے روڈ بنائے، بجلی کے کارخانے لگائے، ائیر پورٹ اور ہسپتال بنائے، ریلوے سٹیشن، کھیلوں کے سٹیڈیم، اور ڈیم بنائے جن کے بنانے میں اربوں روپے لگتے ہیں، اور قرض لینا پڑتا ہے لیکن یہ طویل المدتی منصوبے زمین پر موجود ہیں جس سے ملک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جب میں اس ملک میں آیا تھا تو اس وقت صرف M1 موٹر وے تھی لندن سے نوٹنگھم تک، نوٹنگھم سے شفیلڈ تقریباً دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ پھر اس قوم نے ہر طرف موٹر وے کے جال بچھا دیئے۔ جس کے بعد ترقی کے نئے دور شروع ہوئے۔

نواز شریف نے بھی موٹر ویز کے ذریعے پورے پاکستان کو ایک گاؤں بنا دیا ہے دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو رہا ہے۔ پیسے اور وقت دونوں کی بچت ہو رہی ہے۔ اس نے اسحاق ڈار کی صورت میں ملک کو ایسا وزیر خزانہ دیا جس نے ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کو مستحکم رکھا، شرح سود کو بہت کم کر دیا، لوگوں کو کاروبار کرنے کی اجازت دی، پراپرٹی کی خرید وفروخت پر ٹیکس لگائے۔ پراپرٹی کے اس کاروبار میں لاکھوں ایکڑ زرعی زمین تباہ ہو رہی ہے، مکان نہیں بنتے، فائلوں میں پلاٹ آگے چلتے رہتے ہیں لاکھوں کے پلاٹ

کروڑوں میں بکتے ہیں، دیکھا دیکھی ہر کوئی اس کاروبار میں آ گیا ہے۔ ہزاروں لوگ جعلی کام کرتے ہیں۔ زرعی زمین اور درختوں کے خاتمے کی وجہ سے آلودگی کا مسئلہ پیدا ہو چکا ہے۔اناج کی قلت اورزیرزمین پانی کی سطح کم ہوگئی ہے۔

جب تک اسحاق ڈار وزیر خزانہ رہے کرنسی مستحکم رہی، پاکستان ترقی کر رہا تھا۔ جس ملک کی کرنسی مستحکم ہو وہاں مہنگائی کم ہوتی ہے۔نواز شریف پاکستان میں سی پیک لے کرآیا،جس پر تیزی سے کام ہورہا تھالیکن عمران خان نے چھے ماہ میں ہی سب کچھ ختم کردیا ملک جواوپر جارہا تھادوبارہ صفر پر چلا گیا۔اس حکومت کے ہوتے ہوئے ترقی ممکن نہیں، یہ خیالی پلاؤ بنانے والی حکومت ہے کچھ عرصہ اور رہےتو ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔

میرے خیال میں پاکستان کی عوام اور بالخصوص پنجاب کے لوگ دلی طور پرنواز شریف کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جب بھی انہیں آزادانہ فیصلہ کرنے کا موقع ملا انہوں نے نواز شریف کا ساتھ دیا۔مشرف نے جس طرح نواز شریف کو ملک بدر کیا تھا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دوبارہ اس ملک کے وزیر اعظم بنیں گے۔مشرف کے دس سالہ دور اقتدار میں ملک افراتفری کا شکار ہوا، بم دھماکے اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا، ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ایک طرف مشرف کو نکالنے کا پروگرام بنایا جارہا تھا تو دوسری طرف وہ ڈیلیں کررہے تھے،اوراسی کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو پاکستان آ گئیں،جس سے نواز شریف کے لئے بھی راستہ کھل گیا۔بے نظیر کو شہید کر دیا گیا،اور نتیجے میں زرداری صاحب کو حکومت مل گئی لیکن وہ کچھ نہ کر سکے، پنجاب کو انہوں نے مایوس کیا،اور اس طرح 2013ء میں الیکشن کے ذریعے ایک بار پھر نواز شریف کو مرکز اور پنجاب کے عوام نے انہیں حکومت دلوادی،لیکن ان کو چین سے حکومت نہیں کرنی دی گئی۔

اصل میں 1985ء تک پنجاب میں کبھی پنجابی کی حکومت نہیں رہی۔ زیادہ تر

صوبہ سرحد اور سندھ کے لوگ حکومت کرتے رہے، جو بھی قانون بنائے انہوں نے بنائے، ون یونٹ جنرل ایوب نے بنایا۔ کارخانے ذوالفقار علی بھٹو نے ختم کئے۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا کرنے والے اور تھے لیکن الزام پنجاب کے سر تھونپ دیا گیا۔ پنجاب کے لوگوں نے محنت کی اور دوسروں کو آگے کیا، ان کا اپنا کوئی لیڈر نہیں تھا۔ جس نے کہا کہ میں پنجاب کے لئے کام کروں گا پنجابی اس کے ساتھ ہو گئے، اور جب وہ کامیاب ہو گیا تو سب سے پہلے پنجاب کو ہی نقصان پہنچایا۔

2013ء میں عوام نے نواز شریف کو ایک بڑا لیڈر سمجھ کر حکومت دی کہ وہ ایک بڑے لیڈر رہیں جو پاکستان کے لئے کام کریں گے۔ انہیں بار بار نکالا گیا، لیکن اپنی مختصر دور حکومت میں انہوں نے وہی کام کئے جو دوسرے کئی سالوں میں نہیں کر سکے۔ اسی لئے تمام اداروں کی مخالفت کے باوجود وہ جیت جاتے ہیں۔ اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں ان کے بڑے کاموں میں سے دہشت گردی کا خاتمہ ہے، جس نے پاکستان کے امن کو تباہ کر دیا تھا۔ پھر یہ کہا جاتا تھا کہ پنجاب نے سب کچھ کھا لیا ہے، انہوں نے کہا کہ باقی صوبوں سے پنجاب کو تین فیصد کم دیں۔ مہنگائی کو کم کیا، شرح نمو کو چھے فیصد پر لے گئے، چین کے ساتھ دوسری حکومتیں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی معاہدہ نہ کر سکیں لیکن انہوں نے انتہائی مختصر وقت میں معاہدہ کر دکھایا، اس لئے کہ وہ ایک کامیاب بزنس مین ہے جو خود نفع اٹھانے کے ساتھ دوسروں کو بھی نفع پہنچاتا ہے۔

نواز شریف نے اگر موٹر وے بنائی ہے تو آئندہ نسلوں کی بہتری کے لئے۔ جو لوگ 200 روپے دے کر جاتے تھے اب وہ 20 روپے میں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ کارخانے لگائے تو اس سے قوم کا معیار زندگی بہتر ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود میڈیا اور ریاستی ادارے ان کو چور ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ

ہاؤسنگ سوسائٹیوں کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے جن کے پیچھے بڑے بڑے ہاتھ تھے جنہوں نے لاکھوں ایکڑ زمین کو بے کار کر دیا ہے اور مال لندن اور دوبئی لے گئے ہیں۔

میں زیادہ دکھی اس لئے بھی ہوں کہ ہم میرپور کے لوگوں نے بے شمار پیسہ پلاٹوں پر لگایا ہے اور جو زمین کاشت کے قابل تھی وہ بے کار پڑی ہے، اگر ہماری حکومت ہم لوگوں سے رقم لے کر بجلی کے کارخانے لگاتی، یا ڈیم بناتی تو ہمارا سرمایہ بھی استعمال ہو جاتا اور پاکستانی عوام کو بھی فائدہ پہنچتا۔لیکن جب عوامی حکومت ہی نہ ہو،اور مقصد یہ ہو کہ حکومت بھی ہم کریں، بزنس بھی ہمارا ہو، اور جو ممالک بھی ہمارے ہاں سرمایہ کاری کریں انہیں بھی تنگ کریں، جیسا کہ سی پیک کے ساتھ ہوا تو ملک خاک ترقی کرے گا۔

نواز شریف نے 30 ارب ڈالر سے کام شروع کیا اور 60 ارب ڈالر تک لے گئے، مگر اب اس کا کام تقریباً بند پڑا ہے۔آج بھی اگر نواز شریف کو موقع دیا جائے تو دس سال میں پاکستان صف اوّل کے ملکوں میں آسکتا ہے۔بزنس کا اصول ہے کہ پہلے اپنے فائدے کے لئے کام کریں پھر کسٹمر کے فائدے کے لئے۔اب دیکھیں انہوں نے مانسہرہ سے لاہور تک موٹروے بنائی جو فاصلہ آٹھ گھنٹوں میں طے ہوتا تھا اب وہ آدھے خرچے اور آدھے وقت میں طے ہو جاتا ہے۔لاکھوں لوگوں کے سفر سے کروڑوں میں فائدہ ہوتا ہے موجودہ حکومت نے وقتی فائدہ کو دیکھتے ہوئے رئیل اسٹیٹ کو اربوں روپیہ دے دیا جو قوم کا نقصان ہے۔

یہاں میں ایک بات ضمناً لکھنا چاہتا ہوں کہ ہر علاقے کے اپنے رسم و رواج اور ثقافت ہوتی ہے اور پنجاب میں دو میلے خاص ہیں ایک چیت اور دوسرا بیساکھ۔ان دونوں کی اپنی اہمیت ہے ایک میں موسم بہار کی خوشی منائی جاتی ہے اور دوسرے میں گندم کی کٹائی کی خوشی۔میلے ٹھیلے لگتے ہیں، غریب لوگ محنت مزدوری کر کے اُن میں خوشی مناتے

ہیں۔ پورا سال اس کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، لیکن اب ان کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ یہ ہندوانہ رسم ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب تک پنجاب کو اس کا حق نہیں دیا جاتا پاکستان ترقی نہیں کرے گا، اور اس کی ابتداء نواز شریف کو اقتدار دے کر کی جائے۔

نواز شریف نے قرض لے کر ملک پر لگایا ہے جو کہ نظر آرہا ہے، اس حکومت نے بھی اس سے ڈبل قرض لیا ہے مگر کہیں نظر نہیں آتا کہ وہ کدھر گیا، بلکہ الٹا ان منصوبوں کو بند کر دیا گیا ہے جن پر اربوں خرچ ہو چکے تھے۔ اگر اسی طرح رہا تو کچھ عرصہ میں ہی پاکستان کا دیوالیہ ہو جائے گا۔

آخر میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ پاکستان کی حفاظت سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے، ہر ایک کو اپنی ذمہ داری پوری کرنی چاہئے۔ اس پر حکومت کرنے والے وزیر اعظم کو عزت دی جائے۔ وہ پاکستانی جو دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں ان کا بھی ملک پر حق ہے۔ اگر ہمارے فوجی بھائی ہیں یا دینی بھائی ہیں یا رشتہ دار اگر کسی دوسرے ملک کے باشندے ہیں تو ان سے تعلقات تو ہو سکتے ہیں، مگر پاکستان کے خزانے میں ان کا کوئی حصہ نہیں، اور نہ ہی پاکستان کے معاملات میں ان کا کوئی عمل دخل۔ برابری کی سطح پر سب سے تعلقات رکھیں تو انشاء اللہ پاکستان ضرور ترقی کرے گا۔

جب ورلڈ کپ جیت کر ٹیم پاکستان واپس آئی تو ان سب کا حق تھا کہ انعامی رقم جو کروڑوں میں ملی تھی سب کو شیئر کی جاتی اور سب کو ان کی محنت کا پھل ملتا لیکن خان صاحب نے کمال ہوشیاری سے اپنی والدہ کے نام پر شوکت خانم کینسر ہسپتال بنانے کا اعلان کر دیا، اور کہا کہ سب انعامی رقم اس فنڈ میں جائے گی۔ اب کوئی بول بھی نہیں سکتا تھا لیکن بیچارے اندر سے افسردہ بھی تھے۔ چند لڑکوں نے مخالفت بھی کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ خان صاحب نے ہسپتال بنوا لیا، اور اس کے نتیجے میں آج وزیر اعظم بھی بن گئے، اور باقی

بیچارے کرکٹر کے کرکٹر ہی رہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہسپتال میں تمام لڑکوں کو بورڈ کا حصہ بنایا جاتا۔ وہ بھی اپنی ماؤں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی خان صاحب کو ہے مگر ان کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ جب آپ ایک جماعت کی شکل میں کام کرتے ہیں تو پھر ہر معاملہ میں سب کو شریک کرنا چاہیئے، یہ نہیں کہ کام ہو گیا اور پھر بس باقی سب کو انگوٹھا دکھا دیا۔ دوسری طرف ایک اور المیہ ہے ہماری قوم کا اور وہ یہ کہ جب ٹیم جیتے تو اس کو آسمان پر اٹھا لیتے ہیں لیکن جب ہار جائے تو پھر بیچارے کھلاڑی ایک ایئر پورٹ پر اکھٹے بھی نہیں آسکتے۔ خان صاحب نے ورلڈ کپ جیتا تو ان کو وزیر اعظم بنا دیا۔

اس معیار پر پرکھیں تو آسٹریلیا نے پانچ دفعہ ورلڈ کپ جیتا ہے، وہاں وزیر اعظم تو ہونا ہی کرکٹ ٹیم کا کپتان چاہیئے۔ اسی طرح ویسٹ انڈیز اور انڈیا میں بھی ہونا چاہیئے۔ اور انگلینڈ کی ٹیم کو تو بالکل ملک بدر کر دینا چاہیئے کہ وہ ابھی بڑی مشکل سے آخری ورلڈ کپ جیتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ کھیل میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ یہاں سب ہمارے ہیرو ہیں چاہے بوتھم ہو یا ڈیوڈ گاور یا کوئی اور سب کی عزت کی جاتی ہے۔

پاکستانی قوم اور میڈیا کو خاص طریقے سے مینج کیا جاتا ہے۔ انصاف کا کوئی پیمانہ نہیں۔ 92 کے ورلڈ کپ کے فاتح ٹیم کا کپتان ہیرو، اور باقی لوگوں کی کوئی عزت نہیں۔ دوسری طرف ٹیم کتنی مرتبہ فائنل تک بھی پہنچی لیکن اس کے باوجود جب وہ واپس گئے تو کھلاڑیوں کو بے عزت کیا گیا، اس وقت بھی تو صرف کپتان ہی کو گالیاں پڑنی چاہیئے تھی۔ انصاف سے کام لیں کل اللہ کے سامنے بھی تو جواب دہ ہونا ہے۔

دینی مدارس، سکولز اور MCB کا کردار

انگلینڈ میں سب سے پہلا دارالعلوم لنکا شائر میں بری ٹاؤن میں قائم ہوا جس کے بانی حضرت مولانا محمد یوسف متالہ مرحوم تھے۔ان کے مدرسے میں دینی تعلیم کے ساتھ سکول کی تعلیم کا بھی انتظام تھا، حالانکہ پاکستان و انڈیا کے مدارس میں یہ رواج نہیں تھا، وہاں صرف عربی اور اردو میں دینی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔انہوں نے سکول اور مدرسہ کا اس طریقے پر اہتمام کیا کہ اور لوگوں کے دل میں بھی یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ہم اپنے شہروں میں بھی اسی طرز کے ادارے قائم کریں، خاص کر انڈیا سے جو علماء آتے تھے وہ اسی بات پر زور دیتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ انگلینڈ آئے تو مرکز میں ان کا بیان رکھا گیا، اور ان کے بیان کا ہر جگہ اعلان ہوا پورے انگلینڈ سے لوگ جمع ہو گئے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ انہوں نے اپنی تقریر میں صرف تعلیم کے موضوع پر فوکس کیا۔اس کے بعد خاص کر انڈین مسلمانوں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ تعلیم کو ترجیح دینی ہے۔ پھر ایک کے بعد ایک مدرسہ اور اسلامیہ گرلز سکول کھلنے شروع ہو گئے اور انگلینڈ میں ایک انقلاب آ گیا۔

یوسف اسلام جو نو مسلم تھے انہوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کی خدمت کروں گا، پھر ان کی کاوشوں سے انڈین اور عرب مسلمانوں کی ایک جماعت بنی جس کا نام MCB رکھا گیا اور یوسف اسلام اس کے چیئرمین بنے، بڑا اچھا آغاز ہوا، انہوں نے سب مذہبی جماعتوں اور مسجدوں کو دعوت دی کہ آپ اس کے ممبر بنیں۔ دیوبندی اور بریلوی حضرات تو کم ہی اس کی طرف گئے، لیکن UKIM اُس میں بھرپور طریقے سے

شامل ہوگئی یوسف اسلام کی خواہش تھی کہ حکومت مسلمانوں کے سکولوں کو بھی گرانٹ دے تاکہ ان کے بچے اسلامی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم بھی حاصل کرسکیں لیکن حکومت نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ معاملہ عدالت میں لے گئے، عدالت نے کہا کہ یہ مسلمانوں کا جائز مطالبہ ہے ان کو بھی گرانٹ ملنی چاہیئے۔ پھر جلد ہی MCB کے الیکشن ہوئے اور یوسف اسلام کی جگہ اقبال سکرانی نے لے لی۔ کچھ عرصہ انہوں نے کام کیا لیکن آہستہ آہستہ UKIM کا عمل دخل زیادہ ہوگیا۔

جب باقی جماعتوں نے دیکھا کہ اس کے اندر ہماری اتنی اِن پُٹ نہیں ہے اور دوسری طرف حکومت نے کہا کہ ہم اس معاملے میں تمہاری مدد کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لئے سب جماعتوں کو مل کر ایک کمیٹی بنانی چاہیئے اس کے لئے کچھ لوگوں کی ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ ہر شہر میں سیمینار کرائیں اور لوگوں کو بتائیں کہ ہر مسجد اور جماعت اپنی ممبر شپ لے، جتنی دیوبندی، بریلوی اور دیگر مسالک کی مساجد ہوں گی اسی تناسب سے ان کو نمائندگی دی جائے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ MCB کے بجائے ایک نئی جماعت مناب کی شکل میں وجود کے اندر آگئی۔

شیعہ حضرات نے کہا کہ ہماری 20 فیصد نمائندگی الگ کردیں۔ ایک جلسہ برمنگھم میں رکھا گیا، اُس میں سٹیج پر بریلوی حضرات زیادہ تھے، اور دیوبندیوں کے بھی ایک مولانا صاحب تھے، اور UKIM والے تو بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ سٹیج کیا ہوتا ہے۔ پھر جب کاروائی شروع ہوئی تو دیوبندی عالم جو شفیلڈ سے گئے تھے انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے تو یہاں کچھ نہیں اس لئے انہوں نے واپسی میں ہی خیر جانی۔ کمیٹی بن گئی، اور سب کچھ حکومت کی سرپرستی میں ہوا تھا تو یقیناً گرانٹ بھی ملی ہوگی۔

دوسال بعد UKIM کے مولانا سرفراز مدنی اس کے چیئرمین بن گئے۔ اس

کے بعد میں نے مناب (MINAB) کی کوئی سرگرمی نہیں دیکھی ممکن ہے ہوں گی۔
حکومت نے اگر مدد کی تھی تو بہتر تھا کہ سب مل کر کام کرتے، ہر جماعت کے دو ممبر لے لیتے
اسی طرح تمام مسلمان ملکوں جس میں عرب، صومالیہ، انڈین، پاکستان اور بنگلہ دیش شامل
ہیں کے نمائندے لے لیتے اوران سب کی ایک نمائندہ جماعت ہوتی، اور ہماری عید اور
دیگر مسائل کے حل کے لئے آسانی پیدا ہوجاتی۔ مگراب تک ایسانہیں ہوسکا۔

میں سمجھتا ہوں جب تک نوجوان علماء جو اس ملک میں پروان چڑھے ہیں اور
جنہیں انگلش زبان پر مکمل عبور حاصل ہے وہ آگے بڑھ کر معاملات اپنے ہاتھ میں نہیں لے
لیتے، اس وقت تک معاملات درست نہیں ہوسکتے۔ اب بھی وقت ہے سب مل کر کام کریں تو
ہمارے مسلمانوں کے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

کرونا 2019ء

2020ء، 21 کوکوڈ 19 کی وجہ سے دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی، لیکن یہاں پر یہ بتاتا
چلوں کہ یہ بیماری کوئی پہلی دفعہ نہیں آئی۔ موذی اور وبائی امراض ہر زمانے میں کسی نہ کسی
شکل میں آتے رہے ہیں، اوران سے اس زمانہ کے مطابق نمٹا جاتا رہا ہے۔ ایک دفعہ میں
جب چھوٹا لڑکا تھا تو اس وقت جانوروں کی بیماری آئی تھی جس کو "موکھر" کہتے تھے اور جو
جانوروں کے منہ اور پاؤں پر حملہ آور ہوتی تھی اور اس کی وجہ سے بے شمار جانور مر گئے
تھے۔ دیہاتوں میں سائنس کا نام ونشان نہ تھا، اس وقت حکیم ہوا کرتے تھے یا پھر علماء جن
سے دعاء کی درخواست کی جاتی تھی۔ اس مرض کا حکیموں کے پاس تو کچھ علاج نہ تھا البتہ جو
علماء تھے ان کا یقین تھا کہ جو بھی اللہ سے مانگو گے ملے گا، اور اسی یقین کی وجہ سے اللہ تعالیٰ
ان کی دعائیں سنتا تھا۔ مولوی صاحب نے اعلان کیا کہ سب لوگ اپنے مویشی ایک میدان
میں لے آئیں میں سب پر دم کروں گا، اللہ تعالیٰ کے کلام میں شفاء ہے وہ ضرور شفا دے

گا۔سب لوگوں نے ایسا ہی کیا اور ایسا ہی ہوا کہ سب جانور ٹھیک ہو گئے۔

ہم لوگ زمیندار تھے اور گھر پر مرغیاں بھی رکھی ہوئی تھیں، اگر انہیں بیماری لگ جاتی تو وہ بزرگ فوراً چھری ہاتھ میں لے کر ان کو ذبح کر دیتے سوائے ان کے جورات کے وقت مر جاتیں۔اس کے بعد میں نے کافی عرصہ تک کسی بیماری کے بارے میں نہ سنا اور نہ دیکھا۔پھر 1990ء برڈ فلو نامی بیماری کا کافی چرچا ہوا جس سے کافی لوگ جان سے گئے۔ اس کے بعد "میڈ کاؤ" کی بیماری آئی جس میں ہزاروں جانوروں کو مار دیا گیا تھا۔لوگوں کو گوشت کھانے سے بھی روک دیا گیا، ورنہ پہلے زمانے میں لوگ کہا کرتے تھے کہ آگ پر جب کسی چیز کو پکا لیا جائے تو جراثیم مر جاتے ہیں،لیکن اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جراثیم مرتے نہیں ہیں۔ پھر ایک افریقن ملک میں ایک بیماری آئی اُس سے لوگ مر رہے تھے اور کوئی ان کی مدد نہیں کر رہا تھا، بھائی بھائی سے بھاگ رہا تھا،لیکن پھر جلد ہی اس پر قابو پا لیا گیا۔ ان میں سے اکثر بیماریاں غیر مسلم ملکوں میں آئی تھیں۔ دوسرا ویسے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے مانگنے کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا ہے، ورنہ اسلام کی تعلیم تو ہمیں یہی بتاتی ہے کہ اگر کوئی مصیبت آئے تو کھلے میدان میں چلے جاؤ اور اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔اس کی مغفرت کی بارش ہو گی۔لیکن ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے میں نے نہیں سنا کہ کسی ملک کے حکمران نے یہ اعلان کیا ہو کہ اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگو۔

علمائے دین کو اتنا ڈرا دیا گیا ہے کہ اگر کوئی دین کی بات کرے تو فوراً یہ پڑھے لکھے لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہمیں تو جہالت کے زمانے میں لے کر جانا چاہتے ہیں۔حالانکہ یہ سب بیماریاں ہماری حماقت سے آتی ہیں۔اب دیکھئے یہ جو چکن ہے چھ سے آٹھ ہفتے میں تیار ہوتا ہے اور اس کی خوراک اتنی ناقص ہے کہ خدا کی پناہ۔پوری دنیا میں اس کو اتنا عام کر دیا گیا ہے کہ کوئی آدمی اور ملک ایسا نہیں جو اس کو استعمال نہ کر رہا ہو۔مگر اس کی وجہ سے دنیا

میں بیماریاں عام ہوگئی ہیں، اس سے ایک تو لوگ موٹے ہو رہے ہیں اور دوسرے ڈپریشن کا شکار۔ لوگوں کو غصہ بہت آتا ہے اور بوڑھے بھی جلدی ہو رہے ہیں۔ چلنے میں دشواری، سانس کا پھول جانا وغیرہ۔ جو قومیں چکن زیادہ استعمال کرتی ہیں وہاں بیماریاں بھی زیادہ ہیں۔ میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہوں بلکہ خود آزما کر دیکھا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ چکن بالکل نہ کھائیں مگر ممکن حد تک اس کو کم کر دیں۔ آپ خود دیکھیں کہ انگریز قوم بہت کم چکن کھاتی ہے۔

خیر بات کرونا کی ہو رہی تھی تو یہ شروع تو چین سے ہوا اور پھر پوری دنیا میں اس تیزی سے پھیلا جس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چین نے تو جلدی اس پر قابو پا لیا لیکن باقی دنیا اور بالخصوص یورپ اور امریکہ اس کا بڑا نشانہ بنے، کوئی دیہات اور قصبہ اور جنگل ایسا نہیں رہا جہاں یہ نہ پہنچا ہو۔ لیکن ایک چیز کی حیرانی ضرور ہے کہ اعداد و شمار ایسے پیش کئے جاتے ہیں جیسے ایک ہی کمپیوٹر پر سب کچھ لکھا ہوا ہو، اور سب کا حساب کر رہا ہو۔ ورنہ جو غریب ممالک ہیں ان کی زیادہ تر آبادیاں دیہاتوں اور جنگلوں میں ہیں، وہ کس طرح ہر شام یہ خبر پہنچا دیتے ہیں کہ آج اتنے بیمار ہوئے اور اتنے فوت، ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا۔

چین نے اس بیماری پر کنٹرول کر لیا ہے مگر یورپ اور وہ ممالک جو امریکہ کے ساتھ ہیں ان کا نقصان زیادہ ہو رہا ہے۔ کئی حکومتوں نے لوگوں کو گھروں میں محصور کر رکھا ہے اور اس کی پابندی کے باوجود بھی بہت سے لوگ بیمار ہو رہے ہیں کچھ ممالک کے حکمرانوں کی پابندی کے باوجود عوام اسی طرح بازاروں اور دنیا کے کاموں میں مصروف ہیں اور بیمار بھی کم ہوتے ہیں، لیکن ایک کام میں سب شامل ہیں کہ مذہبی مراکز اور تقریبات سب نے بند کئے ہوئے ہیں۔ ان میں کسی کو جانے نہیں دیا جاتا یا بہت کم لوگوں کو اس کی اجازت ہوتی ہے۔ جبکہ بازاروں اور عام جگہوں کے لئے ایسا قانون نہیں ہے۔ لیکن

پروپیگنڈہ مذہبی لوگوں کے خلاف کیا جاتا ہے کہ یہ کرونا کونہیں مانتے جبکہ علماء کرام اور مساجد انتظامیہ نے ہر جگہ حکومتوں سے تعاون کیا ہے۔ مگر پھر بھی لوگوں کو مسجدوں سے اس قدر ڈرایا ہوا ہے کہ کوئی جانے کا نام نہیں لیتا۔

دوسری طرف انتظامیہ کچھ اتنی سخت ہوگئی ہے کہ جو حکومت نے نہیں کہا ہوتا وہ بھی کرتے ہیں، اور نمازیوں کو اتنا تنگ کرتے ہیں کہ وہ ڈر کے مارے مسجد میں نہیں جاتے، حالانکہ مسجدوں میں جا کر ایک مصلّٰی کے وقفے سے کھڑا ہوا جا سکتا ہے، لیکن انہوں نے خود جانا نہیں تھا دوسروں کو بھی نہ جانے دیا، حالانکہ ہم تو یہی سنتے آرہے ہیں کہ اللہ کی زمین پر سب سے بہترین جگہیں مساجد ہیں اگر کسی کی موت مسجد میں ہوگئی تو اس کے جنتی ہونے کی گواہی دی جاتی تھی، لیکن اب تو اللہ کی ذات پر ایمان ہی ٹھیر گیا ہے کہ ہر چیز اللہ سے مانگنی ہے۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں احتیاط ضروری ہے اور اسی چیز پر چین نے عمل کیا۔ جب ان کے ملک میں وبا پھیلنے لگی تو انہوں نے سختی سے لوگوں کی نقل وحمل پر پابندی لگا دی، دوسرے ملکوں سے بھی کہا کہ وہ اپنے شہریوں کو یہاں سے مت نکالیں۔ پاکستان نے جب تک اس چیز پر عمل کیا وہ محفوظ رہے، لیکن پھر ایران سے جب لوگوں کو آنے کی اجازت دی تو وہاں بھی یہ وبا پہنچ گئی۔ دوسری بات چین نے یہ کہی کہ ماسک پہنیں، ہاتھ دھوئیں اور چھ فٹ کا فاصلہ رکھیں بہت فائدہ ہوگا، اُس وقت پاکستان کے ایک وزیر نے کہا تھا ماسک کی کوئی ضرورت نہیں لیکن پھر نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں پبلک مقامات پر ماسک کے پہننے کا قانون لازمی بنا دیا گیا۔

بہر حال اس وباء نے لوگوں کے درمیان دوریاں پیدا کر دی ہیں، لوگ گھروں میں رہ رہ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ہیں، ڈر کے مارے ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ پہلے پہل جب یہ بیماری شروع ہوئی تھی اُس وقت تو قیامت کا منظر تھا۔ لوگوں

نے اپنوں کو دفنانا ہی چھوڑ دیا تھا۔کئی لوگوں نے حکومتوں سے کہا کہ ہمارے مردے آپ خود ہی دفن کر دیں۔ایسا لگتا تھا کہ قیامت کا سماں ہے جب باپ بیٹے سے اور بیٹی ماں سے اور سب ایک دوسرے سے بھاگ رہے ہوں گے۔ہم نے تو یہ منظر دنیا ہی میں دیکھ لیا۔

اب قدرے حالات بہتر ہو رہے ہیں لیکن سب کچھ نارمل ہونے میں بہت زیادہ وقت لگے گا۔جب تک پوری دنیا میں ویکسین نہیں لگ جاتی پابندیاں ختم نہیں ہوں گی۔اور اگر پابندیاں ختم بھی ہو جائیں تو لوگ جن چیزوں کے عادی بن گئے ہیں ان کے جاتے جاتے وقت لگے گا۔اللہ تعالیٰ سے دعاء گو ہیں کہ یہ مصیبت جلد ختم ہو اور ہم سکھ کا سانس لے سکیں۔

برطانیہ کا نظام

محبت علی لارڈ میئر آف شفیلڈ اور حافظ شریف امیر جماعت تبلیغ کے ساتھ

سکول کا نظام تعلیم

یہاں برطانیہ میں عوامی حکومت ہے، جو بھی کام کیا جاتا ہے وہ عوام کی سہولت کے لئے کیا جاتا ہے ہر محکمہ عوام کو جوابدہ ہے، جو آفیسرز ہیں وہ سرونٹ ہیں۔ ہر محکمہ میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ عوام اس سے ناراض نہ ہوں۔

اگر تعلیم کو لیں تو یہاں پر 16 سال تک تعلیم لازمی ہے اگر کوئی والدین اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیجتے تو انہیں قانون کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم فری ہے اور غریب والدین کے بچوں کو سکول میں کھانا بھی فری دیا جاتا ہے۔ 16 سال کے بعد ہر ایک کو اس کی اہلیّت کے مطابق بغیر کسی سفارش اور رشوت کے کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے۔ نہ ہی رنگ، نسل، علاقہ اور مذہب کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، اس لئے ہمارے بچے بھی

بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں اور کوئی بھی تعلیم کے بغیر نہیں ہے۔

صحت کا نظام

صحت کا نظام یہ ہے کہ ہر آدمی کا اپنا ڈاکٹر ہوتا ہے جس کو GP کہا جاتا ہے۔ بیماری کی صورت میں اپنے جی۔ پی سے رجوع کرنا پڑتا ہے، ایمرجنسی اور بیماری کی شدت کی صورت میں اسے ہسپتال بھیج دیا جاتا ہے۔ ایمرجنسی کی صورت میں ایمبولینس چند منٹوں میں پہنچ آتی ہے، اور یہ سہولت 24 گھنٹے میسّر رہتی ہے۔ مریض کو نمبر وار دیکھا جاتا ہے، مریض سے بات کی جاتی ہے، زبان نہ سمجھنے کی صورت میں مترجم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ان پڑھ مریض کی بھی اسی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے جس طرح پڑھے لکھے کی۔ اس کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ ان پڑھ ہے، یا دوسری رنگت کا۔ ڈاکٹر مریض سے خود بات کرتا ہے اور جب تک وہ مطمئن نہ ہو جائے اس کے پاس ہی رہتا ہے۔ جتنا بڑا ڈاکٹر ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ ہسپتال کو ٹائم دے گا۔

کونسل

کونسل میں جتنے بھی لوگ کام کرتے ہیں وقت کے پابند ہیں، ہر آنے والے کو تسلّی بخش جواب دیا جاتا ہے، زیادہ تر افراد کو چھوٹا عملہ ہی فارغ کر دیتا ہے۔ کسی بڑے آفیسر کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، لیکن اگر کوئی آدمی خوش نہ ہو تو وہ بڑے آفیسر سے مل سکتا ہے، اگر وہاں بھی اس کی تسلّی نہ ہو تو وہ پھر اپنے علاقے کے کونسلر کو کہہ سکتا ہے، اور وہ اس کو اپنی کونسل کی میٹنگ میں رکھتا ہے، اور اس طرح اس آدمی کو سول سرونٹ کی کمیٹی میں پیش ہونا پڑے گا اور پھر وہ فیصلہ کرے گی۔

محکمہ مال

محکمہ مال میں آپ کو اگر کوئی کام ہو تو آپ خود کر سکتے ہیں یا وکیل کے ذریعے کروا

سکتے ہیں۔زیادہ سے زیادہ تین ماہ میں آپ کا کام ہوجائے گا۔عدالت کا نظام بھی اسی طرح ہے،اگرآپ کا کوئی چھوٹا کلیم ہوتو آپ کو وکیل کرنے کی بھی ضرورت نہیں،مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوکر اپنا کیس پیش کریں اور دونوں پارٹیاں موجود ہوں تو فیصلہ ہوجائے گا،اور اگر کوئی بڑا کیس ہوتو آپ کو وکیل کرنا پڑے گا جس میں ممکن ہے آپ کے تین چار سال لگ جائیں لیکن پچاس سال پھر بھی نہیں لگیں گے۔

اگر کرمنل کیس ہے تو وہ پولیس خود کرے گی،اور آپ اپنا وکیل کرلیں۔اگر کوئی انگلش نہیں جانتا تو اس کے لئے مترجم کی سہولت مہیا کی جائے گی،اور خرچہ حکومت برداشت کرے گی،کسی کی مجال نہیں کہ جج کے چیمبر میں جاسکے۔جج کمرۂ عدالت میں ملزم کے چہرے کو نہیں بلکہ فائل کو دیکھتا ہے،اور اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔وکیل بھی ہر پیشی پر حاضر رہتا ہے،اسی لئے فیصلے جلد ہوجاتے ہیں۔

میڈیا

میڈیا میں جو لوگ لکھتے ہیں،وہ اس بات پر جوابدہ ہیں کہ اگر ان کی خبر غلط ہے تو وہ معافی مانگیں،ورنہ عدالت جانا پڑے گا۔وہ اتنے امیر نہیں اس لئے انہیں اپنا حساب و کتاب بھی سیدھا رکھنا پڑتا ہے۔وہ اپنے ملک کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں،اسی لئے ان کا لکھا دنیا میں مثال بن جاتا ہے کہ برطانیہ کے اخبارات میں یہ لکھا ہوا ہے۔عوام ان کے لکھے ہوئے پر اعتماد کرتے ہیں۔

اسی طرح لوگوں کی تفریح کے لئے جو پروگرام چلائے جاتے ہیں جیسے Cornation Street اور East Enders وغیرہ تو اس میں ہر قسم کے لوگ دکھائے جاتے ہیں،جس میں مزدور بھی ہیں اور ٹیکسی ڈرائیور بھی۔اسی طرح بڑے سے بڑا آدمی بھی ہوگا تو وہ ایک دوسرے سے اس طرح بات کریں گے کہ چھوٹے بڑے کا فرق

محسوس نہ ہو۔

فوج

فوج یہاں پر موجود ہے لیکن ان کی موجودگی کا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ یہاں فوج ہے بھی کہ نہیں ۔ وہ بیرکوں میں رہتے ہیں ،حکومت کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتے ،ضروت کے وقت انہیں بلایا جاتا ہے اور وہ اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس بیرکوں میں لوٹ جاتے ہیں۔ میں نے آج تک کسی آفیسر کو کسی حکومتی محکمے میں نہیں دیکھا۔

سیاست

سیاست یہاں پر تین پارٹی سسٹم پر چل رہی ہے،ایک لیبر پارٹی، دوسری ٹوری پارٹی تیسری لب ڈیم ۔پہلی دونوں پارٹیاں ہی اکثر اقتدار میں آتی ہیں۔ یہاں پر جو بھی لیڈر منتخب ہوتا ہے وہ اپنی محنت سے نیچے سے اوپر آتا ہے، پھر پارٹی اُسے ٹکٹ دیتی ہے، اگر کوئی ہار جاتا ہے تو پھر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ اگر پارٹی سے اختلاف ہو جائے تو پارٹی چھوڑ دیتا ہے،لیکن اس کے بعد بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دوسری پارٹی جوائن کریں ۔ ہر علاقے کا ایم ، پی بلاتفریق ہر ایک کی مدد کرتا ہے، چاہے اُسے کسی نے ووٹ دیا ہو یا نہ،اور نہ ہی وہ کسی سے اس بارے میں پوچھتا ہے کہ آپ نے مجھے ووٹ دیا ہے یا نہیں۔الیکشن میں ہر آدمی کو اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دینے کی اجازت ہوتی ہے، اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی نے ووٹ کے لئے کسی کو پریشرائز کیا ہے، یا دھاندلی کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت ہو جائے تو وہ ساری زندگی کے لئے نااہل ہو جاتا ہے،اور ممکن ہے اُس کو سزا بھی ہو۔

حکومتی نظام کی بات کروں تو وزیر اعظم پر عدم اعتماد کی صورت میں اسے اعتماد کا ووٹ لینا پڑتا ہے،اور ناکامی کی صورت میں وزیر اعظم کو نئے انتخابات کروانے پڑتے

ہیں ۔ چار سال کی مدت کا پورا ہونا ضروری نہیں ۔ابھی حال ہی میں ٹوری حکومت میں یہ تجربہ کئی بار ہوا ہے۔ یہاں پر براہ راست کسی کو چور اور ڈاکو نہیں کہا جاتا، بلکہ متعلقہ محکمہ کو لکھا جاتا ہے اور وہ پوری تحقیق کرنے کے بعد کیس پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ پولیس مناسب سمجھے تو کیس آگے عدالت میں لے جاتی ہے اور دیگر ادارے ان کی معاونت کرتے ہیں۔ جرم ثابت ہونے کی صورت میں سزا بھی ہوگی اور جرمانہ بھی۔ وزیر اعظم یا کوئی وزیر کسی کو چور ڈاکو کہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پر ہر ادارہ اور محکمہ عوام کو جواب دہ ہے، بادشاہ تک کوئی اپنے رول سے آگے نہیں جا سکتا۔ ہر چھوٹا بڑا اپنے آپ کو قانون کا پابند سمجھتا ہے، اور اسی قانون کی پابندی کی وجہ سے ہم یہاں خوش ہیں ، یہ لوگ اسی وجہ سے اپنے آپ کو دنیا کا امام سمجھتے ہیں، اسی لئے اس کو گریٹ برٹن (Great Britain) کہتے ہیں۔ اگر قانون کا لحاظ نہ ہوتو ہم یہاں ایک دن بھی نہیں رہ سکتے۔ یہ لوگ بھی کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کے ملک میں باہر سے لوگ آ کر بڑے بڑے بزنس، مکانوں اور گاڑیوں کے مالک بن جائیں اس سے کئی لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے لیکن قانون نے ہمیں تحفظ دیا ہوا ہے۔

یہاں کے لوگوں کا اکثریتی مذہب عیسائیت ہے لیکن لوگ زیادہ مذہبی نہیں ہیں۔ اور وہ اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں، اگر مذہبی لوگوں سے بھی پوچھو تو بہت کم ہی معلومات دیں گے ۔ چرچ ان کی عبادت گاہ ہے لیکن بہت کم لوگ چرچ جاتے ہیں ، ہاں کوئی تہوار ہو یا کوئی اہم کام جیسے کسی دشمن سے جنگ وغیرہ تو پھر چرچ کا رخ کرتے ہیں۔

کرسمس کے موقع پر ملکہ برطانیہ چرچ ضرور جاتی ہیں اور عام لوگ بھی، اور پھر ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھی دیتے ہیں اور اس تہوار کو خوشی سے مناتے ہیں، ایک دوسرے کے گھروں میں بھی جاتے ہیں ۔ کرسمس ٹری ہر گھر کی رونق بنتا ہے، اور روشنیاں

بھی۔اکثر عیسائی ملکوں کی طرح یہاں پر بھی کرسمس کی چھٹیاں دی جاتی ہیں۔دنیا بھر میں عیسائیت کو پھیلانے کے لئے عیسائی مشنری متحرک ہے۔کسی بھی ملک میں اگر عیسائیوں کو کوئی تکلیف ہو تو ان کے حق میں آواز اٹھائی جاتی ہے۔

☆ یہاں کی زبان لہجوں کے تھوڑے بہت فرق سے انگریزی ہے۔اور یہ ان کی ترقی میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔جب ملکہ اور وزیر اعظم سے لے کر ایک عام آدمی تک ایک ہی زبان بولتے ہیں تو ملک میں یکسانیت اور اتحاد کی فضا قائم ہوتی ہے۔کوئی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا،سکولوں میں کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑتی اس لئے کہ ہر بچہ ابتداء ہی سے انگلش بولتا ہے۔اس لئے یہاں کا عام آدمی بھی باہر کے بڑے سے بڑے آدمی پر بھاری ہے۔

☆ کھیلوں کو یہاں بہت اہمیت دی جاتی ہے،اور قوم کو یکجا رکھنے میں کھیل کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ویسے تو یہاں کرکٹ سمیت تمام کھیل کھیلے جاتے ہیں،لیکن فٹ بال سے یہ لوگ جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ ہر عمر کے لوگ فٹ بال کے دیوانے ہیں اور اس کھیل کے لئے سہولتیں بھی بے شمار ہیں۔ ہر شہر میں فٹ بال گراؤنڈ اور سٹیڈیم بنے ہوئے ہیں۔لوگوں کی سیر و تفریح اور صحت مند سرگرمیوں کے لئے بڑے بڑے پارک اور کھیلوں کے مقابلوں کے لئے جگہیں مخصوص کی ہوئی ہیں۔کسی کی مجال نہیں کہ ایک انچ جگہ پر بھی غیر قانونی قبضہ کر لے۔شادی ہالوں اور شاپنگ مالوں کا تو تصوّر کرنا بھی محال ہے۔انھی تمام خوبیوں کی وجہ سے یہ اپنے آپ کو دیگر اقوام سے برتر سمجھتے ہیں۔

محبت علی، حسن الامین اور چوہدری ولایت اور پاکستانی ہائی کمشنر کے ساتھ

محبت علی، حاجی بوستان، حاجی عدالت خان اور صوفی معروف کے ساتھ

محبت علی ایم، پی مگ من، جج مائیکل مرفی اور حفیظ الرحمٰن کے ساتھ